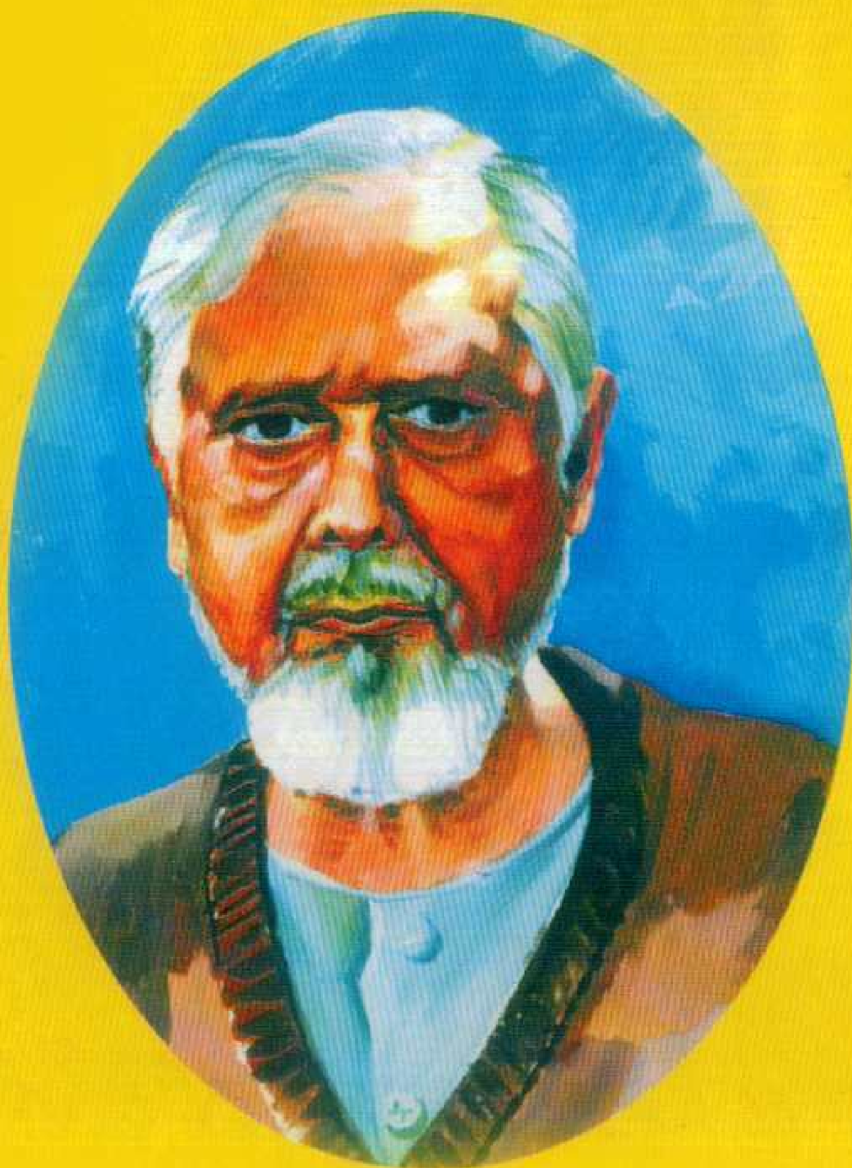
سُرخ فیتہ

یا خُدا، ماں جی، نفسانے، سرخ فیتہ

قدرت اللہ شہاب



ترتیب

مہاجرین کے نام

جو ابھی بقیدِ حیات ہیں
لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے

اِس کہانی کی کہانی

ستمبر ۱۹۴۷ء کا مہینہ تھا اور ہندوستان سے لُٹ پُٹ کر آنے والے مجروح قافلوں کا تانتا بندھا ہُوا تھا۔ جو پہلے آ گئے تھے وہ بعد میں آنے والوں کے انتظار میں ہزاروں کی تعداد میں واہگہ بارڈر پر کھڑے رہتے تھے۔ کسی کی ماں، کسی کا باپ، کسی کا بھائی اور کسی کا بیٹا، واہگہ پار کی بے کراں پہنائی میں گم تھا۔ اکثر کا یہ انتظار موہوم ثابت ہوتا۔ بعضوں کو فقط اپنے پیاروں کے جانگزا انجام کی خبر ملتی۔ کچھ خوش قسمت ایسے بھی تھے کہ خستہ و خراب عزیزوں کو پا لیتے تھے لیکن کم۔ مایوس و نامراد منتظرین کے چہروں کی خستگی دیکھنے کی ہوتی تھی۔

مَیں بھی انتظار کرنے والوں میں تھا۔ اپنے چچازاد بھائی نعمت اللہ شہاب کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ نعمت اللہ میرا چچا زاد بھائی ہی نہ تھا، لنگوٹیا دوست بھی تھا جس کے ساتھ چکوڑ کے سکول میں مَیں نے کیا کیا دھومیں نہ مچائی تھیں۔ اب وہ ایک دیہاتی سکول میں انگریزی کا ماسٹر تھا اور اپنی سُبک نین نقشے والی بیوی کے ہمراہ کہیں بچھڑ کے رہ گیا تھا۔ وہ زندہ تھا یا کشتوں میں شامل ہو گیا تھا یا کسی کیمپ میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا، مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ بہرحال مجھے اس کا انتظار تھا۔ یہ آس کا رشتہ بھی خوب ہے۔ ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتا۔ آخر وہ ایک

روز آیا، لیکن مَیں اُسے نہ پہچانا۔ لوگوں کو متجسس دیکھتا ہُوا مَیں اس کے پاس سے دو تین بار گزر گیا، آخر اُس نے خود مجھے، قدرت، کہہ کر آواز دی۔

یہ نعمت اللہ کوئی اور تھا۔ اس ہنس مکھ البیلے جوان کی جگہ ایک صدیوں کا ماندہ ہڈیوں کا ڈھانچ۔ لباس خون آلود، چہرہ غبار آلود ـــ مَیں نے پوچھا ـــ "نعمت! بھابی کہاں ہے؟" وہ رو دیا اور اپنے پاس بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ اس عورت کا چہرہ داغ داغ تھا۔ جیسے چہرے کی کھال جیسے جلتی ہُوئی آہنی سلاخوں سے داغ دی گئی ہو۔ ہُوا بھی یہی تھا۔ اس ہمت اور غیرت والی خاتون نے اپنا چہرہ خود داغا تھا تاکہ کیمپ میں آنے والے شکاریوں کی نظرِ ہوس سے محفوظ رہے۔ وہ چہرہ نہ داغتی تو اس وقت واہگہ کے اِس پار نہ ہوتی اور اب تک غالباً اس کا سارا جسم دغ چکا ہوتا ـــ نعمت اللہ کا یہ عالم اس طرح ہُوا کہ چند سُور ماؤں نے کیمپ کے کنوئیں میں نیلا تھوتھا گھول دیا تھا۔ بعضے اس آبِ حیات کو پی کر کیمپوں میں زندہ جاوید ہوگئے۔ نعمت اللہ ان میں سے تھا جن کی آنتیں اس مشروب سے کٹ کر رہ گئیں ـــ نعمت اللہ اسی روز ـــ اس ارضِ موعود میں پہنچنے کے چند گھنٹے بعد بارِ حیات آتار کر سُبکسار ہوگیا۔ وہ عفیفہ، اس کی بیوی تیسرے روز چل بسی اور مَیں جو اتنے دنوں سے منتظر تھا۔ خالی ہاتھ کراچی واپس آگیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مَیں لارنس روڈ کے ایک بنگلے میں رہتا تھا۔ رات بھر اس کی روشنیاں جلتی رہیں اور رات بھر مَیں بیٹھا یہ کہانی لکھتا رہا۔ نعمت اللہ کی کہانی ـــ اپنے گاؤں چمکور کی کہانی۔ اپنے گاؤں کے ملّا علی بخش کی بیٹی دلشاد کی کہانی۔ کیمپوں کا حال جو مَیں نے لکھا ہے، لاہور میں دیکھا۔ مہاجر بہنوں کا شکار کرنے والے بہت سے بھائی جن کے چہرے یاد ہیں نظر آئیں گے۔ مولوی، خدامِ خلق، قوم کے لیڈر اور سیاست داں، سبھی اصلی کردار ہیں۔ مَیں نے ان کے نام نہیں لکھے۔ ان میں ایک صاحب کو تو خدا نے وزیرِ مملکت بھی بنایا۔ خدا جسے چاہے جو عزت دے دے اس کی مصلحتیں وہی جانے۔

اس کہانی کا انجام بھی میرے ذہن نے نہیں سوچا۔ اسے میری گنہگار آنکھوں نے.

کراچی کے عیدگاہ میدان میں دیکھا جہاں بے خانمانوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ یہیں دلشاد، یا اس نام کی عورتیں مجھے پکوڑے تلتی، بیچتی نظر آئیں۔ ساتھ والی سے کہا "بہن ذرا میرے بچے کا دھیان رکھنا، مَیں بیسن لے آؤں" اور کسی کے ساتھ بیسن لینے چل دیں۔ یہ پکوڑے برسوں تلے جاتے رہے اور بکتے رہے، شاید اب بھی ان میں سے باقی ہوں۔ یہ بچے اب تیرہ چودہ برس کے ہونہار قُلی، مزدُور یا بھک منگے، اس ارضِ موعود کے شہریوں میں شامل ہیں۔

۱۹۴۷ء ابھی ختم نہیں ہُوا۔

اس کہانی کی کہانی بھی ختم نہیں ہُوئی۔

کراچی کے بعد میرا تقرر لاہور میں محکمہ صنعت کے ڈائرکٹر کے طور پر ہُوا۔ ایک روز ڈاک میں ایک پھٹا پُرانا پیلا لفافہ مجھے ملا۔ سوادِ تحریر قطعی طور پر اجنبی تھا۔ مَیں نے کھولا، یہ ایک لڑکی کی داستان تھی جو بیکہ و تنہا بے یار و مددگار اچھرہ کے قریب مہاجرین کی جھونپڑیوں میں رہتی تھی۔ اس نے لکھا کہ میرا جسم داغا گیا لیکن میں اس پار پہنچ گئی۔ یہ دھرتی میرے لیے فردوس کی سرزمین اور یہاں مُسلمان مجھے شفیق بھائی دکھائی دیتا تھا لیکن یہ بھائی ہوس ناک شکاری نکلے۔ انھوں نے میری جو خاطر مدارت کی ہے، اس کے طفیل مَیں تپِ دق کی مریض ہُوں اور میرے بہت دن باقی نہیں تھوڑا پڑھی لکھی ہُوں"۔ "یا خدا" کہیں سے مل گئی تھی مَیں نے پڑھی مجھے یہ کہنا ہے کہ مَیں دلشاد بن کر بھی دلشاد نہ بن سکی۔ مَیں ان مجبوروں میں سے ہُوں جو ہنسی خوشی پکوڑے نہیں تل سکتیں۔ بیسن نہیں لاسکتیں اور اس پاک سرزمین میں سینکڑوں شاید ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

میرے پاس ایک لمبی سی شورلیٹ کار تھی۔ اُن دنوں اس کی قیمت سستی اور شان زیادہ تھی۔ . . . . . . اسے مَیں نے ان جھونپڑیوں سے دُور سڑک پر چھوڑا، اور پوچھتا پچھاتا ڈھونڈتا ایک ٹاٹ کی جُھگی میں پہنچا وہاں ایک ویران آنکھوں والی، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس بیٹھی۔

تھی۔ لڑکی کیا تھی راکھ کا ڈھیر یا چوبِ خشک صحرا ۔۔۔ لگا کے آگ جسے کارواں رواں ہوا۔

راستے میں کوئی زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ ایک بار اس لڑکی نے لمبی آہ بھری، اور کہا شہاب صاحب۔ میں اس سے زیادہ لمبی اور چمکیلی کاروں میں سوار ہو چکی ہوں جن دنوں یہاں کیمپ میں تھی اور انھی کاروں میں واپس کیمپ میں پہنچ جاتی تھی۔

اس لڑکی کا علاج ہو گیا۔ اسے ایک چھوٹا سا مکان بھی مل گیا اور تھوڑا بہت روزی کا وسیلہ بھی ہو گیا اور میرے ذہن سے یہ واقعہ نکل گیا اور میں ایک بار پھر کراچی میں ایک نوکری پر چلا گیا۔

ایک روز میرے چپڑاسی نے ایک کاغذ کا پرزہ لا کر دیا کہ ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ ایک برقعہ پوش خاتون بھی ہیں۔ نام ان صاحب کا میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے انھیں اندر بلایا اور کہا معاف کیجیے میں آپ کو پہچانا نہیں۔ ان صاحب نے مسکرا کر اس برقعہ پوش خاتون کی طرف اشارہ کیا جس نے اب نقاب اُلٹ دیا تھا۔ یہ ایک چمپئی رنگ کی شعلہ رخسار خاتون تھی۔ اس نے کہا، میں اچھرہ کی جھگی میں رہنے والی دلشاد ہوں جو دلشاد نہ بن سکی۔ یہ میرے میاں ہیں۔ اور میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کیوں کہ میں پھر زندوں میں ہوں۔

رات کو یہ لوگ میرے ہاں کھانے پر آئے۔ دوسرے روز پھر دس کروڑ آبادی میں گم ہو گئے اور اس پر کئی سال گزر گئے۔

پچھلے دنوں ۔۔۔ ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں صدرِ پاکستان کے ہمراہ مشرقِ وسطیٰ کے دورے کی ایک منزل وہران میں اُترا۔ یہ نیٹو کا مرکز ہے اور امریکہ کا ایک اہم فوجی اڈہ، یہاں حسبِ رسم ہمارا تعارف مقامی عہدہ داروں اور معززین سے کرایا گیا۔ انہی میں

ایک صاحب پاکستانی تھے، ریشمی صافہ باندھے ہوئے، انھوں نے کہا شہاب صاحب آپ مجھے پہچانتے؟ میں نادم ہوا تو بولے میں آپ سے کراچی میں ملا تھا اور یہ میری بیوی ہیں۔ انھیں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

یہ وہی خاتون تھی لیکن اب پہچانی نہیں جاتی تھی۔ چہرے پر جوانی کے علاوہ خوشحالی کی آسودگی اور طمانیت کا نور تھا اس نے بتایا کہ اب ہمارا تین سال کا ایک بچہ بھی ہے۔

اس کتاب کے لکھے جانے کے چودہ سال بعد مجھے یقین ہو گیا کہ موت کے بعد تو نہیں البتہ اس ارضی زندگی میں آواگون کا چکر ضرور چلتا ہے۔ زندہ انسان آخری موت سے پہلے کئی مرتبہ مرتا اور کئی بار نیا جنم لیتا ہے۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را   ہر زماں از غیب جانے دیگر است

جب میں دلشاد کی زندگی کو مخالفانہ تنقیدوں کے پشتارے کے ساتھ تولتا ہوں جو اس کتاب پر چھپیں تو مجھے یہی زندگی بھاری نظر آتی ہے۔ بہت لوگ اس کتاب کے چھپنے پر مجھ سے ناخوش ہوئے اور مجھے بہت سے طعن سہنے پڑے لیکن اس روشن بشاش اور صبیح چہرے کے مقابلے میں جو مجھے وہران میں نظر آیا۔ ان کی کیا حقیقت ہے۔ اگرچہ اس نتیجے کو بھی میں ضمنی ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے تو فقط اپنے یار جانی اللہ داد اور اس کی سُبک چہرہ بیوی کی کہانی لکھنی تھی جن کے انتظار میں میں ہفتوں واہگہ کے بارڈر پر کھڑا رہا۔ اور جن کی تلاش میں میں نے وہ سب کچھ دیکھا جو ہزار کوشش کے باوجود بھی میرا قلم پوری طرح لکھنے سے قاصر رہا۔

قدرت اللہ شہاب

یکم ستمبر ۱۹۶۱ء

رَبُّ الْمَشْرِقَیْن

تری دُنیا میں مَیں محکوم و مجبُور

"اُس طرف کیا تکتی ہے، سالی؟ تیرا کوئی خصم ہے اُدھر؟"——
امریک سنگھ نے کرپان کی نوک سے دلشاد کی پسلیوں کو گدگدایا، اور بایاں گال کھینچ کر اُس کا مُنہ پچھم سے پُورب کی طرف گھما دیا۔

دلشاد مُسکرا دی۔ یہ مُسکراہٹ اُس کا خاصہ بن گئی تھی۔ بچپن میں اس کا کامیاب ترین ہتھیار اس کا رونا تھا۔ ایک ذراسی ریں ریں، راں راں کر کے وہ ماں کے سینے میں چھپائے ہُوئے دودھ سے لے کر الماری میں رکھی ہُوئی برفی تک ہر چیز کو حاصل کر لیا کرتی تھی۔ اب جوانی نے اس کی مسکراہٹ میں اثر پیدا کر دیا تھا۔ اس نئے جادو کا علم اس کو اس وقت ہُوا جب اس کی ایک مسکراہٹ پر نثار ہو کر رحیم خاں نے قسم کھائی تھی کہ اگر چاند یا سُورج یا تارے بھی اسے اٹھا لے جائیں تو وہ ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر اسے چھین لائے گا۔

رحیم خاں جھوٹا تھا۔ مکّار کہیں کا۔ آسمانوں کی بات تو دُور کی بات تھی وہ تو اسے زمین ہی پر کھو بیٹھا۔ دلشاد نظر بچا بچا کر قبلہ رُو ہو بیٹھتی تھی اور خیال ہی خیال میں اپنی جبیں کو اس آستانے پر جھکا دیا کرتی تھی، جس کے دامن میں رحمتوں اور نعمتوں کی ایک بے کراں دُنیا پوشیدہ

بتائی جاتی تھی۔ مغرب کی طرف کعبہ تھا۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر تھا۔ اس گھر کا تصوّر دلشاد کے دل میں عقیدت اور اُمید کا ایک تابناک چراغ روشن کر دیتا تھا۔ لیکن امریک سنگھ کو پچھم سے بے حد چڑ تھی۔ یُوں بھی سکھوں کی اس بستی میں چند رواج بڑے ٹیڑھے تھے، ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ بارہ سے بارہ بجے تک اُن کے اعصاب کمان کی طرح تنے رہتے تھے اور یُوں معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے بستی بھر کے بچّوں، جوانوں اور بُوڑھوں کو بجلی کے تاروں پر دھر دیا ہے۔

امریک سنگھ کا گھر مسجد کے عقب میں واقع تھا۔ اس مسجد کے دامن میں ایک بھیانک سا واہمہ پرورش پا رہا تھا۔ گاؤں بھر میں یہ بات پھیل رہی تھی کہ سرِ شام ہی مسجد کے کنویں سے عجیب عجیب ڈراؤنی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں ——— جیسے دو چار بکریوں کو بیک وقت ذبح کیا جا رہا ہو۔

"سالا حرامی" امریک سنگھ کہا کرتا تھا، "مرنے کے بعد بھی ڈکرا رہا ہے، بھینسے کی طرح۔ ڈال دو کچھ ٹوکرے کوڑے کے کنویں میں۔"

"ارے چھوڑو بھی" امریک سنگھ کا بھائی ترلوک سنگھ مذاق اڑاتا تھا، "بانگ دے رہا ہے مُلّا بانگ۔"

"خالصہ جی کے راج میں دھرم کی پُوری پُوری آزادی ہے ——— ہاں" گیانی دربار سنگھ جبڑے پھاڑ کر ہنستا۔

لیکن امریک سنگھ کی بیوی ڈرتی تھی۔ رات کو سنّاٹے میں جب مسجد کا کنواں گلا پھاڑ کر چنگھاڑتا، تو اس کا تن بدن ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مُلّا علی بخش کی تصویر آجاتی، جو مسجد کے حُجرے میں رہا کرتا تھا۔ نحیف بدن، دو ہاتھ کی لمبی داڑھی، آنکھوں پر موٹے گلاس کا چشمہ، سر پر سبز ململ کی بے ڈھب سی پگڑی، ہاتھوں میں رعشہ، گردن میں اُبھری ہُوئی رگیں۔ لیکن جب وہ صحن میں کھڑا ہو کے پانچ وقت اذان دیتا

تو مسجد کے گنبد گونج اٹھتے اور علی بخش کے نحیف و نڈھال گلے سے وہ زنّاٹے کی آواز نکلتی جیسے بہت سی آبشاریں دست بداماں ہو کر گونج رہی ہوں۔

اذان کی آواز سے امریک سنگھ کی بیوی کو بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ایک وقت یا دو وقت کی بات ہوتی تو خیر، لیکن جب دن بھر میں پانچ بار اُسے یہی بول سُننا پڑتے تو وہ گھبرا جاتی۔ اس نے بڑے بزرگوں سے سُن رکھا تھا کہ اذان میں کالے جادو کے بول ہوتے ہیں اور جوان عورتیں اسے سُن کر "بانگی" جاتی ہیں۔ اگر بن بیاہی نوخیز لڑکی بانگی جائے تو اُس کے بانجھ ہونے کا ڈر تھا۔ اگر بیاہی ہُوئی بیوی بانگی جائے تو اُس کے حمل گرنے لگتے تھے۔ اچنانچہ امریک سنگھ کے گھر میں پشت ہا پشت سے یہ رسم تھی کہ ادھر اذان کی آواز فضا میں لہرائی اُدھر کسی نے کٹورے کو چمچے سے بجانا شروع کیا۔ کسی نے چمٹے سے لڑایا۔ کوئی کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھ گئی، کوئی بھاگ کر پچھلی کوٹھڑی میں جا گُھسی ——— اور اس طرح یہ خاندان اپنی لاڈلیوں کی کوکھ کو کالے جادو کے اثر سے بچا کر ہرا بھرا رکھتا آیا تھا۔

امریک سنگھ کی بیوی کے بطن میں سوا لاکھ خالصے پرورش پا رہے تھے۔ سکھوں کی گنتی میں ایک سکھ سوا لاکھ انسانوں کے برابر شمار ہوتا تھا۔ آدھی رات گئے جب مسجد کا کنواں امریک سنگھ کی بیوی کے تصوّر میں بھیانک اور ہولناک گونج بن کر ڈکارتا تو اس کے پیٹ میں خالصوں کی یہ بہادر فوج ہڑبونگ مچانے لگتی۔ کبھی اس کے کانوں میں کنویں کی چنگھاڑیں جگر خراش انداز سے گونجتیں۔ کبھی اس کے تصوّر میں کنویں کا دہانہ جبڑے پھاڑ کر اس کی طرف لپکتا اور ہر وقت اسے یہ دھڑکا سا لگا رہتا کہ مُلّا علی بخش کنویں کی دیوار کے ساتھ رینگتا ہُوا باہر نکل رہا ہے اور چشم زدن میں کنویں کی منڈیر پہ کھڑا ہو کر نہ جانے کس وقت اسے "بانگ" کے رکھ دے گا۔

امریک سنگھ کی بہن کے بطن میں تو ابھی کسی خالصے نے اپنا گھر نہیں جمایا تھا۔ کیونکہ ابھی وہ بن بیاہی تھی، لیکن اس کے دل پر سوا لاکھ کا قبضہ تھا۔ رات کو جب وہ اپنی چارپائی

پر لیٹ کر ان میٹھی میٹھی گدگدیوں کو یاد کرتی جو مکئی کے کھیتوں کی اوٹ میں سوا لاکھوں کی بھُوکی انگلیاں اُس کے تن بدن کو چھلنی بنا کے رکھ دیتی تھیں تو اس کے سینے میں ارمانوں کا ایک ہجوم سا اُمڈ آتا اور وہ تصور میں اپنے جسم کو جوان جوان، قوی قوی خالصوں کے وجود سے آباد کر لیتی ——— لیکن پھر مسجد والے کنویں کی دلدوز چنگھاڑ اس کے ایوانِ تصور کو مسمار کر کے رکھ دیتی اور معاً اُسے محسوس ہوتا کہ کنویں کی عمیق گہرائی سے بھی ملّا علی بخش کالے جادو کے بول پکار پکار کر اس کے پیٹ سے چلنے والی نسلوں کے ناکے بند کر رہا ہے۔

امریک سنگھ کو اپنی بیوی اور بہن دونوں پر غصہ آتا تھا۔ بزدل کی بچیاں مُلّا علی بخش تو کب سے دُور دفان ہو چکا تھا۔ جس روز وہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھا وضو کر رہا تھا امریک سنگھ نے خود اُسے نیزے کی نوک پر اچھالا، ترلوک سنگھ نے اُس کو اپنی تلوار پر آزمایا، گیانی دربار سنگھ نے اُس کے جھنجھناتے ہُوئے خون آلود جسم کو تڑاخ سے کنویں میں پھینک ڈالا۔

ایک ملّا علی بخش ہی پر کیا منحصر تھا۔ اب تو چمکور کا سارا گاؤں صاف ہو چکا تھا۔ بانگیں دینے اور سُننے والوں کا وجود ناپید ہو گیا تھا۔ کچھ بھاگ گئے تھے، کچھ مر گئے تھے اور بہتوں کی گردن پر خالصوں کی مقدس کرپانیں سجدہ ریز ہو چکی تھیں ——— لیکن یہ ڈرپوک حرام زادیاں تھیں کہ اب بھی وہی بانگوں کے ڈر سے اپنے بچہ دانوں کو چھپائے چھپائے پھرتی تھیں۔ چنانچہ جب امریک سنگھ کی بیوی اور بہن سوتے سوتے چیخ کر چھاتیاں پیٹنے لگتیں تو اس کا دِل طیش سے جل کر کباب ہو جاتا اور وہ چمٹا اٹھا کر انھیں مار مار کر لہولہان کر دیتا۔ مارتے مارتے اس کے ہاتھ شل ہو جاتے، بازوؤں میں تھکن آ جاتی، رگیں پھُول جاتیں اور وہ اپنی گنجان داڑھی سے پسینے کے قطروں کو جھاڑتا ہُوا دیوانوں کی طرح لپک کر دلشاد کے پاس چلا جاتا۔ جس طرح دائمی زکام کا مریض دماغ کی ریزش کو ہلکا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً نسوار سُونگھ لیا کرتا ہے، اسی طرح گاؤں بھر کے

خالصے اپنی وہم آلود بیویوں اور بہنوں سے بھاگ کر اپنے بدن کا فشارِ خون دھیما کرنے کے لیے دلشاد کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔

دلشاد کو مسجد میں رکھا گیا تھا کیونکہ حجُرے کی چھت جل جلا کر گر چکی تھی۔ یُوں تو اُس کے سرمائے میں جسم بھی تھا اور جان بھی لیکن اُس کا عزیز ترین سرمایہ اس کے آبا کی تسبیح تھی۔ ملّا علی بخش کے ہاتھ اسی تسبیح پر گھومتے گھومتے بوڑھے ہو گئے تھے۔ پتھر کے گول گول دانوں پر اس کی انگلیوں کے نشان نقشِ فریادی کی طرح پیوستہ تھے۔ سالہا سال کے گریۂ نیم شبی اور فغانِ سحری کے آنسو اس تسبیح میں موتیوں کی طرح پروئے ہُوئے تھے۔ یہی چند موتی تھے جن کے وجود سے دلشاد کا لٹا ہُوا صدف ابھی تک آباد تھا ——— وہ دِن بھر اس تسبیح کو گلے میں ڈال کر قمیض کے نیچے چھپائے رکھتی تھی لیکن شام پڑتے ہی اسے کسی ویران کونے میں دبا دیتی تھی، کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ کہیں بھنگ اور شراب میں سموئی ہُوئی زبانیں اس کے ابا کی انگلیوں کے نقوش کو بھی چاٹ چاٹ کر ناپاک نہ کر دیں۔

آدھی آدھی رات گئے وہ مسجد والے کنویں کی منڈیر پر رو یا کرتی تھی۔ اس کی آنکھیں کنویں میں ٹکٹکی لگائے پک جاتی تھیں کہ شاید کبھی اس کے ابا کی تیرتی ہُوئی پگڑی کی ایک جھلک اُسے دکھائی دے، اس کے کان کنویں کی طرف لگے لگے تھک جاتے تھے کہ شاید کبھی اُس کے ابا کی آخری سسکی اُسے ایک بار پھر سُنائی دے یا وہ خوفناک چنگھاڑیں جنھوں نے گاؤں بھر کی عورتوں کو پریشان کر رکھا تھا، شاید اس کے منتظر کانوں کو بھی نوازیں ——— لیکن کنواں تاریک تھا اور قبر کی طرح خاموش۔ جب کوئی آوارہ چمگادڑ اس میں پَر پھڑپھڑاتی، تو ——— ہر پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ بدبُو اور تعفن کے تیز تیز بھپکے فضا میں منتشر ہو جاتے تھے۔ کیونکہ سوا لاکھ بہادروں نے ملّا علی بخش کا گلا مرنے کے بعد بھی بند رکھنے کے لیے کنویں کو غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے اٹا اٹ بھر دیا تھا۔

دلشاد کا وجود ایک ٹوٹے ہُوئے تارے کی طرح تھا کہ جس کے ٹکڑے آسمان کے

ویرانوں میں اکیلے ہی اکیلے بھٹک رہے ہوں۔ آسمان کی بساط اُلٹ چکی تھی۔ سُورج اور چاند چھپ گئے تھے۔ تاروں کے چراغ بُجھ گئے تھے اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ بے یار و مددگار۔ مسجد کے دروازے کے ساتھ لگی ہُوئی، سہمی ہُوئی، حیران۔۔۔۔۔ لیکن اس کے دم سے مسجد پھر آباد ہو گئی تھی۔ لوگ باریاں باندھ باندھ کر وہاں آتے تھے اور جب وہ بہادر خالصے محراب کے نیچے بیٹھ کر شراب کا ادھیا کھولتے اور دلشاد کی بوٹیوں کو چچوڑ چچوڑ کر کھانے کی کوشش کرتے، تو گویا انھیں یہ فخر ہوتا کہ وہ گن گن کر ساڑھے تیرہ سو برس کی اذانوں اور نمازوں کا بدلہ چکا رہے ہیں۔

چمکور کی مسجد گوردواروں سے بھی زیادہ آباد ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ گاؤں کی بیاہی ہُوئی اور بن بیاہی ماؤں کو یہ احساس ستانے لگا کہ مُلّا علی بخش کے بعد مُلّا علی بخش کی بیٹی ان کی کوکھ لُوٹنے پر تُلی ہُوئی ہے۔ وہ تو چمٹے کھا کھا کر اپنی چارپائیوں سے لگ کر سو جاتی تھیں لیکن ان کے بہادر خالصے رات رات بھر دلشاد کے ساتھ اپنی آنے والی نسلوں کا سودا کیا کرتے تھے۔

امریک سنگھ، امریک سنگھ کا باپ، امریک سنگھ کا بھائی ——— ایک خالصے کے بعد دوسرا خالصہ، دوسرے خالصے کے بعد تیسرا خالصہ ——— رات بھر وہ نظریں بچا بچا کر، موقع جانچ جانچ کر مسجد کے آستانے پر حاضری دیتے تھے۔ بھُنی ہُوئی کلیجی اور گُردے اُڑتے۔ تلے ہُوئے کبابوں کا دَور چلتا۔ شراب اور بھنگ کی بالٹیاں پٹتیں اور اپنی نسل بندی کے وہ بیج جن کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے ان کی بیویاں سَو سَو طرح کے جتن کرتی تھیں، وہ بلا دریغ مسجد کی چار دیواری میں بکھیر آتے ——— اور ایک دن بیٹھے بٹھائے یکایک دلشاد سرسوں کی طرح پھُول اٹھی۔ جب یہ خبر پھیلی تو گاؤں میں آگ سی لگ گئی۔ بیویوں نے چیخ چیخ کر اپنا سر پیٹ لیا۔ کنواری لڑکیوں نے رو رو کر آنکھیں سُجالیں اور مکئی کے کھیتوں میں چھُپ چھُپ کر اپنے خالصوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ کنویں کی چنگھاڑیں تیز تر ہونے لگیں۔ گھروں میں فِٹ بہ فِٹ آنے لگے۔ چمٹے پر چمٹے چلنے لگے، ایک کہرام سا مچ گیا۔

پہلے تو سب کی یہ رائے ہُوئی کہ بچّہ پیدا ہونے سے پہلے ہی دلشاد کو مار کے کنویں

میں پھینک دیا جاتے۔ لیکن پھر امریک سنگھ کو ایک مفید تجویز سوجھی۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک روز صبح سویرے وہ اسے اپنی بیل گاڑی پر بٹھا کے پاس کے تھانہ میں لے گیا اور اغوا شدہ مُسلمان عورتوں کی برآمدگی کے سلسلہ میں اپنی کوششوں کا عملی ثبوت دینے کے لیے دلشاد کو پیش کر دیا۔

تھانیدار بھورام نے امریک سنگھ کی کارگزاریوں کو خوب سراہا ——— پولیس کی طرف سے شکریہ کا ایک پروانہ اسے عطا کیا اور ڈپٹی کمشنر بہادر سے بھی سند دلوانے کا وعدہ فرمایا ——— پھر تھانیدار صاحب نے عینک اٹھا کر دلشاد کا جائزہ لیا۔ قبول صورت، جوان، ذرا پیلی سی، لیکن گرم گرم، گداز ——— لیکن جب ان کی نظر دلشاد کے پیٹ پر پڑی۔ تو ان کی ابھری ہُوئی اُمیدوں کو ایک زبردست دھکّا لگا۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ اگر دس بیس دن کی بات ہو، تو وہ اسے ابھی تھانہ ہی میں رکھ لیں۔ لیکن جب ہیڈ کانسٹیبل دریودھن سنگھ نے جوڑ توڑ کے حساب لگایا کہ ابھی "خلاص" ہونے میں تین ساڑھے تین مہینے باقی ہیں تو تھانیدار بھورام کو بڑی مایوسی ہُوئی۔ پھر بھی رات کو کھانا کھا کر جب وہ ایک پتلی سی بنیان اور جانگیہ پہن کر چارپائی پر لیٹے تو انھوں نے دلشاد کو پاؤں دبانے کے لیے اپنے پاس بلا لیا۔ جاتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ تھانیدار صاحب کے پاؤں کا درد بڑھتے بڑھتے پنڈلیوں میں آگیا پھر گھٹنوں میں۔ پھر رانوں کے اندر، پھر کولہوں کے آس پاس ——— اور وہ دلشاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دُکھتی ہُوئی رگوں کا درد دبواتے رہے۔ تھانیدار بھورام کے نزدیک خواہش کا دوسرا نام تسکین تھا۔ چناں ہُوا تو کیا، چنیں ہُوا تو کیا؟

دلشاد کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ پچھلے چند مہینوں میں اس نے زندگی کے پیچ کچھ اس طرح کھولے تھے کہ اس کے بدن کی بوٹی بوٹی گویا مرہم کا پھاہا بن کر رہ گئی تھی جو کوئی اسے جہاں سے جی چاہتا لگا لیتا اور اس کے جسم کا ہر حصّہ بھڑکتے ہُوئے، ہانپتے ہُوئے، بے چین انسانوں کو چند ہی لمحوں میں تسکین کا جام پلا دیتا تھا۔ لیکن اس کی اپنی رگ رگ

ہیں کتنے پھوڑے تھے، کتنی ٹیسیں تھیں، کتنے رِستے ہُوتے زخم تھے، کاش بابا رحیم خاں ہوتا تو دیکھتا۔

دلشاد کو اپنے آپ پر بھی غصہ آتا تھا کہ اس نے بیچارے رحیم خاں کو اتنی بار ناحق مایوس کیا تھا۔ ایک روز جب اس نے اُسے زبردستی چومنے کی کوشش کی تھی تو دلشاد نے غصہ سے اس کے سر پر ایسا دوہتڑ مارا تھا کہ اُس کی چوڑیاں ٹوٹ کر رحیم خاں کے ماتھے میں گڑ گئی تھیں، اور وہ خود ساری رات انگاروں پر لوٹتی رہی تھی کہ نہ جانے خدا اور رسُولؐ رحیم خاں کو اس گناہ کی کیا سزا دیں گے؟ بچارا رحیم خاں!

پندرہ بیس دن کے بعد جب تھانیدار بھورام کے گھٹنوں اور کولہوں اور کمر کا درد ذرا کم ہُوا تو انھوں نے دلشاد کو چھٹی دی اور ہیڈ کانسٹیبل وربودھن سنگھ کے ساتھ اُسے انبالہ کیمپ بھیج دیا گیا۔ راستہ میں ہیڈ کانسٹیبل وربودھن سنگھ کے کولہوں اور گھٹنوں میں بھی کئی بار درد اُٹھا۔ لیکن دلشاد بڑی تندہی سے اس کے درد کا مداوا کرتی گئی اور دس گھنٹے کی مسافت انھوں نے دس بارہ دِنوں میں بخیر و عافیت طے کر لی۔

انبالہ کیمپ میں بہت سی لڑکیاں تھیں، بہت سی عورتیں۔ جوان بھی، خوبصورت بھی، لیکن ٹوٹے ہُوئے تاروں کی طرح، کہ جن کے شرر بُجھ گئے ہوں، جن کی کہکشاں لُٹ گئی ہو، جن کی تنویروں پہ کیچڑ مَل دیا گیا ہو۔

ہر روز فوج کے ٹرک آتے تھے اور نئی نئی لڑکیوں، نئی نئی عورتوں کو انبالہ کیمپ میں چھوڑ جاتے تھے۔ ناموس اور تقدس کی تسبیح کے یہ بکھرے ہُوئے انمول موتی پھر اپنے مرکز کی طرف جمع ہو رہے تھے۔ لیکن ابھی اُن پر اپنے "سبحان" اپنے "غفور الرحیم"، اپنے "پاک پروردگار"، اپنے "قادرِ مطلق" کی حمد کا وظیفہ شروع نہ ہُوا تھا۔ بلکہ کیمپ کمانڈر میجر پریتم سنگھ اور اس کے جوانمرد سپاہی ابھی تک ان پر گِدھ کی بازی جیتتے تھے۔ خیر دلشاد کو ایک قسم کی چھٹی تھی۔ یُوں تو نیک اولاد ہمیشہ اپنے ماں باپ کا سہارا ہوتی ہے لیکن

دلشاد کو اپنے ہونے والے بچے پر بڑا ہی بھروسہ تھا کہ اس نے پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنی مجبُور ماں کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔

انبالہ کیمپ کے پہلو میں ریلوے لائن تھی۔ سُورج کی روشنی میں ریل کی پٹڑیاں چاندی کے تار بن کر چمکتی تھیں اور دُور، بہت دُور مغرب کی طرف ان کی نقرئی لڑیاں خوابوں کے سہانے جزیروں میں گم ہو جاتی تھیں کہ ان کا دوسرا سرا مشرقی پنجاب میں نہیں مغربی پنجاب میں ہے! مغربی پنجاب! ! مغرب کا خیال آتے ہی دلشاد کی راکھ میں ایک ننھا سا چراغ ٹمٹما اُٹھتا۔

مغرب میں کعبہ ہے۔ کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر ہے۔ لیکن کیمپ کی دوسری عورتیں کہتی تھیں کہ مغرب میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ وہاں ہمارے بھائی ہیں، ہماری بہنیں ہیں، ہمارے ماں باپ ہیں۔ وہاں عزّت ہے۔ وہاں آرام ہے ——— دلشاد سوچتی تھی کہ شاید وہاں رحیم خاں بھی ہو! یہ خیال آتے ہی اس کے جسم کا رواں رواں مچل اُٹھتا اور وہ بے چین ہو جاتی کہ پَر لگا کر اُڑ جائے اور اپنے تھکے ہُوئے، دُکھے ہُوئے جسم پر اس ارضِ مقدس کی خاک مَل لے۔

ہفتہ، دو ہفتے، مہینہ، دو مہینے ——— دن گزرتے گئے۔ راتیں بیتتی گئیں، اور مغرب کا خوش آئند تصور دلشاد کے سینے میں اُمیدوں کا نور پھیلاتا رہا۔ انبالہ کیمپ کی آبادی بڑھتی گئی اور جب میجر پریتم سنگھ اور اس کے جوانوں کا دِل اچھی طرح سیر ہو گیا تو ایک دِن وہ ریل بھی آ گئی جس کے انتظار میں اُمیدوں کے چراغ ابھی تک جل رہے تھے جب وہ ریل کے ڈبے میں سوار ہُوئی، تو دلشاد کو ملّا علی بخش کی یاد آئی وہ بھی اسی طرح ریل میں بیٹھ کر حج کو روانہ ہُوا تھا۔ گلے میں ہار تھے، کپڑوں پر عطر تھا اور گاؤں کے لوگ باجا بجاتے ہُوئے اس کے ساتھ اسٹیشن تک آئے تھے۔ ———!

ریل کے ہر فراٹے کے ساتھ عورتوں کے ٹوٹے ہُوئے آبگینے جھنجھنا اُٹھتے تھے۔

پہیّوں کی ہر گردش کے ساتھ ان کے جسم اور رُوح کا ایک بل نکل جاتا تھا۔ جب وہ کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر تار کے کھمبوں کو دیکھتیں جو بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے کی طرف بھاگ رہے ہوتے، تو انھیں یقین سا ہو جاتا کہ وہ آگے ہی کی طرف جا رہی ہیں۔ زمین کا جو چپّہ چپّہ ان کے نیچے سے نکلتا وہ انھیں مشرقی پنجاب سے اٹھا کر مغربی پنجاب کے قریب تر لے جاتا۔ اگر کہیں گاڑی رکتی، تو ساری کائنات دم سادھ لیتی۔ وقت کی رفتار ساقط ہو جاتی اور انھیں یہ ڈر لگتا کہ شاید انجن کے سامنے اچانک بڑے بڑے پہاڑ آگئے ہیں۔ جب گاڑی دوبارہ چلتی تو دِل کی دھڑکنیں جاگ اُٹھتیں، سینوں کے ارمان تازہ ہو جاتے اور وہ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال نکال کر اس ہَوا کو چھونے کی کوشش کرتیں، جو مغرب کی سمت سے آ رہی تھی!

لدھیانہ، پھلور، جالندھر ——— امرتسر ——— ہر منزل پر عورتوں کی زندگی کے بند کھلتے گئے۔ ان کی خاک میں سوئے ہُوئے نغمے بیدار ہونے لگے۔ وہ گنگنانے لگیں، وہ مُسکرانے لگیں۔ وہ آنکھیں مَل مَل کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ جیسے کسی بھیانک خواب کو بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کسی نے بالوں میں کنگھی کی۔ کسی نے دوپٹہ کے ساتھ دانتوں کی میل اُتاری۔ کوئی کپڑے جھاڑنے لگی۔ کوئی بچّوں کو لوریاں سُنانے لگی۔ کچھ عورتوں نے سر سے سر جوڑ کر گیت گائے۔ پیارے پیارے رَس بھرے، دلرُبا گیت، کہ "اے کالی کملی والے۔ میَں تیری یثرب نگری میں آئی ہوں" ——— "مجھے اپنی کملی میں چھپالے۔ مجھے اپنے پاؤں کی خاک بنالے ———"

جب امرتسر کے اسٹیشن سے نکلی، تو کسی نے کہا کہ اب صرف ڈیڑھ گھنٹے کا سفر اور ہے۔ بس ڈیڑھ گھنٹہ اور! ساٹھ اور تیس، نوّے منٹ! یہ ناقابلِ یقین خیال عورتوں کے تن بدن پر شراب کے تیز و تند نشے کی طرح چھا گیا۔ اپنی منزل کو اتنا قریب پاکر وہ شدّتِ احساس سے مفلوج سی ہوگئیں۔ پچھلے بھیانک مہینوں کی یاد زہر بن کر

اُن کے سینے میں عود کر آئی۔ ماضی کی ہولناک حقیقت مستقبل کے سہانے ارمانوں پر غالب آگئی۔ یکایک اُن کو اپنے شاداب گاؤں یاد آنے لگے۔ اپنے جوان جوان بھائی اپنے نحیف نحیف ماں باپ، جن کے بے گور و کفن لاشے گلیوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔ اپنی اُداس اُداس بہنیں جو کیمپوں میں بیٹھی فرشتوں کا انتظار کر رہی تھیں کہ وہ انھیں اپنے نورانی پروں میں چھپا کر لے جائیں۔ دُور، کہیں بہت دُور، مغرب کی طرف ———

وہ رونے لگیں۔ اُن کے گالوں پر آنسوؤں کے پرنالے بہنے لگے۔ دلشاد بھی رو رہی تھی، بِلک بِلک کر سِسک سِسک کر اور آنسوؤں کا نمکین پانی اس کے ہونٹوں پر پہاڑی چشموں کی طرح اُبل رہا تھا۔ وہ روتی گئی، وہ روتی گئی اور اشکوں کی دبیز چادر نے اُس کی پلکوں کو اپنے دامن میں چھپالیا۔ ایک عجیب سی غنودگی، ایک عجیب سا خمار اس کے رُوئیں رُوئیں پر چھا گیا۔ اسے یُوں محسوس ہونے لگا کہ وہ سمندر کی اتھاہ لہروں میں غوطے کھا رہی ہے اور بے شمار سنپولیے اُس کے تن بدن پر رینگ رہے ہیں ——— رینگ رہے ہیں!!

رَبُّ المُغرِبَین

مری دُنیا میں تیری پادشاہی

جب اس کی آنکھ کھُلی تو ریل کا ڈبہ خالی ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کی ایک مہترانی ڈبے کے فرش کو پانی سے دھو رہی تھی۔ دلشاد کے پہلو میں ایک ننھّی سی بچّی رو رہی تھی۔ صبح کی فضا سُورج کی کنواری کرنوں میں نہا رہی تھی درختوں پر چڑیاں پھُدک رہی تھیں گھاس پر شبنم کے موتی چمک رہے تھے، اسٹیشن پہ چہل پہل تھی۔ ایک گرم چائے والا کھڑکی کے پاس خوانچہ لگائے دودھ اُبال رہا تھا۔

دلشاد اُٹھ کر کھڑکی کے سہارے بیٹھ گئی۔ اس نے نقاہت سے چائے والے سے پوچھا: "کیا یہ مغرب ہے بھائی؟"

چائے والا اپنے پیلے پیلے کریہہ المنظر دانت نکال کر ہنسا "کیوں؟" کیا نماز پڑھو گی اس وقت؟"

اسٹیشن کی مہترانی جب ڈبے کے فرش کو دھو چکی تو اس نے اپنی محنت کے صلے میں دلشاد سے ایک چوّنی مانگی۔ پھر مایوس ہو کر اُس نے دلشاد کو چند غلیظ گالیاں دیں "سارا ڈبہ پلید کر دیا رانڈ نے، ذرا صبر نہ ہو سکا؟ راستے ہی میں جن بیٹھی ——— "اسٹیشن

سٹیشن کی مہترانی جاکر ایک مضبوط سے مہتر کو اپنے ساتھ لے آئی اور دونوں نے مل کر دلشاد کو ڈبے سے نکال دیا۔

پلیٹ فارم پر ایک سامان لادنے والا ٹھیلا کھڑا تھا۔ دلشاد اس کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔ سامنے چائے کا سٹال تھا۔ تانبے کے چمکدار سماوار سے اُبلتے ہوئے چائے کے بھپکے پیچ در پیچ نکل رہے تھے جیسے کسی نازنین کے گیسو ہوا کے دوش پر لہرا رہے ہوں۔ اس کے آگے پھلوں کی دوکان تھی۔ رنگ برنگ کاغذوں پر کندن کی طرح دمکتے ہوئے کیلے سنگترے اور مالٹے سجائے رکھے تھے۔ ایک کٹا ہُوا سُرخ انار چھابڑی میں پڑا تھا۔ چھت کے ساتھ انگوروں کے بڑے بڑے خوشے لٹک رہے تھے دلشاد کا گلا کانٹے کی طرح خشک تھا اس کی زبان پر گدلے گدلے، میلے میلے لعاب کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کے پیٹ میں ایک عجیب سا بخار سلگ رہا تھا۔ اس کی کمر میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور اس کا سارا بدن ایک دُکھتے ہوئے پھوڑے کی طرح چُرمُر کر رہا تھا۔

دلشاد نے اپنی خشک زبان ہونٹوں پر پھیری۔ اس کی ننھی سی بچی چوہیا کی طرح اس کے سینے سے چمٹی ہوئی چسر چسر دودھ پی رہی تھی۔ کبھی وہ سوچتی تھی کہ شاید وہ رات بھر سوتی ہی رہی اور مغرب کی سُہانی منزلِ مقصود کو پیچھے چھوڑ آئی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ شاید اسی سٹیشن کی فلک بوس عمارت کے پیچھے اس کا رحیم خاں اس کے انتظار میں کھڑا ہو یا شاید وہ لوگوں کے ان جمگھٹوں میں کھویا ہُوا اُسے تلاش کر رہا ہو جو پلیٹ فارموں پر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

وہ کوشش کرکے اٹھی، کہ لوگوں کے ہجوم کے قریب ہو جائے لیکن اس کے گھٹنے کٹاک سے بج کر رہ گئے۔ اس کی پنڈلیوں میں رعشہ سا آگیا اور وہ سر تھام کر ٹھیلے کے سہارے پھر بیٹھ گئی۔

دو خوش پوش، خوش شکل جوان لڑکے ہاتھ میں ہاتھ دیئے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے

تھے۔ ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ دوسرے کے پاس سگار تھا جب وہ دلشاد کے سامنے سے گزرتے تو دُور تک پیچھے مڑ مڑ کر اُسے دیکھتے رہتے۔ رفتہ رفتہ ان کے چکر کی طوالت کم ہوتی گئی اور بالآخر وہ دلشاد کے عین سامنے کھڑے ہو گئے۔ دلشاد کا دل زور زور سے پسلیوں کے ساتھ ٹکرانے لگا۔ بیم و رجا کا ایک عجیب سا تانا بانا اُس کے دماغ پر چھا گیا۔

چمکور کی مسجد میں اگر کوئی اُسے گھور کر دیکھتا، تو وہ بے بسی کے عالم میں اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کے بیٹھ جاتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اگلے لمحہ اسے گھورنے والے کے ہاتھ اُس کا گوشت نوچ کھسوٹ کر رکھ دیں گے۔ لیکن ریل میں بیٹھ جانے کے بعد اس نے ان خوشگوار توقعات کا سہارا پکڑ لیا تھا جو مغرب کے تصور سے اس کے دل اور دماغ میں بسی ہُوئی تھیں۔ اس لیے وہ سوچنے لگی، کہ شاید یہ خوبصورت جوان وہ مہربان بھائی ہوں، جن کے خون کی کشش انبالہ کیمپ کی عورتوں کو ہر لمحہ اپنی طرف کھینچا کرتی تھی۔ اس خیال سے دلشاد کے دل میں خوشی کی ایک لہر سی ناچی۔ وہ تو مسکرانا بھی چاہتی تھی۔ لیکن اس کے بدن میں درد کی ٹیسوں کا طوفان سا اٹھا ہُوا تھا اس لیے وہ باوجود کوشش کے بناوٹی طور پر بھی مسکرا نہ سکی۔ پھر بھی محبت کا جتنا لوچ اس کا دکھتا ہُوا، رِستا ہُوا جسم اکٹھا کر سکتا تھا، اس نے اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر اُن نوجوانوں کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔

"انور!" ایک نوجوان سگریٹ کا دھواں دوسرے کے مُنہ پر چھوڑ کر گرمجوشی سے مسکرایا۔

"رشید" دوسرے نوجوان نے گرمجوشی کا جواب گرمجوشی سے دیا۔

انور! رشید!! دلشاد گویا سرشار ہو گئی۔ یہ دو نام اس کے کانوں میں آبِ حیات سا ٹپکا گئے۔ مہینوں سے وہ ایسے مانوس نام سننے کے لیے ترس گئی تھی۔ اس کے گاؤں کے انور، رشید، محمود، نسیم، خالد، جاوید تو مدت سے مٹ گئے تھے۔ ان کی جگہ اس کے

تصوّر میں اب شمشیر سنگھ، امریک سنگھ، کرتار سنگھ، ترلوک سنگھ، پنجاب سنگھ، سورکھ سنگھ اور دربار سنگھ کے نام اژدھوں کی طرح لہراتے تھے۔ ان ناموں کا زہر اس کی رگ رگ میں خون کی طرح سرایت کر چکا تھا۔ ان کی سڑاند اس کے روئیں روئیں میں بسی ہوئی تھی۔ اُن کا وحشی اُبال اس کی ہڈیوں میں درد بن کر رچا ہوا تھا لیکن اب جو اس کے کانوں نے رشید اور انور کے نام سُنے، تو اُسے یوں محسوس ہوا، جیسے وہ آبِ کوثر سے نہا رہی ہو۔ جیسے وہ پاک و مصفا پانی اُس کے گلے ہوئے، سڑے ہوئے جسم پر گلاب اور کافور کی خوشبوئیں چھڑک رہا ہو ——— ان کی گری ہوئی گردن میں افتخار کا اُبھار آ گیا۔ اس کے مایوس اور غم دیدہ سینے میں اُمید و مسرت کی کرنیں پھوٹ اٹھیں اور اس نے ہاتھ کے اشارہ سے اُن دو جوانوں کو اپنے قریب بلایا۔

"یہ کیا جگہ ہے بھائی؟" دلشاد نے پوچھا۔

"لاہور ہے۔" انور نے کہا۔

"تم کہاں جاؤگی؟" رشید نے پوچھا۔

"جہاں قسمت لے جائے۔"

"باپ رے باپ!" انور نے رشید سے سرگوشی کی۔

"بڑی سپورٹ ہے بھائی!" رشید نے انور کو آنکھ ماری۔

"آؤ بہن، تم ہمارے ساتھ چلو۔" دونوں ہمزبان ہو کر بولے۔

جب دلشاد ٹھیلہ کا سہارا لے کر اُٹھی تو اس کے بھائیوں کو پہلی بار اپنی ننھی سی بھانجی کی جھلک دکھائی دی۔

"ارے" انور حیرانی سے اُچھلا۔

"یہ کیا بلا ہے؟" رشید نے پوچھا۔

"لڑکی ہے جی۔" دلشاد کچھ ہچکچائی، کچھ شرمائی۔

"بڑی چھوٹی سی ہے۔" انور نے جائزہ لیا۔

"ایک ہی دن کی ہے جی۔" دلشاد آخر بھائیوں سے کیا کہے، کیا نہ کہے۔

"آخ تھو" انور کو اُبکائی سی آئی۔

"لاحول ولاقوۃ" رشید کا جی متلایا۔

وہ دونوں بھائی قے کرتے کرتے بچے، اور تیز تیز قدم وہاں سے چلے گئے۔ سامنے والے پلیٹ فارم پر ایک خوبصورت عورت بھڑکیلی سی شلوار اور قمیض پہنے جا رہی تھی۔ اس کا دھانی دوپٹہ اس کے سڈول شانوں پہ لہرا رہا تھا۔ رشید اور انور نے چھلانگیں مار کر ریل کی پٹڑی کو عبور کیا اور ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اس خوبصورت عورت کے تعاقب میں چل کھڑے ہوئے۔

دوپہر کے وقت سٹیشن کی رونق ذرا ڈھل گئی۔ دھوپ میں تمازت کا اثر بڑھ گیا اور مہربان سورج کی کرنیں دلشاد کے دُکھتے ہوئے جسم کی ٹکور کرنے لگیں۔

ایک انگریز اپنی میم کے ساتھ پلیٹ فارم پر دھوپ سینک رہا تھا ان کا چھوٹا سا لڑکا دلشاد کے قریب اپنے کتے سے کھیل رہا تھا۔ جب اُس نے دلشاد کی ننھی سی لڑکی کو دھوپ میں لیٹے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا، تو اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں اور وہ خوشی سے چیختا ہوا بھاگا اور اپنی ماں کو یہ عجوبہ دکھانے کے لیے گھسیٹ کر لے آیا۔

"ہاؤ ونڈرفل، ممی، ہاؤ ونڈرفل!" بچہ چیخ رہا تھا اور حیرت اور مسرت سے اس کی آنکھیں پھٹی جاتی تھیں۔

دلشاد کی بیٹی ایک پھٹی سی چادر میں لپٹی ہوئی اپنے ننھے ننھے گھونسے تان کر آسمان کو دکھا رہی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ارض و سما کی کونین کو اپنی ٹھوکروں سے دھتکار رہے تھے۔ انگریز کا بچہ اس ننھی سی چیز کو دیکھ دیکھ کر تالیاں بجا تا تھا۔

ناچتا تھا اور ہر لحہ کوشش کرتا تھا کہ وہ اُچک کر اس جاندار کھلونے کو اپنے ہاتھوں
میں اٹھالے۔ اُس کی ماں نے اُسے ڈانٹا کہ دوسرے کی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا کرتے۔ لڑکا
مچل گیا۔

"ہم تم کو ایسا ہی کھلونا لا دیں گے،" لڑکے کے باپ نے اُسے چمکارا ـــــ

"جھوٹ" لڑکا رو رہا تھا۔

"ہاں، ہاں بچے، ہم ضرور تم کو ایسا ہی کھلونا لا دیں گے،" لڑکے کی ماں نے وعدہ
کیا۔

"تم کب مجھے ایسا ہی کھلونا لا دو گے؟" لڑکا بات پکی کرنا چاہتا تھا۔

"بہت جلد میرے بیٹے، بہت جلد،" باپ نے اپنی بیوی کے گاؤن کا جائزہ لیا۔
جس کی گولائی پیٹ کے اُوپر بہت پھیلی ہوئی تھی۔ بیوی نے شرما کر منہ پھیر لیا۔

"ممی! اس کھلونے کو چاکلیٹ دو!"

"نہیں بیٹے، یہ چاکلیٹ نہیں کھا سکتی۔"

"اچھا تو ممی، اسے ایک عمدہ سا سوٹ دو۔"

"ہاں میرے ڈارلنگ، ہم اسے کپڑا دیں گے۔"

"اور پیسے بھی، میری ممی!"

"ہاں، پیسے بھی میرے ڈارلنگ۔"

لڑکا خوشی سے چیخ چیخ کر پھر تالیاں بجانے لگا اور جب اس کا جی اس کھیل سے بھر
گیا تو اُس کی ماں نے دلشاد کو اونی کپڑے کا ایک ٹکڑا اور پانچ روپے دیے۔ جب وہ جانے
لگے، تو دلشاد نے دل ہی دل میں اس بچے کو دُعا دی، جو پہلی بار اُس کی زندگی میں رحمت کا
فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔

جب دلشاد کے ہاتھ میں پیسے آ گئے، تو دُنیا کے ساتھ اس کا رشتہ از سرِ نو قائم

ہو گیا۔ ایک چائے والے نے اس کے پاس آ کر "گرم چائے" کی ہانک لگائی۔ ایک "گوشت
روٹی" والا بھی اس کے نزدیک اپنا خوانچہ لے آیا۔ اور جب دلشاد روٹی کھانے لگی تو ایک
کتا بھی زبان نکال اس کے سامنے آ بیٹھا۔

قریب ہی ایک بنچ پر دو بزرگ بیٹھے رائے زنی فرما رہے تھے۔ ایک کی داڑھی
سفید تھی، دوسرے کی حنائی۔ دونوں کچھ دیر سے انگریز اس کی میم اور بچے کی حرکات پہ
ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ جب میم نے دلشاد کو اونی کپڑا اور پانچ روپے خیرات
دیے، تو ان دونوں بزرگوں کو یہ محسوس ہوا کہ اس فرنگن نے ان داڑھیوں کو پکڑ کر زور
سے جھٹک دیا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ،" ایک حضرت خفا ہوئے۔ "یہ حرامی اب تک سمجھتے ہیں کہ ہم انھیں
کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔"

"ارے میاں قصور ان کا نہیں،" دوسرے صاحب نے فیصلہ صادر کیا۔ "کیوں نہیں
اس کم بخت عورت نے ایسی ذلیل خیرات کو نفرت سے ٹھکرا دیا؟"

"اللہ اللہ آزادی تو ملی، لیکن غلامی کا چسکا نہ گیا۔"

"جائے کیسے میرے بھائی، جائے کیسے؟ جب ایسے آقاؤں کی جوتیوں کے
صدقے مفت کی گوشت روٹی ملے تو آزادی کی محنت کا بار کون اُٹھائے؟"

"اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!"

پہلے والے بزرگ نے رقّت سے الاپا۔

دوسرے حضرت نے بھی آزادی اور خودی کی عظمت میں کچھ مصرعے ارشاد فرمائے۔

جب دلشاد چار آنے کے گوشت، تین آنے کی روٹی اور دو آنے کی چائے سے اپنے
دوزخِ شکم کو ایندھن دے چکی تو وہ دونوں بزرگ جنبش فرما کر اس کے پاس آئے۔

"اے عورت کیا تم مہاجر ہو" ایک نے خشمگیں انداز سے پوچھا، جیسے زمانہ سلف کا قاضی کسی زانیہ عورت سے خطاب کر رہا ہو۔

"جی نہیں، میرا نام دلشاد ہے۔"

"ارے ہوگا، لاحول ولاقوۃ۔ ہم پوچھتے ہیں تم کہاں سے آئی ہو؛ کہاں جاؤگی اور یہاں پر تمھارا کیا کام ہے؟" دوسرے حضرت نے مہارنی کی۔

اے کاش دلشاد کو معلوم ہوتا کہ اس کی منزلِ مقصود کا نشان ——— کس شاہراہ پر ملے گا۔ اس کے تخیّل میں تو مغرب کی ساری کائنات اس کی منزل تھی۔ وہ تو ایک ایسی وسیع برادری میں شامل ہونے والی تھی، جس میں اسے سارے اپنے ہی اپنے نظر آتے ہوں۔ لیکن یہاں کی اینٹ، اینٹ اُس سے پوچھتی تھی کہ تم کون ہو؟ تم کیا ہو؟ تمھاری جیب میں پیسے ہیں ——؟ تمھارے جسم میں تازگی ہے؟ ———————

"تم مہاجر ہو" ایک بزرگ نے فتویٰ دیا۔ "تم مہاجر خانے چلی جاؤ۔"

"آزاد قوم کی بیٹیاں بھیک کے ٹکڑوں پر نہیں پلتیں، ہاں۔"

"تم کوئی بچّہ نہیں ہو۔ تمھیں خود شرم آنی چاہیے۔"

دلشاد دیر تک بیٹھی سوچتی رہی کہ شاید وہ بزرگ مہاجر نام کی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ جو کوئی گناہ کبیرہ سرزد کرکے گھر سے بھاگ گئی تھی۔ لیکن شام تک بہت سے لوگوں نے اُسے ہی پکارا اور سب نے اُسے مہاجر خانے میں چلے جانے کی تلقین کی۔

مہاجر خانہ ——————— مسافر خانہ کے وزن پر۔ ایک دفعہ جب دلشاد اپنے ابا کے ساتھ شہر گئی تھی تو وہ دونوں حاجی موسیٰ کے مسافر خانے میں ٹھہرے تھے ——— مسافر خانے میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں ایک بھٹیارن اوپلوں کی آگ پر ماش کی دال پکا رہی تھی جب دلشاد اس کے پاس چٹائی پر کھانا کھانے بیٹھی، تو بھٹیارن نے

بہت سا گھی پیاز کے ساتھ بگھار کر اُس کی دال میں ڈالا اور گرم گرم روٹیوں پر تازہ مکھن رکھ کر کھانے کو دیا۔ رات کو جب ملّا علی بخش عشا کی نماز پڑھنے لگا، تو بھٹیارن دلشاد کی چارپائی کے ساتھ اپنی چارپائی لگا کے لیٹ گئی اور دیر تک اسے مزیدار کہانیاں سناتی رہی۔ کبھی سات بیٹوں والے راجہ کا قِصّہ، کبھی پریوں کی بادشاہ زادی کا افسانہ۔ کبھی اپنے بچپن کی جیون کہانی بھٹیارن کئی دفعہ روئی، کئی دفعہ ہنسی۔ اور آج تک جب دلشاد شہر کی بارونق سڑکوں کا تخیّل باندھتی، تو اس کے پردۂ خیال پر حاجی موسیٰ کی سرائے کا عکس اُبھر آتا اور اس بھٹیارن کی تصویر بھی جو کبھی روتی تھی، کبھی ہنستی تھی، اور کبھی دلشاد کو گرم گرم چپاتیوں پر مکھن کے پیڑے رکھ کر کھانے کو دیتی تھی۔

مہاجر خانہ ——— شاید مسافر خانہ کا بگڑا ہوا نام ہو، جیسے گاؤں والے ہسپتال کو ڈاک خانہ کہتے ہیں۔ شاید شہر والے مسافر خانہ کو مہاجر خانہ کہتے ہوں ——— لیکن اس کو اپنا نیا نام کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ مہاجر بھی کوئی نام سا نام ہے بھلا؟ دلشاد تو بڑا رسیلا نام تھا۔ اس نام کے ساتھ ملّا علی بخش کی یاد وابستہ تھی جس نے قرآن شریف سے فال نکال کر اُسے یہ نام دیا تھا۔ اسی ایک نام میں رحیم خاں کا افسانہ محبت بھی منظوم تھا۔ وہ دلشاد کے ساتھ آباد، بیداد، صیاد کے قافیے باندھ کر بڑے رس بھرے دوہے گایا کرتا تھا۔

مہاجر خانہ ——— جب وہ مہاجر خانے پہنچی تو لاہور کے شالوں پر رات کے گیسو پھیل رہے تھے۔ مہاجر خانے کا افسر ایک چھولداری میں رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد دلشاد کی باری آئی۔

"نام؟" افسر نے طوطے کی طرح رٹا ہوا سوال دُہرایا۔

"دلشاد"

"عمر؟"

"بیس سال"

"باپ کا نام؟"

"ملّا علی بخش"

"زندہ ہے یا مر گیا؟"

"مار ڈالا گیا"

"گاؤں؟"

"چمکور"

"ضلع؟"

"انبالہ"

"شادی شدہ؟"

"جی نہیں"

مہاجر خانے کے افسر نے قلم روکا اور خشمگیں نگاہوں سے دلشاد کو گھورا۔"یہ لڑکی کس کی ہے؟"

"جی یہ میری لڑکی ہے" دلشاد ہکلانے لگی۔"میری شادی ہوگئی ہے جی، میں بھول گئی جی۔"

افسر کا قلم مشین کی طرح پھر دوات کی طرف گھوم گیا۔

"سوچ کے بولو، خاوند کا نام؟"

"رحیم خاں"

"زندہ ہے یا مر گیا؟"

"جی ——— پتہ نہیں۔ خدا کرے زندہ ہو۔ خدا کرے میری عمر بھی اسے لگ جائے جی ———"

مہاجر خانے کا رقبہ کافی وسیع تھا۔ کوئی آٹھ سو فٹ لمبا، پانچ سو فٹ چوڑا۔ ایک کھلا میدان۔ جس کے چاروں طرف کانٹوں والی تار کا احاطہ باندھا ہوا تھا۔ چھت کے لیے آسمان کا لاجوردی سائبان تھا روشنی کے لیے ماہتاب کی قندیل اور تاروں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ تھے۔ ایک کونے میں باورچی خانہ تھا۔ زمین میں کھودے ہوئے عمیق چولہوں پر دال اور گوشت کی بڑی بڑی دیگیں پک رہی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں چولہوں کی آگ دیگوں کے گرداگرد یوں بھڑکتی تھی، جیسے چتاؤں کے شعلوں میں دیوتاؤں کے لاشے جل رہے ہوں۔ آگ کی روشنی میں مہاجر خانے کا وسیع میدان نکھر آیا تھا جس طرح شفق شام میں نکھرے ہوئے ابر پاروں کی سُرخی کسی قبرستان پر غبارِ خون کی طرح چھا جائے۔ ساری فضا میں ایک غمناک سا ٹھہراؤ تھا۔ ایک ہلکا سا، ایک غیر محسوس سا ارتعاش جس میں لاکھوں سینوں کے کچلے ہوئے ارمان اور ٹوٹے دلوں کی معصوم دھڑکنیں کپکپا رہی تھیں، تھرتھرا رہی تھیں؛ اور ہر لحظہ یہ ڈر لگتا تھا کہ کسی وقت سکون و جمود کا یہ مصنوعی طلسم یکایک ٹوٹ جائے گا اور ایک زبردست طوفان، ایک بے پناہ زلزلہ، ایک ہولناک چنگھاڑ زمین و آسمان کے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دے گی۔

دلشاد اپنی بچی کو سینے سے لگائے قدم پھونک پھونک کر چلتی تھی۔ جس طرح قبرستان میں بچا بچا کر پاؤں رکھا جاتا ہے کہ کہیں کسی مقدس مزار کو ٹھوکر نہ لگ جائے۔ کچھ مہاجروں نے بانسوں پہ چادریں تان کر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا لی ہیں۔ کچھ مہاجر کچی قبروں کی طرح یوں ہی آسمان تلے بیٹھے ہوئے تھے ——— آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے ——— کسی کے پاس چادر تھی، کسی کے پاس کمبل، کسی کے پاس لحاف، دلشاد کے پاس نہ چادر تھی، نہ کمبل تھا، نہ لحاف۔ وہ خود ایک چیتھڑا تھی۔ ایک بوسیدہ سا، ایک فرسودہ سا مکڑا، جو اس کے لباسِ دوشیزگی کی یاد میں باقی رہ گیا تھا ——— مہاجر خانے میں ایسے سینکڑوں چیتھڑے بکھرے پڑے تھے۔ سب کے دل میں اُمید کی لو لگی ہوئی تھی کہ اب وہ اپنی

پیاری سرزمین پر آگئے ہیں۔ اب اس ارضِ مقدس کی خاک ان کے گلتے ہُوئے ناسوروں پر مرہم بن کر لگ جائے گی۔ اب یہاں کا متبرک پانی اُن کے رِستے ہُوئے زخموں کو دھو ڈالے گا۔ اب یہاں کے سُورج اور چاند کی تنویریں ان کے چاک دامنوں کو رفو کر دیں گی۔

ایک خالی سی جگہ دیکھ کر دلشاد ٹھہر گئی۔ کچھ دُور آگے ایک کہنہ سال ضعیف آدمی ڈیرہ ڈالے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ دو بچے تھے، ایک آٹھ دس سال کا لڑکا محمود، ایک گیارہ بارہ برس کی لڑکی زبیدہ، وہ تینوں ایک مٹی کے پیالے پر جُھکے ہُوئے روٹی کھا رہے تھے۔ محمود پوچھتا تھا کہ دادا آج سالن میں بوٹی کیوں نہیں؟ زبیدہ اپنے دادا کی وکالت کرتی تھی اور کہتی تھی کہ ہر روز گوشت نہیں کھایا کرتے، اس سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے، دانتوں کو کیڑا لگ جاتا ہے —— لیکن محمُود مچل رہا تھا۔ دادا اسے چمکارتا تھا۔ زبیدہ اُسے ڈانٹتی تھی۔ ”کیا مَیں تجھے اپنی بوٹیاں کاٹ کر دے دوں۔“ وہ چھوٹی سی بہن اپنے چھوٹے سے بھائی کو بزرگوں کی طرح ڈانٹتی تھی اور دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مختصر سے خاندان کا نگہبان دادا نہیں، زبیدہ ہے۔ اس لڑکی کا شعور اس قدر حساس اور بیدار تھا کہ وہ بیک وقت ایک ننّھی سی بہن، ایک ننھی سی بیٹی، ایک ننھی سی ماں کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

”یہیں بیٹھ جاؤ بیٹی۔ تمہارے ساتھ کوئی اور ہے؟“ بُڈھے دادا نے دلشاد سے پوچھا۔

”جی نہیں —— میرے ساتھ اور کوئی نہیں۔“

”جاؤ روٹی لے آؤ باورچی خانے سے۔ تمہارے پاس کوئی پیالہ ہے؟“

”جی نہیں۔ میرے پاس کوئی برتن نہیں۔“

دادا نے اپنا ایک خالی پیالہ اُسے دے دیا۔

”پالا بھی بہت ہے بیٹی۔ تمہارے پاس کوئی بستر ہے؟“

”جی نہیں، میرے پاس کوئی بستر بھی نہیں۔“

دادا نے اس ویران ہستی پر ہمدردی کی ایک بھرپُور نگاہ ڈالی۔ وہ بھی بالکل اسی حالت میں یہاں آیا تھا۔

”باورچی خانے کے پاس کپڑوں کا دفتر ہے۔ کمبل مانگ لینا وہاں سے۔“ پھر دادا نے ستاروں کو دیکھ کر وقت کا حساب لگایا۔ ”نو بج رہے ہیں۔ شاید سٹور بابو جاگتا ہو۔“

باورچی نے دلشاد کو دو روٹیاں اور پیالہ بھر دال دے دی۔ کپڑوں کے دفتر میں ایک مدھم سی لالٹین جل رہی تھی۔ خیمے میں رضائیوں کے انبار لگے ہُوئے تھے۔ سُرخ سُرخ، بھورے بھورے، کالے کالے کمبلوں کی تہوں پہ تہیں جمی ہُوئی تھیں۔ ایک کونے میں گرم کپڑوں کے ڈھیر تھے۔ اونی سوئٹر پٹّو کے کوٹ، گرم چادریں —— سٹور بابو سُرخ و سفید چھینٹ کی رضائی اوڑھے چارپائی پہ لیٹا ہُوا اقبالؔ کا شکوہ گا رہا تھا۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مُسلمانوں پر

جب اُس نے دلشاد کو خیمے کے دروازے میں کھڑا ہُوا پایا تو اس کے ترنم کی لے سُست پڑ گئی اور اُس نے نہایت خشمگیں انداز سے دلشاد کو گھورا۔

”دفتر بند ہے جی اس وقت۔ صبح آٹھ بجے آنا۔“

”ہمارے پاس کوئی کپڑا نہیں ہے۔ ہم پالے سے مر جائیں گے۔“

”کوئی نہیں مرتے۔ صبح آٹھ بجے آنا، ہاں۔ دفتر بند ہے اس وقت۔“

دلشاد نے ایک بار پھر التجا کی۔ سٹور بابو جھنجھلا گیا۔

”مَیں کہتا ہُوں چلی جاؤ سیدھی طرح، مَیں بھی آخر انسان ہُوں۔ مشین نہیں ہُوں، ہاں صبح آٹھ بجے آنا۔“ اور پھر وہ اپنے نرم و گرم لحاف میں سکڑ کر شکوہ گانے لگا ——

آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغ رُخ زیبا لے کر

جُوں جُوں رات بھیگتی گئی، سردی میں اضافہ ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ یُوں محسوس ہونے لگا جیسے ساری کائنات یخ بستہ ہو گئی ہو۔ سرد ہَوا کے جھونکے تیر و نشتر کی طرح بدن میں لگتے تھے اور زمین کی نمی زہر آلود کانٹوں کی طرح جسم میں چبھتی تھی۔ دادا کے پاس ایک کمبل تھا۔ اس نے اسے آدھا نیچے بچھا کر محمود اور زبیدہ کو سلا دیا تھا اور آدھا کمبل اُن کے اوپر ڈال دیا تھا۔ وہ خود ایک پتلی سی چادر اوڑھے زمین پر لیٹا ہُوا کروٹیں بدل رہا تھا۔ دلشاد کے دانت کٹ کٹ بج رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو اُونی کپڑے میں لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھی تھی۔ کبھی وہ لیٹ جاتی تھی کبھی اُٹھ بیٹھتی تھی ــــ کبھی کھڑی ہو کر گھومنے لگتی تھی۔ لیکن ہر کروٹ، ہر پہلو سردی کا اثر سانپ کے زہر کی طرح اس کی ہڈیوں میں سرسراتا ہُوا بڑھ رہا تھا اور اسے ڈر لگتا تھا کہ شاید اگلے لمحے وہ برف کے ٹکڑے کی طرح جم کر گر جائے گی۔

کچھ دُور آگے ایک جوان عورت اپنے جسم کی گرمی ہر ممکن طریقے سے اپنی چار سالہ لڑکی کے جسم میں منتقل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کے پاس بھی نہ کمبل تھا، نہ لحاف، نہ چادر، لڑکی کا سانس اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اس کے سینے میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ جیسے بہت دُور، افقی لکیر سے پرے، اونٹوں کا ایک کارواں کسی جنّتِ گم گشتہ کی تلاش میں چلا جا رہا ہو، چلا جا رہا ہو، رواں رواں، دواں دواں...... جیسے جیسے سردی بڑھتی گئی، لڑکی کے سینے کی گھنٹیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ اس کے سانس میں ایک زبردست تناؤ آ گیا جیسے زندگی اور موت کے فرشتے اس کے سانس کی لڑی تھام کر آپس میں رسہ کشی کر رہے ہوں۔

اس کی ماں گھبرا گئی۔ بے بس ہو گئی، لاچار ہو گئی۔ اس نے کھڑے ہو کر گرد و پیش کا

جائزہ لیا۔ زمین پر اندھیرے کا سیاہ کفن چڑھا ہُوا تھا۔ کبھی کبھی چاند بھی اپنے لحافوں کی اوٹ سے جھانک کر دیکھ لیتا تھا۔ چاروں طرف سکوت پا کر وہ عورت سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے چوروں کی طرح دزدیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ہولے ہولے جھجکتے ہُوئے، شرماتے شرماتے اس نے اپنے کپڑے کھول کر اپنی ٹھٹھری ہُوئی بیمار بچّی کو ان میں لپیٹ لیا۔ اندھیرے میں ایک بجلی سی لہرائی اور اس جوان عورت کا برہنہ جسم کائنات کے ذرّے ذرّے کو للکارنے لگا کہ دیکھو دیکھو یہ لاجواب ساعت بیت نہ جائے۔ تم نے ارض و سما کے بہت سے راز دیکھے ہوں گے۔ لیکن تم اس ماں کے برہنہ جسم کو نہ بھول سکو گے جس کے کپڑوں میں اس کی مرتی ہُوئی بیٹی لپٹی پڑی ہو اور بڑا سخت پالا پڑ رہا ہو اور سٹور میں گرم کمبل اور لحافوں کے ڈھیر ہوں۔ اور سٹور بابو رضائی میں لپٹا ہُوا شکوہ گا رہا ہو اور ــــــــ عورت کا عریاں جسم ایک غلیظ گالی بن کر چاروں طرف چھا گیا۔ رات کی ظلمت میں روسیاہی کی کالک اور بھی زیادہ گہری ہو گئی۔ آسمان پر جو ستارے ٹمٹما رہے تھے آنکھیں موند کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ چاند بھی اپنے لحافوں کے بیچ سے جھانک کر یہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ ایک گھنگھور گھٹا جو آسمان پر بے پروائی سے بکھری ہُوئی تھی، سمٹ سمٹ کر اکٹھی ہو گئی۔ اور بادلوں کی پلکوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔

ٹپ ٹپ ٹپ ــــــ ٹپ ٹپ ٹپ ــــــ بوندیں برس رہی تھیں۔ ٹھٹھری ہُوئی ہَوا کی سَن سَن سسکیوں کی طرح آہیں بھر رہی تھیں۔ مہاجر خانے کے میدان میں زندگی کی ایک کمزور سی لہر جاگی، کچھ بچّے روئے، کچھ عورتوں نے شور مچایا، کچھ مردوں نے ڈانٹ بتائی اور پھر ایک سناٹا چھا گیا۔

مینہ کی بوندیں دلشاد کے بدن میں بندوق کے چھرّوں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔ اسے یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے امریک سنگھ، ترلوک سنگھ، سورمکھ سنگھ، دربار سنگھ

کی کرپانیں اس کے جسم کو چھید رہی ہیں۔ بارش کا پانی فلالین کے گرم ٹکڑے میں بھی نفوذ کرتا گیا اور اس میں لپٹی ہوئی ننھی سی جان سردی سے کپکپانے لگی۔ دلشاد نے سوچا کہ اگر وہ دادا سے پوچھ کر اپنی لڑکی کو محمود اور زبیدہ کے کمبل میں لٹا دے تو شاید اس غریب کی جان کو کچھ سہارا مل جائے۔ اس نے دادا کے گھٹنے کو ہلایا، وہ اپنی میلی سی چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ دلشاد نے اُسے شانوں سے ہلایا، بانہوں سے ہلایا۔ گردن سے جھنجھوڑا، ہاتھ کھینچے، لیکن دادا کا خاکی جسم سردی اور گرمی کے احساس سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ زندگی کا خون اس کی رگوں میں جم کے رُک گیا تھا۔ اور اس کی ہڈیاں سردی سے اکڑ کر لوہے کی سلاخوں کی طرح تن گئی تھیں۔

جب صبح صادق کی پو پھٹی تو مہاجر خانے کے میدان میں ایک مرمریں مجسمہ چاندی کی طرح جھلملایا۔ یہ اس جوان عورت کا برہنہ جسم تھا۔ جس نے اپنے کپڑوں میں اپنی مرتی ہوئی بچی کو لپیٹ لیا تھا۔ اس کے بے جان سینے سے اس کی بچی کی لاش یوں چمٹی ہوئی تھی جیسے ابھی ابھی دودھ پینے لگی ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے فن کار نے مرمر کو تراش کر یہ خوبصورت بُت بنائے ہیں۔ عورت کے کسے ہوئے دودھیا بدن پر بارش کے قطرے موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اس کی گھنی زلفیں کالے ناگوں کی طرح بکھری پڑی تھیں۔ اس کی نیم باز آنکھوں میں پانی کی ایک تہ سی جمی ہوئی تھی، جیسے اُس کے خون کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی منجمد ہو کے رہ گئے ہوں۔

مہاجر خانے کے کچھ مہتر کمبلوں کا پلندا اٹھا کر لے آئے۔ ایک کمبل انھوں نے دادا پر ڈال دیا۔ دوسرا عورت کے ننگے بدن پر، تیسرا اس کی بچی پر چوتھا —— اور اسی طرح وہ میدان میں بکھری ہوئی لاشوں پر نرم نرم کمبلوں کے کفن ڈالتے گئے جو لوگ زندہ تھے وہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے مردہ ساتھیوں کی طرف دیکھتے تھے اور رشک کرتے تھے کہ اگر موت کے تصور میں ایک اَن دیکھی اَن جانی اَن سمجھی حقیقت کا خوف نہ ہوتا۔ تو وہ سب

برضا و رغبت وہیں مر جاتے تاکہ مہاجر خانے کے مہتر اِن پر بھی اُونی کمبل ڈالتے جائیں۔ اور ان کے کپکپاتے ہوئے گوشت اور ٹھٹھرتی ہوئی ہڈیوں کو ذرا سا سکون، ذرا سی گرمی، ذرا سا آرام میسّر آئے۔

محمود مچل رہا تھا کہ دادا کو وہ لوگ اٹھا کر کہاں لے گئے؟ زبیدہ اُسے سمجھاتی تھی کہ دادا، ابّا اور امّی کو بلانے گئے ہیں —— وہ کب آئیں گے؟ —— وہ بہت جلد آجائیں گے، میرے محمود، وہ تو بس آتے ہی ہوں گے۔ ابّا اور امّی کہاں گئے ہیں؟ وہ تھوڑی دیر کے لیے اللہ میاں سے ملنے گئے ہیں۔ وہ اس کے دربار سے تمھارے لیے عمدہ عمدہ کھلونے لائیں گے۔ شیشے کا لٹو، ربڑ کی گیند، چابی والی موٹر، نئے بوٹ، تلّے دار ٹوپی —— محمود کا تخیّل طرح طرح کے سوال ایجاد کرتا تھا۔ زبیدہ طرح طرح کے جواب گھڑ گڑ کر اسے ٹالتی تھی اور جب کبھی محمود ادھر اُدھر کھیل میں لگ جاتا تو وہ نظر بچا کر منہ چھپا کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔

مہاجر خانے کی مشین بائیسکوپ کی طرح چل رہی تھی۔ صبح سے شام تک اس کے پردے پر بھانت بھانت کے سین آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

بڑے بڑے دبدبے والے رئیس اور نواب آتے تھے۔ اونچی اونچی کرسیوں والے حکّام آتے تھے۔ سرسراتے ہوئے ریشم و کمخواب میں ملبوس کلیوں کی طرح کھلے ہوئے حسن میں سرشار گلاب اور چنبیلی کے عطر میں مہکی ہوئی بیگمات آتی تھیں وہ سب بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے تھے۔ عورتوں کے پاس کھڑے ہو کر ان کی اشک شوئی کرتے تھے۔ بوڑھوں اور جوانوں کی پیٹھ ٹھونک کر اُن کی ٹوٹی ہوئی کمر کو سہارا دیتے تھے اور پھر سبکسار موٹریں انھیں مہاجر خانہ سے واپس لے جاتی تھیں۔ کوئی مٹھائی لاتا تھا، کوئی کپڑے

بانٹتا تھا، کوئی پلاؤ اور قورمے کی دیگیں تقسیم کرتا تھا اور جب کوئی اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا تو اس کے چہرے پر فخر و مسرت کی سُرخی پھیل جاتی اور وہ دل ہی دل میں اپنے رحمان اور رحیم کا شکریہ ادا کرتا کہ اس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ایسے سامان پیدا کر دیے جن کے طفیل اس ناچیز کو بھی مقدور بھر خیرات کرنے کا موقع نصیب ہُوا۔ دلشاد سوچتی تھی کہ جب کوئی جوان مرد محمود اور زبیدہ کا قصہ سنے گا تو سٹور بابو کو کان سے پکڑ کر گولی سے اڑا دے گا کہ اس نے اس کڑاکے کی سردی میں بھی دادا کو صرف ایک ہی کمبل دیا۔ وہ ڈرتی تھی کہ جب کوئی دبدبے والے، طنطنے والے بلند اقبال لوگ اس کی اپنی رام کہانی سنیں گے تو ان کا خون کھول اُٹھے گا۔ ان کی غیرت کو شدید چوٹ لگے گی۔ اور وہ اپنی بندوقیں اٹھا کر امریک سنگھ، ترلوک سنگھ، کرتار سنگھ، دربار سنگھ کی تلاش میں چل نکلیں گے ——— لیکن سننے والے سُنتے گئے، سنانے والے سناتے گئے دن میں مٹھائی اور پلاؤ بٹتا گیا رات کو زمستانی ہَوا کی شمشیر اپنے وار کرتی گئی اور مہاجر خانہ کا بائیسکوپ بدستور چلتا گیا۔ ایک سین کے بعد دوسرا سین، دوسرے سین کے بعد تیسرا سین ——— نہ آغاز نہ انجام، ایک مسلسل اور پیچیدہ نظام ترحم کہ جس میں انسان، انسان کا رازق بننے کے لیے بے قرار ہو، بے چین ہو اور اس بازی میں دوسروں پر سبقت لے جانے کے لیے ہر قسم کا داؤ ہر قسم کا پیچ کھیلنے پر تُلا ہُوا ہو۔

ایک صاحب بڑے مخیّر تھے۔ بدن پر خوشنما سوٹ، سر پر ترچھی ٹوپی آنکھوں پر سونے کے فریم والی سبز عینک، اگلے دانتوں میں سنہری کیلیں، منہ میں پائپ، انگلیوں میں لعل اور یاقوت کی بیش بہا انگوٹھیاں ——— وہ گھنٹوں مہاجر خانہ میں گھومتے تھے۔ ایک ایک کی داستان سنتے تھے۔ کسی کو پیسے دیتے تھے۔ کسی کو مٹھائی کی گولیاں۔ کسی کو چاکلیٹ ——— دلشاد پر بھی ان کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ ایک روز وہ اس کی بچی کے لیے سُرخ اُون کا دیدہ زیب سوئٹر لائے۔ دوسرے روز انھوں نے رحیم خاں کی تلاش کرنے کا

وعدہ فرمایا اور کچھ دنوں کے بعد وہ دلشاد کے لیے ایک جانفزا عید کا پیغام لے کر آئے کہ رحیم خاں کا پتہ مل گیا ہے۔ بیچارا بے حد کمزور ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور، لیکن دلشاد کی یاد کے سہارے وہ ابھی تک بارِ زیست اُٹھائے بیٹھا ہے۔ دلشاد کی نظر میں دُنیا گلنار ہو گئی۔ مہاجر خانے کی زمین پر پھول ہی پھول اُگ آئے۔ اس کے بدن میں سلگنے والا زہر کافور کی طرح مشکبار ہو گیا اور وہ اپنے دھڑکتے ہُوئے سینے میں ارمانوں کا بے پناہ ہجوم چھپائے مسٹر مصطفٰے خاں سیمابی کی موٹر میں آ بیٹھی۔ کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ لاہور کی سڑکیں رنگین سانپوں کی طرح لہرا لہرا کر گزر رہی تھیں۔ یہ باغ جناح ہے؛ یہ گلستانِ فاطمہ کی چار دیواری ہے۔ یہ ملکہ معظمہ کا بت ہے۔ یہ مال روڈ کے رنگین ریسٹوران ہیں۔ یہ نیلا گنبد کا چوک ہے۔ اس گلی میں انارکلی کا مقبرہ ہے۔ یہ گرجا ہے، وہ مسجد ہے۔ . . . یہ مصطفٰے خاں سیمابی کا مکلّف بنگلہ ہے۔ نوکروں کے کمرے میں گراموفون بج رہا ہے۔

آج کر لے جی بھر کے سنگار، تو ہے جانا ہے
آج کر لے جی بھر کے سنگار،

دلشاد کا دل دھک دھک بج رہا تھا۔ اس دھک دھک میں ایک انوکھے سُرور کا ترنم تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے سوچ رہی تھی کہ شاید اس زمین پر رحیم خاں کے قدم پڑے ہوں۔ شاید اس بنگلہ کی ہَوا میں اس کی دلآویز سانس بسی ہُوئی ہو ——— دلشاد کی نظرِ عقیدت میں بنگلے کی زمین کا ذرہ ذرہ مکہ اور مدینہ کی خاک بن گیا۔ بنگلہ کی اینٹ اینٹ پر مسجدوں کے مقدس منارے تعمیر ہو گئے ——— ایک نوکر نے اسے ایک پلیٹ میں پلاؤ، ایک میں پالک اور گوشت، ایک میں مٹر اور قیمہ، ایک میں کیوڑے میں رَچائی ہُوئی فرنی لا کر دی۔ معلوم نہیں وہ کیا کھا گئی اور کب کھا گئی ——— وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔ اس کی رُوح اپنے رحیم خاں کے استقبال کے لیے سراپا انتظار بنی ہُوئی تھی لیکن اس کے جسم کو ابھی تک کتے چھوڑ رہے تھے ——— مصطفٰے خاں سیمابی ڈریسنگ

گاؤن پہنے اس کے سامنے بجّو کے گدھ کی طرح منڈلا رہا تھا۔ میز پر سکاچ وسکی
کی بوتل جگمگا رہی تھی۔ وہ اپنی بانہیں پھیلا پھیلا کر کہتا تھا، کہ میری جان، آکر میرے
سینے سے لگ جاؤ۔ تم بڑی مظلوم ہو —— تم بڑی غریب ہو لیکن میں ایک امیر
انسان ہوں میں کچھ روز کے لیے تمھیں ملکہ بنا کے رکھوں گا۔ تمھارا رحیم خاں معلوم
نہیں کہاں کھو گیا۔ شاید وہ کسی ویرانے میں مرا پڑا ہو۔ لیکن تم اس فرضی ہستی کی یاد میں
اپنی جوانی نہ گنواؤ! میری جان، آؤ۔ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ اب تم اپنے
آزاد وطن میں آگئی ہو —— اب تمھیں کسی بات کا ڈر نہیں۔ یہ ہمارا وطن
ہے —— یہ ہمارا آزاد وطن ہے۔ پاکستان زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!!
—— دلشاد کے گلے میں مُلّا علی بخش کی تسبیح لٹک رہی تھی جب
مصطفےٰ خاں سیمابی کی زبان لپک لپک کر تسبیح کے دانوں کو چومتی تو دلشاد
کو یہ محسوس ہوتا کہ ایک مسلمان بھائی سنگِ اسود کو بوسہ دے
رہا ہے ——،

دو چار دن میں جب مصطفےٰ خاں سیمابی نے اپنے حج کے ارکان
پورے کر لیے تو دلشاد پھر مہاجر خانے واپس آگئی۔ ننّھا محمود شیشے کا لٹو چلا رہا
تھا۔ اس نے تتلا تتلا کر، تالیاں بجا بجا کر دلشاد کو سمجھایا کہ زبیدہ باجی بھی موٹر
میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی تھی —— دادا میاں نے شیشے کا یہ لٹو
بھیجا ہے۔ یہ ربڑ کی گیند، یہ رنگ دار مٹھائی، آج وہ پھر موٹر میں بیٹھ کر دادا
میاں کے پاس گئی ہے۔ موٹر پوّں پوّں کرتی جا رہی ہے۔ اب وہ پھر
دادا میاں سے پیسے لائے گی۔ نئے نئے بوٹ لائے گی —— تلے دار
ٹوپی لائے گی ——،

لاہور، لاہور نہ تھا، مدینہ تھا۔ لاہور والے، لاہور والے نہ تھے۔

انصار تھے —— نہیں! وہ تو شاید انصارِ مدینہ سے بھی کچھ درجہ افضل تر
تھے۔ یہاں دلشاد کے لیے ہر روز ایک نیا رحیم خاں پیدا ہو جاتا تھا ——
زبیدہ کے لیے ہر روز ایک نیا دادا جنم لیتا تھا۔ بیٹیوں کے لیے، نئے نئے باپ
تھے —— بہنوں کے لیے نئے نئے بھائی —— جسم کا رشتہ جسم سے ملتا تھا،
خون کا رشتہ خون سے ——،

رَبُّ الْعَالَمِيْن

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

کراچی

دِلشاد نے کھڑکی سے مُنہ نِکال کر دیکھا۔ صدر کے اسٹیشن پر گہما گہمی تھی۔
ریفیوجی سپیشل کی مخلوق گاڑی سے نِکل نِکل کر پلیٹ فارم پر جمع ہو رہی تھی۔ سارا
اسٹیشن کچھا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ بادلوں کی طرح چھٹ گئی۔
پلیٹ فارم پر کچھ قلی، کچھ باہر جانے والے مسافر، اور کچھ ٹکٹ چیکر باقی رہ گئے۔
آن کی آن میں ریفیوجیوں کا جمِّ غفیر بے مایہ قطروں کی طرح کراچی کے محیطِ بے کراں
میں غرق ہو گیا، جیسے سمندر کی تیز و تند لہر ساحل کے خس و خاشاک کو اپنے تموّج میں بہا
لے جائے یا جیسے سُورج کی کرنیں شبنم کے موتیوں کو اپنے دامن میں چھپا لیں یا
جیسے شراب کا نشہ دِل کے گوشے میں لرزندہ اندیشوں کو اپنے خمار کی آغوش میں سلا
دے یا جیسے کسی گلتی ہُوئی، سڑتی ہُوئی لاش کا تعفن گلاب اور موتیے کی شمیم کو
اپنے سینے کے اندر جذب کر لے،

منوڑا آئی لینڈ تیز تیز قمقموں کی روشنی میں جگمگ کر رہا ہے ——— کلفٹن بیچ چودھویں رات کی چاندنی میں نہایا ہوا ہے۔ سمندر کی لہریں ساحل کو چھیڑ چھیڑ کر ایک مدہوش ساز رباب بجا رہی ہیں۔ لہروں کا پانی ریتیلے ٹیلوں سے ٹکرا کر فضا میں نقرئی فواروں کی طرح جھلملا رہا ہے۔ ہوا میں ایک نازک سی خنکی ایک نرم سی ملائمت ہے۔ زندگی کی ایک میٹھی سی تڑپ بیچ پر مخمور سانپوں کی طرح لہرا رہی ہے۔

چار جوان وسکی کے جام بھر کر سوڈا ملا رہے ہیں۔ "ہائے ہائے دِلّی" ایک نے سینے پر ہاتھ مار کے آہ بھری۔

"سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دِلّی یاد آتی ہے۔ ہائے ری دِلّی" دوسرے نے واویلا کیا۔

"کون جائے ذوق یہ دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر
ہائے دِلّی، تیری خاکِ پاک کی کشش

تیسرا رانوں پر تھپڑ مار مار کے ماتم کرنے لگا۔

چوتھا جوان سنجیدہ رہا۔ وہ وسکی کا جام ہونٹوں سے چپکائے مراقبے میں گیا ہوا تھا۔ جب اس کے ساتھیوں نے ذرا زور شور سے دِلّی کی نوحہ خوانی شروع کی، تو وہ چونکا ——— "ایں؟ یہ تو وہی سالی کراچی رہی۔ واللہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ چاوڑی بازار میں چہل پہل ہے۔ بی چاند جان کا بالاخانہ ہے اور وہ ساقی مہوش اپنی حنائی انگلیوں میں ساغر اٹھائے آ رہا ہے، لا رہا ہے، آ رہا ہے، لا رہا ہے ———"

ہائے ہائے دِلّی! ہائے ہائے دِلّی! ہائے بی چاند جان، وائے بی چاند جان۔

——— وہ چاروں ایک فصیح و بلیغ مرثیے کی دُھن میں کھو گئے اور ٹھنڈی ریت پر لوٹ لوٹ کر اپنی جنّت گم کردہ کا ماتم کرنے لگے۔

کچھ دُور پرے ایک مقطع و متشرع بزرگ پان چبا رہے تھے۔ ان کے آگے چند عقیدت مند دو زانو بیٹھے تھے۔

"دِلّی گئی، دِلّی والے گئے، سب کچھ گیا لیکن کچھ نہ گیا۔"

"پان لاؤ" بزرگ نے فرمایا۔

اُن کی خدمت میں پان پیش کیا گیا۔

"تمباکو تو اچھا ہے بھئی" ——— بزرگ نے رائے دی "یہ کہاں سے لائے ہو؟"

کسی نے عرض کیا، "۲۹ روپے سیر ہے، لکھنؤ سے منگوایا تھا۔"

"ہاں، تو مَیں کہہ رہا تھا کہ دِلّی گئی" بزرگ نے اپنی ٹوٹی ہوئی تان کو از سرِ نو پکڑا۔ "دِلّی والے گئے، کیوں؟ جانتے ہو بھلا کیوں؟"

عقیدت مند سوچنے لگے کہ کیوں؟ ان کے چہروں پر کیوں کی سوالیہ علامت ٹھپّہ بن کر لگ گئی۔

بزرگ نے خود ہی جواب دیا "وہ لال قلعہ۔ وہ جامع مسجد، وہ قطب مینار، وہ قبریں جن میں بزرگوں کی خاک دو بول دُعا سُننے کے لیے ترس رہی ہے۔ غالبؔ کا مزار، شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مرقدِ نور ——— سب چلے گئے۔ سب ہاتھوں سے نکل گئے۔ تم کہو گے اپنے نصیب، مَیں کہتا ہوں، اپنے اعمال، ہمارے اپنے ناگفتہ بہ اعمال، میں تم کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے؟ ———

——— پان لاؤ"

پان حاضر کیا گیا۔

"میں تم کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر"

"دھت تیرے کی" وسکی والی پارٹی کا ایک جوان اپنے ساتھی پر گرج رہا تھا۔

"چاند جان میری تھی، وہ مجھ پر عاشق تھی۔ وہ تیرے منہ پر تھوکتی بھی نہ تھی——ہاں——"

دوسرا جوان سوڈے کی بوتلیں اور خالی گلاس جمع کر کے ایک عملی سا جواب دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

ان کے باقی دو ساتھی ایک دوسرے کے سر پر اُلٹا کھڑے ہونے کی مشق فرما رہے تھے۔ ایک پارسی لڑکی ان کی حرکات پر قہقہے لگا کر فضا میں ایک لذیذ سا ترنم، ایک پیارا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اس نے نہانے کا رنگین لباس پہنا ہُوا تھا۔ اس بیدنگ کاسٹیوم میں اس کا چھریرا بدن قوس کی طرح تنا ہُوا تھا—— بزرگ فرمائے تھے—— پان لاؤ۔

چیف کورٹ اور اسمبلی ہال کے درمیان مہاتما گاندھی کا بت پہرے پر چوکس کھڑا ہے کہ کہیں انصاف اور سیاست ایک دوسرے کے قریب نہ آنے پائیں۔ دو سائیکل سوار ٹھہر کر اس کا جائزہ لینے لگے۔ ایک نے اس کی لاٹھی چھیننے کی کوشش کی، دوسرے نے اس کی عینک کو اڑانا چاہا۔ جب وہ دونوں اس کوشش میں ناکام ہُوئے تو ایک نے اپنی رومی ٹوپی اتار کر بُت کے سر پر رکھ دی اور وہ خوش خوش وہاں سے چل دیے کہ انھوں نے چپکے چپکے اس بُت کو مُسلمان کر لیا۔

ایک ہندو خاندان ہجرت کر رہا تھا۔ ان کی خوشنما کوٹھی کے سامنے چار اُونٹ گاڑیاں سامان سے لدی کھڑی ہیں۔ لوہے کے ٹرنک، چمڑے کے سوٹ کیس، لکڑی کی پیٹیاں—— سامان میں ایک طوطے کا پنجرہ بھی ہے۔ طوطا مٹر کی پھلیاں کھا رہا ہے۔ جب کوئی اس کے پاس سے گزرتا ہے، تو وہ نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف یُوں دیکھتا ہے گویا کہہ رہا ہو کہ لو سالو! مَیں بھی چلا—— اب مَیں دیکھوں

گا تم اپنا پاکستان کیسے بناتے ہو——؟

قصرِ بہ ہوٹل کی رقص گاہ میں آرکسٹرا بج رہا ہے۔ ہوٹل کے مینیجر نے سٹیج پر آ کے اعلان کیا کہ آج رات کی نصف آمدنی قائدِ اعظم ریلیف فنڈ میں دی جائے گی، لوگوں نے گرمجوشی سے تالیاں بجائیں۔

"میرا جی کراچی سے اُکتا گیا ہے" ایک دیدہ زیب بیگم نے شیری کا گلاس لبِ لعلین سے لگا کر کہا "چلو ڈیئر کچھ روز کے لیے بمبئی گھوم آئیں۔"

اس کا ساتھی شمپین پی رہا تھا "اب تو بمبئی بھی مرحوم ہو گئی بیگم—— سالی کانگرس اس ہیریں صغریٰ کو رائب خانہ بنانے پر تُلی ہُوئی ہے، نہ وسکی، نہ شیری، نہ جن نہ شمپین—— اب سُنتا ہُوں کہ ریس پر بھی بندش لگانے کی سازش ہو رہی ہے۔"

"ارے ہاں" بیگم کو ایکا ایکی یاد آیا "ابھی اگلے روز پروفیسر گھنشام کا خط آیا تھا۔ پرہیبشن کے ہاتھوں بے چارہ مجبور ہو گیا ہے۔ ایک کیس وسکی منگوائی ہے، کسی طرح بھجوا دو، ڈیئر۔"

ایک غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری دوسرے غیر ملکی سفیر کے سیکرٹری سے سرگوشی کر رہا تھا "مجھے کراچی میں دو چیزیں بہت پسند ہیں۔"

"مجھے تین" دوسرے نے کہا۔

"پارسی لڑکیاں، اور مسلمان عورتوں کے برقعے۔"

"مجھے بُرقعے والیاں بھی پسند ہیں!"

"واللہ بڑے کور مذاق ہو۔ ان مدقوق عورتوں کو کون چاہے گا بھلا؟"

"انھیں مَیں چاہتا ہُوں۔ یسوع مسیح کی قسم، مجھے یہ بیمار حُسن پسند ہے۔ پیلے پیلے

گالوں میں نیلی نیلی رگوں کی لکیریں، اس پر غازے کا غبار —— خزاں کے موسم میں گلاب کی پتیاں —— ہائے میں نے ایسا حسین امتزاج کہیں نہیں دیکھا —————— بوائے دو سوڈا دو وسکی۔"

"ایک ہی بات ہے تم پلاؤ یا میں پلاؤں —————— ہمارے دونوں ملکوں کا بلند نصب العین مشترک ہے۔ ہم اس اشتراک کو مستقل بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے —— تمہاری صحت کے لیے۔"

ایک مسلمان ایڈیٹر ہیمن سکوائش سے جی بہلا رہا تھا۔ موقع پا کر وہ شراب اور کپڑے کے ایک بڑے تاجر کو گھیر کر کھڑا ہو گیا

"میں نے سنا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد کراچی اور لاہور میں ولایتی شراب کی کھپت پہلے سے تگنی ہو گئی ہے؟" ایڈیٹر نے اپنے ایڈیٹوریل کے لیے مواد اکٹھا کرنا شروع کیا۔

"غلط" تاجر نے گرم جوشی سے تردید کی "بالکل غلط۔ آپ بھی کیا عجیب افواہیں لے اُڑتے ہیں۔ تگنی تو کیا اگر دگنی بھی ہو جاتے تو غنیمت ہے۔"

"افسوس" ایڈیٹر نے اصرار کیا "کیا یہ امر اس نئی اسلامی حکومت کے لیے شرمناک نہیں؟"

"پاکستان دُنیا کا پانچواں بڑا اور مُسلم ممالک میں سب سے بڑا ملک ہے" تاجر نے ایڈیٹر صاحب کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

"کیا یہ امر اس سب سے بڑے مُسلم ملک کے لیے شرمناک نہیں؟" ایڈیٹر صاحب برابر مُصر تھے۔

"قبلہ" تاجر نے وسکی کا لمبا سا گھونٹ بھر کر کہا "آپ ریاست بنا رہے ہیں۔ مسجد نہیں ——"

"وہ کالے کالے بُرقعے" دوسرے غیر ملکی سفیر کا سیکرٹری پہلے غیر ملکی سفیر کے سیکرٹری سے کہہ رہا تھا "سُرخ و سبز ریشم کے سرسراتے ہوئے نقاب، بُرقعوں کی اوٹ میں جھانکتے ہوئے گول گول، پیلے پیلے، لال لال چہرے، سڈول بانہیں۔ ریشم کی تہوں سے جھلکتے ہوئے مخروطی ہاتھ ———— کنواری مریم کی عصمت کی قسم، میں نے ایسے برقپارے کہیں نہیں دیکھے۔ جب میں انھیں الفنسٹن سٹریٹ کی دکانوں میں بجلیاں گراتے دیکھتا ہوں، تو میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ میں ان کے قدموں میں گر جاؤں اور اُن کے نازک اور سُبک پاؤں مجھے اپنی ٹھوکروں سے روندتے چلے جائیں، روندتے چلے جائیں" ——————

"بوائے دو پیگ وسکی اور سوڈا" پہلے نے آواز دی۔

"اس بار میری طرف سے۔ بوائے! دو سوڈا، دو وسکی" دوسرے نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے، تم پلاؤ، یا میں پلاؤں —— ہمارے بہادر ملکوں کا نصب العین ایک ہی ہے۔ ہم پاکستان کے خانہ بدوش مہاجرین کی یکساں مدد کریں گے۔"

"یہ دوّنی کھوٹی ہے، جی" بس کے کنڈکٹر نے کرختگی سے کہا —— "اسے بدل دو"

"یہ دوّنی میں نے نہیں بنائی" پنجابی پسنجر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "میں یہ دوّنی کوئی دِلّی یا لکھنؤ سے نہیں لایا۔ میں تمھیں ہرگز دوسری دوّنی نہ دوں گا"

کنڈکٹر نے بس روک دی "جب تک تم مجھے دوسری دوّنی نہ دو گے یہ بس آگے نہیں جائے گی"

کچھ پنجابیوں نے کنڈکٹر کو چند فصیح و بلیغ گالیاں دیں "سالے سندھی، مُفت

پاکستان مل گیا سالوں کو، ہم بھی دو دن میں مزاج ٹھکانے لگا دیں گے، ہاں"
کنڈکٹر اور ڈرائیور باہر نکل کر ایک طرف کھڑے ہو گئے "سالے پنجابی،
پٹ پٹا کر یہاں آئے تو سالوں کا دماغ ہی نہیں ملتا. سر پر ہی چڑھے آتے ہیں، سؤر
کے بچے، جیسے ان کی ماں کے خصم کا گھر ہے یہاں"
ایک ہندو راہ گیر یہ قصیدہ سن کر ٹھہر گیا اور داد کے طور پر اس نے کنڈکٹر
اور ڈرائیور کو ایک ایک بیڑی پیش کی۔
دو بنگالی یہ ہنگامہ دیکھ کر بس سے نیچے اتر آئے۔
"لارنس روڈ کتنی دُور ہے جی؟" ایک نے پوچھا۔
"یہی کوئی دو فرلانگ اور ہوگی" دوسرے نے اندازہ لگایا۔
"آؤ ٹہلتے ہی چلیں"
جب وہ دونوں بس سے ایک محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تو انھوں نے دوتی
والے حادثے پر جی کھول کر تبصرہ کیا "لڑنے دو سالے سندھیوں اور پنجابیوں کو، کہتے
ہیں پاکستان کی زبان اُردو ہوگی" چھی، گویا شرنو بنگلہ بھاشا ہماری قومی زبان
ہی نہیں ..... چھی ——"

صدر کے چوک میں ایک ایرانی ہوٹل والا، ایک چھابڑی والے پر گرج رہا تھا۔
"تم یہ گندے کیلے یہاں نہیں رکھ سکتے۔ میرے ہوٹل میں مکھیاں آتی ہیں ——
—— ہیں"
"ابے چل، ہوٹل کے بچے" چھابڑی والا اکڑ رہا تھا "یہ پٹڑی تیرے باوا
کی ہے؟"
ایرانی نژاد ہوٹل والے نے پاؤں کی ایک بھرپور ٹھوکر سے کیلوں کی چھابڑی اُلٹ

دی۔ چھابڑی والا لپک کر اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔
ایک کانسٹیبل نے آ کر چھابڑی والے کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ "سالے
حرامی کتنی بار کہا ہے، یہاں بکری مت کرو لیکن سنتے ہی نہیں حرامزادے چلو،
تھانے چلو"
چھابڑی والے نے گڑگڑا کر خوشامد کی، کہ داروغہ جی، میں اجمیر شریف سے آیا
ہوں۔ میرا گھر بار سب لٹ گیا ہے۔ میری اندھی بہن میرے ساتھ ہے۔ مجھے چھوڑ
دو۔ میں پھر یہاں چھابڑی نہیں لگاؤں گا۔
لیکن قانون، قانون ہے۔ قانون کی نظر میں نہ اجمیری کا امتیاز ہے نہ لاہوری کا۔
نہ اندھی بہن کی تمیز ہے۔ نہ آنکھوں والی کی۔ کانسٹیبل نے اپنا فرض منصبی بڑے
احسن طور پر انجام دیا اور چھابڑی والے کو آگے لگا کر تھانے لے گیا۔
—— جب تھانیدار نے اندھی بہن کی تفصیل سنی تو اُسے
کانسٹیبل کی نالائقی پر بڑا غصہ آیا کہ کیوں نہ وہ اس کی اندھی بہن کو بھی ساتھ ہی
لیتا آیا ——

"دو اور دو چار —— چار اور تین سات —— سات اور نو کے ہوتے؟"
چیلا رام دلال نے خوشی محمد دلال سے پوچھا۔
خوشی محمد دلال چائے سے مکھی نکال کر چمچہ چھٹک رہا تھا۔ ادھ موئی مکھی کو
فرش پر گرا کے اس نے چائے کا ایک لمبا سا گھونٹ بھرا۔
"سات اور نو سولہ" چیلا رام نے خود ہی حساب لگایا "میں نے کہا، استاد،
سیزن بُرا نہیں رہا"
خوشی محمد دلال نے اپنا لٹکا ہوا نچلا ہونٹ سمیٹ کر چائے کا ایک اور لمبا سا

گھونٹ لیا۔

"سچ پوچھو دوست تو بڑا کرارہ سیزن لگا تھا،" چیلارام کے گالوں کی کچوریاں خوشی سے پھول رہی تھیں "ایک سیزن میں سولہ چھوکریاں! رام قسم مَیں نے تو ایسا دھندا ساری عمر نہیں کیا تھا۔"

اطمینانِ قلب کے اظہار کے طور پر چیلارام نے چاند تارے والی جناح کیپ اتار کر اپنی گنجی چندیا کو زور زور سے سہلایا۔

خوشی محمد کا لٹکا ہوا نچلا ہونٹ اور بھی لٹک گیا۔ اور ردِ عمل کے طور پر اس نے چائے کا ایک طویل سا گھونٹ سڑاپ لیا۔

"تم سالے قسمت کے دھنی ہو" خوشی محمد منمنایا "چھوکری پر چھوکری اتارتے تھے۔ یہاں مشکل سے صرف تین ہاتھ آئیں۔"

"تین چھوکریاں! تھو!! چیلارام نے طنزاً ریسٹوران کے فرش پر بلغم کا ایک بڑا سا غلفہ تھوک دیا۔ "کالی کالی پوربنیں۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا تھو ——— میرے پاس بڑے انمول دانے تھے، یار .... گرم گرم، سخت سخت پنجابنیں، نازک لچک دار دِلّی والیاں اور پھر وہ پٹیالے والی جٹنی، ہائے ہائے، ہیرا تھی، خوشی محمد ہیرا!"

چیلارام نے ایک کھارا بسکٹ انگلیوں کے درمیان دبا کر توڑ ڈالا۔

"وہ سالا براؤن اسے پورٹ سعید لے گیا۔ کہتا تھا، بڑا کام دے گی وہاں۔ ——— مَیں نے کہا خوشی محمد، یہ پورٹ سعید کس طرف ہے؟"

"ہوگی کہیں"، خوشی محمد کا بیوپار ذرا مندا تھا "چائے منگواؤ اب تو کوئی سالی ریفیوجی ٹرین بھی نہیں آتی۔"

گرم چائے کے دوسرے کپ پر وہ دونوں پھر اپنے اپنے خیالوں کی دُنیا

میں کھو گئے۔ چیلارام دلال اپنے انمول دانوں کا حساب لگا رہا تھا جو اس کے اپنے ہاتھوں سے نکل کر روئے زمین کے مختلف حصّوں میں بکھرے ہُوئے تھے۔ قاہرہ ——— لندن ——— پورٹ سعید ——— نہ جانے اس کے بیش قیمت تحفے کس کس شبستان کی زینت بنے ہُوئے تھے کسی دمکدار آرام گاہ میں اس پٹیالے والی جٹنی کا جسم بھی ریشم اور کمخواب کے گاؤتکیے کی طرح سجا ہوا ہوگا ——— چیلارام کے دل میں عجیب عجیب قسم کی آرزوئیں سر اٹھا رہی تھیں۔ ایک بار اس کا جی چاہا، کہ وہ پَر لگا کر پورٹ سعید جا پہنچے اور پانچ سو ستر روپے کے نوٹ سالے براؤن کے منہ پر مار کے پٹیالے کی جٹنی کو واپس لے لے اور اس کے گٹھے ہُوئے مخملیں گاؤتکیے ایسے جسم کو بانہوں پر اٹھا کر بھاگ آئے۔ طوفانوں سے لڑتا ہُوا، سمندر کی لہروں سے ٹکراتا ہُوا، پہاڑوں کی چھاتی کو چیرتا ہُوا ———

خوشی محمد دلال کی دُنیا میں غم اور غصّے کا دھواں چھایا ہُوا تھا۔ پہلے تو یہ سالے ریفیوجی ہوائی جہازوں میں بھر کر لائے جاتے تھے۔ ٹرینوں پر ٹرینیں لدی آتی تھیں۔ ——— لیکن اب کچھ دنوں سے بازار سرد تھا۔ وہ ہر روز اخباروں میں نئی نئی خبریں پڑھتا تھا ——— دِلّی میں خون ——— کانپور میں خون ——— کلکتے میں خون ——— احمد آباد میں خون ——— اجمیر میں خون ——— لیکن اس سلسلے خون کے ریلے میں ایک ریفیوجی ٹرین بھی کراچی نہ پہنچتی تھی۔ خوشی محمد دلال کو اس بات کا سخت قلق تھا۔ پھر بھی اس نے کسی موہوم سی اُمید کا سہارا لے کر چھ پیسے کا خون کیا اور اخبار کی جلی سرخیوں پر للچائی ہُوئی نظر دوڑائی۔ اخبار بیچنے والا چھوکرا گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا "اب تو کشمیر میں بھی چھڑ گئی ——— جمّوں میں لاکھوں مُسلمانوں کا خون ہوگیا ——— اب تو ———"

خوشی محمد دلال نے ہمہ تن شوق ہو کر خبریں پڑھیں۔ کشمیر کی جنّت میں بھی دوزخ

کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے۔ زعفران کے کھیتوں پر آگ برس رہی تھی۔ پھُولوں کے دامن میں شرر جل رہے تھے۔ نسیم بہار کی جگہ ڈوگروں کی تلوار چل رہی تھی۔ ہزاروں مر گئے تھے، ہزاروں مر رہے تھے۔ ہزاروں مینڈکوں کی طرح چھپ چھپ کر، چوہوں کی طرح رینگ رینگ کر اس آتش کدۂ جہنم سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خوشی محمد نے چیلا رام کی ران پر زور سے ہاتھ مارا۔ "اب تو کشمیر میں بھی لگ گئی، ہیرے یار۔ میں نے کہا، چیلا رام، ذرا سُن لو"

چیلا رام پورٹ سعید کے تصور میں مگن تھا۔ "پھر تو سیب مہنگے ہو جائیں گے؟" اس نے بے توجہی سے پوچھا۔

لیکن خوشی محمد میں شاعری کی رُوح حلول کر آئی تھی۔ اس نے چٹخارے لے لے کر کشمیر کی نازک بدن، سیم تن عورتوں کا ذکر سُنایا۔ خوبصورت رنگین، گلعذار عورتیں —— —— جن کے گالوں میں سیب ہوتے ہیں۔ چھاتی پر ناشپاتیاں۔ ہونٹوں پر انگور کا رس۔ آنکھوں میں ڈل کی لہروں پر رقصندہ کنول۔ گلے میں پہاڑی جھرنوں کا سرود۔ انگ انگ میں گلاب اور موتیے کی رنگت۔ زعفران کی بھینی بھینی مہک ——،

چیلا رام دلال کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ وہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور خوشی محمد کے لیے اس نے چائے کا تیسرا کپ بھی منگوایا۔ پھر وہ سر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور کشمیر کے سیزن کی امید افزا باتوں میں کھو گئے ——،

ہَوا کے تھپیڑوں سے بادبان لہرایا۔ موجوں میں ایک ہلکا سا تلاطم اٹھا —— کشتی ڈگمگائی اور وہ سہم کر سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگ گئی۔

سیٹھ قائم علی دائم علی کی توند میں ہنسی کا جوار بھاٹا سا اُٹھا اور پان کی پیک جو کچھ عرصہ سے اُس کے منہ میں جمع ہو رہی تھی، بے اختیار بدر رو کے گندے پانی کی طرح نکلی۔

بوڑھا ملاح بیڑی سلگا کر مسکرایا "کشمیر سے آئی ہے سیٹھ، اندھی ہے، بولو، کس طرف چلوں؟ پیرس یا وینس؟"

سیٹھ قائم علی دائم علی کا ایک دفتر پیرس میں بھی تھا۔ یُوں بھی اس نے پیرس کے متعلق بڑی دلآویز باتیں سُن رکھی تھیں لیکن اس وقت وہ اس چھوٹی سی ڈگمگاتی ہُوئی کشتی میں اتنے لمبے سفر پر جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ چنانچہ جب ملاح نے اسے پیرس یا وینس چلنے کی دعوت دی تو وہ بوکھلا گیا۔

چالاک ملاح اس کی بوکھلاہٹ پر مُسکرایا "گھبراؤ نہیں سیٹھ، دُور نہیں لے جاؤں گا، ہا! کیا جگہ ہے پیرس بھی! دیکھو گے تو مر جاؤ گے، ہا"

کیماڑی کی بندرگاہ میں خاصی چہل پہل تھی۔ اتوار کی چھٹی منانے والے ہجوم ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کوئی منوڑا جا رہا تھا، کوئی سینڈز پٹ آئی لینڈ —— اور ایک جہاز بمبئی جانے کے لیے لنگر اٹھا رہا تھا۔ جہاز کے ڈیک پر سینکڑوں رنگین ساڑھیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ لوگ دُوربینیں آنکھوں سے لگائے کراچی کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے۔ جب جہاز روانہ ہُوا، تو کچھ لوگوں نے اپنے سروں سے جناح ٹوپیاں اتار کر سمندر میں پھینک دیں اور ہوا میں گھونسے لہرا لہرا کر "جے ہند" کا نعرہ لگایا۔

"کشمیر کی اندھی دوشیزہ سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگی ایک گہری سوچ میں ڈوبی ہُوئی تھی۔ جب لہروں کے تلاطم پر کشتی کا سینہ ڈگمگاتا تو اسے اپنا ہلکا پھلکا شکارا یاد آتا، جو اسی طرح ڈل اور وولر کی نازک لہروں پر تھر تھرایا کرتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے سمندر کا چلو بھر پانی پیا تو اُسے قے آ گئی —— اُف! کتنا کڑوا پانی تھا۔ ڈل کا پانی تو تازہ دودھ کی میٹھا تھا اور چشمہ شاہی کا پانی —— ہائے جیسے دودھ اور مکھن اور شہد کو برف میں لگا کر پیا جائے وہ چاہتی تھی کہ ایک بار اس کڑوی جھیل کو بھی دیکھے کہ اس کا پانی کالا ہے یا سُرخ؟ نیلا ہے یا سبزہ؟ لیکن ہائے اس کی آنکھیں!

ایک دن تھا کہ اس کی غلافی آنکھوں میں جھیل وولر کی لطیف نیلاہٹ اور کچے باداموں کی نازک راحت ہوا کرتی تھی لیکن اب ان کی جگہ گہرے گہرے زخم تھے۔ جیسے دو اندھے اور تاریک کنویں کسی دور دراز ویرانے میں کھوئے پڑے ہوں —— اب وہ اندھی تھی، بے بصر تھی، ایک بہادر ڈوگرے نے اپنی سنگین سے اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے طلسمی رنگ محل مسمار کر دیے تھے۔

ساحل کے ہنگامے سے دور، ایک کالے رنگ کا جہاز سمندر میں تنہا کھڑا تھا اس پر سرخ رنگ کے جلی حروف میں لکھا تھا کہ اس میں بارود ہے۔ جب اس کی کشتی پاس سے گزری تو سیٹھ قائم علی دائم علی نے جلدی سے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ معاً اُسے ڈر لگا کہ کہیں یہ بارود بھک سے اُڑ نہ جائے —— جب کشتی ذرا دُور نکل گئی تو سیٹھ قائم علی دائم علی نے پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی توند پر رکھ لیے۔

کشتی ایک چھوٹے سے جزیرے سے جا لگی۔ جزیرے میں چند ماہی گیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ ملّاح نے بتایا کہ اس عشرت کدے کا نام پیرس ہے۔ آس پاس اور بھی چند جزیرے تھے، ان کے ساحلوں پر بھی اِکّا دُکّا کشتیاں کھڑی تھیں۔ کہیں وینس تھا، کہیں نیپلز —— کہیں روم ——

ملّاح نے بادبان کھول کر کشتی پر ایک سائبان سا تان دیا۔ پھر اس نے سیٹھ قائم علی دائم علی کو آنکھ ماری "لو سیٹھ، میں تو مچھلیاں پکڑنے چلا —— تم مزے سے کشمیر کی بہاریں لوٹو ——"

عیدگاہ کے میدان میں ایک مینا بازار لگا ہوا ہے۔ یہاں ہر روز عید ہے ہر شب شبِ برات۔ ٹاٹ کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں ننھے ننھے چراغ ٹمٹما رہے ہیں۔ گوشت روٹی، سِلے ہوئے کپڑے، پرانے بوٹ، تازے پھل، لوہے کی میخیں، لکڑی کے صندوق، چمڑے کی کرسیاں، تیل، اچار، صابن —— بے گھر اور بے در مہاجر سہارے کی ہر ممکن لڑی تھام کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک عجیب قسم کا اطمینان، ایک عجیب قسم کی ابدیت اس ماحول پر جاری و ساری ہے —— جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ زندگی کا یہ بھٹکا ہوا کارواں آخر اپنی منزلِ مقصود پہ پہنچ گیا ہے۔

ایک جھونپڑی میں چادر تان کر دو حصّے کیے ہوئے ہیں۔ سامنے کی طرف دلشاد پکوڑیاں تل رہی ہے پچھلی طرف زبیدہ دہی بڑے لگائے بیٹھی ہے۔

ایک لمبا تڑنگا پٹھان پکوڑیوں کے سامنے پھسکڑا مارے بیٹھا ہے۔

"گرم گرم پکوڑیاں ہیں، خان، —— کھا لو —— بولو کتنے کی دُوں؟"

"نرم ہے، خو، گرم ہے؟" پٹھان نے آنکھ ماری۔

"ہاں خان! نرم ہے، خو گرم ہے!" دلشاد کڑھی منہ کے سامنے کر کے مُسکرائی۔ دلشاد کی مسکراہٹ میں بھی عجیب جادو تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ پر نثار ہو کر رحیم خاں نے قسم کھائی تھی کہ اگر سورج یا چاند یا تارے بھی اُسے اٹھا لے جائیں تو وہ ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر اُسے چھین لائے گا۔

پٹھان نے ہونٹوں پر زبان پھیری "خو ایک روپیہ؟"

"نہیں خان، خو پانچ روپیہ ——"

"ہٹ، خو، ڈھائی روپیہ؟"

"خو، پانچ۔"

پٹھان نے اپنی جیب کے پیسے گنے۔ اس کے پاس تین روپے چار آنے تھے اس نے پونے دو روپیہ کا ادھار کرنا چاہا لیکن دلشاد نے اُسے مجبور کر دیا کہ خان، قرض محبت کی قینچی ہے۔ تم پیسے پورے کر لاؤ۔ میں تمھیں جھٹ پٹ نرم نرم، گرم گرم پکوڑیاں اتار دوں گی۔

پٹھان مایوس ہوکر دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے دہی بڑوں کا سودا کیا۔
زبیدہ ابھی بچّہ تھی، نادان تھی، معصوم تھی، اس لیے وہ پونے دو روپے کا ادھار مان گئی۔

زبیدہ نے دلشاد کو آواز دی "بہن ذرا اس طرف دھیان رکھنا محمود سو رہا ہے۔ میں ذرا خان کے ساتھ جا کر دہی لے آؤں"

اسی طرح جب دلشاد بھی اپنی پکوڑیوں کے لیے بیسن لینے کسی گاہک کے ساتھ جاتی ہے تو اپنی بچی کو زبیدہ کے سپرد کر جاتی ہے۔ دہی اور بیسن کی اس ملاوٹ پر دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی ملّت کا مستقبل پروان چڑھ رہا ہے۔ جب دلشاد کی بچّی نرم نرم، گرم گرم پکوڑیوں پر پل کر جوان ہو گی۔ جب زبیدہ کا محمود دہی بڑوں کی چاٹ پر سیانا ہوگا، تو اسلام کی برادری میں دو گرانقدر رکنوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ ایک مضبوط بھائی، ایک خوبصورت بہن ——— جسم کی مضبوطی اور جسم کی خوبصورتی! یہی تو وہ اینٹ اور گارا ہے، جس سے بہادر قومیں تعمیر ہوتی ہیں ——— جسم کی مضبوطی اور جسم کی خوبصورتی! یہی تو وہ نعمتِ عظمیٰ ہے، جو نعمتوں والے عظمتوں والے باری تعالیٰ نے تم کو عطا کی ہے۔ وہ تو بڑا ہی رحیم اور شفیق آقا ہے۔ وہی مشرق کا مالک ہے، وہی مغرب کا مولا ہے۔ اُسی نے درختوں پر خرمے اور انار لگائے۔ وہی دریاؤں سے موتی اور مونگے نکالتا ہے۔ وہی جنّت کا رحمان ہے، وہی دوزخ کا قہار ہے ——— پھر تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

دیباچہ

منشی پریم چند سے لے کر اب تک کے افسانہ نگاروں کے درمیان اندازِ بیان کی متعدد مماثلتیں موجود ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس دَور کے افسانہ نگاروں کی انفرادیتیں آپس میں اس طرح پیوست ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ پہنچاننا دشوار ہے۔ مَیں صرف یہ کہہ رہا ہُوں کہ ایک ہی دور میں سانس لینے اور ایک ہی قسم کے مسائل سے نمٹنے کی وجہ سے ان افسانہ نگاروں کے اسلوبِ نگارش کی سرحدیں بعض مقامات پر ایک دوسرے کو چھوتی ہُوئی گزر جاتی ہیں۔ قدرت اللہ شہاب بھی افسانہ نگاروں کی اسی پود سے تعلق رکھتا ہے جن کے مسائل یکساں تھے اور جو حقیقت پسندی کی راہ سے ان مسائل سے نمٹتے تھے، مگر کم سے کم "ماں جی" کے مطالعہ سے تو مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہُوا ہے کہ شہاب کا اندازِ بیان اپنے ہم عصروں میں سے کسی سے بھی مماثل نہیں ہے۔ بعض مقامات پر شہاب کی سادہ زبان کے علاوہ اس کی بے تکلفی اور بے ساختگی منٹو کی یاد ضرور دلاتی ہے۔ مگر منٹو کے سادہ جملوں کی بھی باقاعدہ نوکیں اور

دھاریں ہوتی تھیں۔ اس کے برعکس شہاؔب اپنے سادہ سادہ جملوں میں بظاہر سادہ سی بات کرکر آگے بڑھ جاتا ہے مگر افسانہ مکمل کر لینے کے بعد پڑھنے والے کے تحت الشعور میں ان جملوں کا گہرا اور بھرپور مفہوم دمکتا رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہاؔب کا افسانہ ایک بار پڑھ لینے کے بعد اسے ایک بار پھر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ خصوصیت بہت کم افسانہ نگاروں کو حاصل ہے۔

"ماں جی" میں شہاؔب کے صرف افسانے شامل نہیں ہیں۔ اس مجموعے میں افسانوں کے علاوہ خاکے، مکالمے، انشائیے اور سفرنامے بھی ہیں۔ مجموعے کی ترتیب کا یہ طریقہ ہمارے مروجہ معیاروں کے مطابق نہیں ہے مگر اس مجموعے کے افسانے خاکوں سے، اور خاکے مکالموں سے، اور مکالمے انشائیوں سے، اور انشائیے سفرناموں سے پوری طرح مربوط ہیں اور ان کے درمیان باہمی ربط، شہاؔب کے کہانی سنانے کے منفرد انداز سے پیدا ہوا ہے۔ وہ خاکے، انشائیے اور سفرنامے لکھتے ہوئے بھی افسانہ نگار ہی رہتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح شہاؔب، شاید قطعی غیر شعوری طور پر، اُردو افسانے کے ایک نئے ادب کی جلوہ گری کا سامان کر رہا ہے۔ آج کل ہمارا جدید تر افسانہ تجرید کا شاہکار ہے (اور تجرید کو حقیقت نگاری کا ردِ عمل کہا جاتا ہے، حالانکہ وہ دراصل حقیقت سے فرار کا ایک بارعب نام ہے۔) جب ہمارا نیا افسانہ تجرید کے چنگل سے نکلے گا —— اور اُردو افسانے کو اگر زندہ رہنا اور نکھرنا ہے تو اُسے اس گورکھ دھندے سے نکلنا ہی ہوگا۔ —— تو اُردو افسانے کی ہئیت میں شہاؔب کا یہ اجتہاد نئی نسل کی رہنمائی کرے گا۔ ظاہر ہے کہ فنِ افسانہ نگاری کے بعض متفقہ تقاضے تو ضرور ہیں مگر یہ صرف تقاضے ہیں، سانچے نہیں ہیں۔ ہر افسانہ اپنا سانچہ آپ ہی تیار کرتا ہے بلکہ بعض اوقات تو افسانہ نگار اپنے ہی افسانے کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ افسانہ آج بھی اسی طرح لکھا جاتا رہے جس طرح پریم چند یا کرشن چندر یا منٹو یا بیدی

نے لکھا تھا۔ شاعری کی طرح افسانہ نگاری کے بھی بے شمار ہئیتی امکانات ہیں۔ صرف تجربے کا حوصلہ شرط ہے۔ شہاؔب میں یہ حوصلہ موجود ہے۔ اور اس مجموعے کے مندرجات اس حقیقت پر شاہد ہیں۔

شہاؔب متنوع موضوعات کا افسانہ نگار ہے۔ وہ کسی ایک موضوع، انسانی زندگی کے کسی پہلو کا "سپیشلسٹ" نہیں ہے۔ جو بھی موضوع اس کے گہرے اور باریک مشاہدے سے گزرا ہے اور جس بھی واقعے نے اس کے احساس کو چھیڑا ہے، اسے افسانے یا افسانوی تحریر کی صورت میں اس اضافے کے ساتھ پیش کر دیا ہے جو کسی تحریر کو فن پارہ بناتا ہے۔ حقیقت اور فنی حقیقت میں اسی اضافے کا فرق ہے۔ یہیں سے خبر نگار اور افسانہ نگار کی راہیں ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں۔ خبر کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ کسی مقام پر ایک خوشگوار یا ناگوار واقعہ ہوا ہے، مگر افسانے کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہو رہا ہے اور یہ واقعہ ہم پر سے گزر رہا ہے۔ اسی لیے تو فن کو کردار سازی کا منصب حاصل ہے۔ یہاں مجھ پر الزام عاید ہو سکتا ہے کہ مَیں شہاؔب کے فن کو مقصدیت سے "آلودہ" کر رہا ہوں۔ مجھے یہ الزام قبول ہے کیونکہ میری نظر میں یہ "آلودگی" سچے اور اعلیٰ فن کی سب سے بڑی متاع ہے۔ پھول خوبصورت چیز ہے مگر پھول اگانے والے کے ہاتھ —— سوندھی سوندھی مٹی سے سنے ہوتے ہاتھ اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ تخلیق کا ہمیشہ باقی رہنے والا حسن اسی "آلودگی" میں ہے اور مَیں خوش ہوں کہ شہاؔب کا مجموعہ اسی حسن سے "آلودہ" ہے۔

شہاؔب کے افسانوں اور خاکوں وغیرہ کے بے حد متنوع موضوعات، عام مروجہ افسانوی موضوعات سے یکسر الگ ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب اس کی متنوع زندگی کی دین ہے۔ مگر لوگوں نے تو شہاؔب سے بھی زیادہ متنوع زندگیاں بسر کی ہیں لیکن نہ ان کے ذہنوں کے پتھر پگھلے اور نہ ان کے دلوں کے بنجر میں سے کوئی اکھوا پھوٹا۔ یہ فن کار

شہاب ہی ہے جو اپنے مشاہدے کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھتا ہے۔ اور کوئی ننھی سے ننھی تفصیل بھی ایسی نہیں جو اس کے دماغ و دل پر اپنا عکس ڈالے بغیر گزر جائے۔ میں شہاب کے مشاہدے پر بطور خاص اس لیے زور دے رہا ہوں کہ اس کا بے تکلفانہ اور بے ساختہ اندازِ بیان اس امر کی دلیل ہے کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے، براہِ راست اپنے ذاتی مشاہدے سے لکھا ہے۔ اور اس کا مشاہدہ اس انتہا تک گہرا اور مکمل ہے کہ اگر اس نے کہیں بیروں اور خاکروبوں کو بھی بات کرتے ہوئے دکھایا ہے تو یہ باتیں بیروں اور خاکروبوں ہی کے روز مرہ کی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک اعلیٰ افسر کو اس "مخلوق" کے مشاہدے اور مطالعے کا وقت کہاں سے ملا۔ اس سوال کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ سی ایس پی افسر شہاب اور ادیب شہاب دو الگ الگ شخصیتیں نہیں ہیں ـــ اور اگر ہم اپنی آسانی کے لیے دونوں کو الگ الگ کر دیں تو پھر یوں سمجھ لیجیے کہ ایک شہاب نے ان کی نفسیات کی ایک ایک پرت کو چھان لیا۔

"ماں جی" میں شہاب ایک طنز نگار کی صورت میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ طنز کا عنصر اس کی سابقہ تخلیقات میں بھی موجود ہے مگر اس مجموعے میں یہ عنصر بہت بلیغ ہو گیا ہے۔ اس کا طنز کسی ایک طبقے یا کسی ایک ادارے کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ معاشرے پر، ادب کی مروجہ قدروں پر، نام نہاد تقدس پر، حد یہ ہے کہ کاروبارِ حکومت پر بھی طنز کرتا ہے اور طنز کا یہ وار بڑا بھرپور ہوتا ہے۔ طنز نگاری بہت مشکل فن ہے۔ یہ سب ادیبوں کے بس کا روگ نہیں۔ کامیاب طنز نگاری کے لیے نہ صرف ایک خاص مزاج درکار ہوتا ہے بلکہ مشاہدہ و مطالعہ کا بے پناہ ذخیرہ بھی ضروری ہے اور پھر ان مشاہدات کا منطقی اور سائنسی تجزیہ کرنے کی قوت بھی لازمی ہے۔ مزاح تو ہم لفظوں کے الٹ پھیر سے بھی پیدا کر سکتے ہیں مگر طنز کرنے کے لیے تو علم کی وسعت اور احساس کی شدت سے مسلح ہونا پڑتا ہے۔ شہاب اس اسلحے سے پوری

طرح آراستہ ہے۔ مثال کے طور پر میں اس کے صرف ایک سفرنامے "اے بنی اسرائیل" سے چند اقتباسات پیش کروں گا:

"پولیس کے سپاہی غیر معمولی طور پر موٹے تھے اور گرمیوں کی وجہ سے اپنی وردیوں سے بیزار۔ یہ سپاہی زیادہ تر ٹھیلوں یا کھمبوں کا سہارا لیے اونگھ رہے تھے۔ جب بھی آنکھ کھلی تو یونہی کسی کو دھکا دے کر کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے اپنے فرائضِ منصبی سے عہدہ برآ ہو رہے تھے۔

اگر دوسرے مسافروں اور قلیوں کی نگاہیں بُری طرح ان پر نہ جمی ہوتیں تو یہ بزرگ (رومن کیتھولک پادری) نرسوں کو اپنے مقدس سینوں سے ضرور چمٹا لیتے۔

بہت سے عرب شہزادے، جو اپنے ملک یا اپنے محلات میں شراب پینے سے معذور ہیں، اپنے پرائیویٹ جہازوں میں جوق در جوق یہاں (بیروت میں) آتے ہیں اور راتوں رات دادِ عیش دے کر صبح سویرے اپنے فرائضِ منصبی پر واپس حاضر ہو جاتے ہیں۔

بیروت کا شمار بھی دُنیا کے ان مہذب شہروں میں ہے جہاں غریب ہونا تو کوئی جُرم نہیں، البتہ بھیک مانگنا ضرور جرم ہے۔

اس خاندان میں ایک چھ سات سال کا لڑکا تھا۔ ایک نو سال کی لڑکی تھی۔ ان کی ماں ایک ادھوری بہار کی طرح جسے وقت سے پہلے خزاں نے پامال کر ڈالا ہو۔ وہ کبھی اپنے بچوں کی طرف دیکھتی، کبھی راہگیروں کی طرف اور کبھی اس سپاہی کی طرف جو بید کی چھڑی گھما گھما کر بھک منگوں کو بھگا رہا تھا۔ مجھے رُکتے دیکھ کر وہ لڑکا میری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا "کیا آپ میری تصویر کھینچنا چاہتے ہیں؟"

طنز کا تیر سیدھا ذہن میں جا کر ترازو ہو جاتا ہے مگر اتنے مؤثر طنز کے لیے شہاب کو کسی تکلف، کسی ہیر پھیر، کسی بناوٹ کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہ سادگی بڑی ریاضت

کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ مَیں نے بعض معروف سلیس نگاروں کے ہاں بھی تصنع کے انبار لگے ہُوئے دیکھے ہیں۔ یہ لوگ پڑھنے والے کو سلاست کا دھوکا دے کر دراصل اپنا تصنع چھپاتے ہیں۔ ان کی سلاست اپنی سلاست پر اتراتی ہُوئی معلوم ہوتی ہے، مگر شہاب کی سادگی میں بلا کی پُرکاری ہے۔

شہاب کے ہاں مجھے اگر کوئی خامی نظر آئی ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو افسانے کے موضوع یا اس کے کرداروں سے لاتعلق نہیں رکھ سکا۔ وہ ایک مشّاق افسانہ نگار کی طرح آغاز تو عدم وابستگی سے کرتا ہے مگر کہیں نہ کہیں اس کی وابستگی عیاں ہو جاتی ہے۔ اصطلاحی زبان میں اسے افسانہ نگاری کی تکنیک کی خلاف ورزی کہہ لیجیے مگر مَیں نے محسوس کیا ہے کہ جس چیز نے شہاب کی اس خامی کو بیشتر مقامات پر خوبی بنا دیا ہے، وہ موضوع کے ساتھ اس کا خلوص اور پھر اس خلوص کی شدّت ہے۔ عدم وابستگی کی کوشش کے باوجود، وابستگی کا یہ بالواسطہ اظہار مجھے ترکِ محبت کا فیصلہ کرنے والے اس عاشق کی یاد دلاتا ہے جو اپنے محبوب کو یہ فیصلہ سنانے کے بعد جب پلٹے تو رو دے!

اس مجموعے میں "اور عائشہ آگئی"، "ریلوے جنکشن"، "سردار جسونت سنگھ"، "نمبر پلیٹ"، "پکّے پکّے آم"، "جگ جگ"، "آیا" اور "تلاش" کے سے نک سک سے درست افسانے بھی ہیں، "ایک پنکچر"، "سٹینو گرافر"، "شلوار" اور "جلترنگ" کے سے جذبات بھرے رومان بھی ہیں، "اے بنی اسرائیل" کے سے رُلا دینے والے سفرنامے بھی ہیں، "اقبال کی فریاد"، "آثارِ قدیمہ"، "سُرخ فیتہ" اور "ایک ڈسپیچ" کے سے پارہ ہائے طنز بھی ہیں۔ ان میں رابرٹ لانگ اور بیروت کے بیرے اور گوراں اور اس لڑکی باربرا کے سے ہمیشہ یاد رہنے والے کردار بھی ہیں جو متعدد مقامات پر مختلف ناموں سے نمودار ہوتی ہے اور اس کی گرفت کہیں بھی ادھوری نہیں ——— مگر مَیں حیران ہُوں کہ اس ادب پارے کو کیا نام دوں جس سے اس مجموعے کا آغاز ہُوا ہے اور جس سے اس مجموعے نے اپنا نام پایا

ہے۔ مَیں اسے افسانہ یا انشائیہ یا سکیچ یا تاثر یا تذکرہ ——— کچھ بھی کہنے کا فیصلہ کروں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مَیں اس گراں مایہ تحریر کے ساتھ بے انصافی کر رہا ہُوں۔ "ماں جی" ان سب نثری اصنافِ ادب سے وابستہ ہو کر بھی ان سب سے کوئی الگ اور بلند چیز ہے۔ اُردو ادب میں اس کی واحد مثال عصمت چغتائی کا "دوزخی" ہے، مگر کیا ہم "ماں جی" اور "دوزخی" پر نثری ادب کی کسی بھی مروجہ صنف کا ٹھپّا لگا سکتے ہیں؟ اس کے باوجود اثر انگیزی کے لحاظ سے کوئی بڑے سے بڑا افسانہ یا سکیچ یا تذکرہ اردو ادب کے ان دو غیر معمولی شاہکاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میرا عالمی ادب کا مطالعہ بہت وسیع نہیں تو کچھ ایسا محدود بھی نہیں مگر دوسری زبانوں کے ادب میں بھی "ماں جی" کے پائے کی کوئی چیز میری نظر سے کبھی نہیں گزری۔ شہاب اگر "ماں جی" کے سوا کبھی کوئی چیز نہ لکھتا تو جب بھی ادب اسے صدیوں تک فراموش نہ کر سکتا۔ "ماں جی" کو مَیں صرف شہاب ہی کا نہیں، پُورے اُردو ادب کا کارنامہ قرار دیتا ہُوں ——— اور پھر انسان کے اس مقدّس ترین رشتے کا کارنامہ بھی جس کے بعد صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ بندے اور خدا کا رشتہ ہے۔

احمد ندیم قاسمی

۲۰ جنوری ۱۹۶۸ء

ماں جی

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہوسکا۔

جس زمانے میں لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرفِ عام میں لائل پور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو "بار" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ماں جی کی دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہوگئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے۔ لیکن سیدھے آدمی تھے۔ کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا

دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کُھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پتہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آبادکاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ ناناجی اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لیے پاپیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ ناناجی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے۔ اور پوچھ پوچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پاپیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوتے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ ناناجی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقرعید کا تہوار آیا۔ ناناجی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انھوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے نزدیک سو روپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔ عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا اس کے بعد جب کبھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ

فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی۔ لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انھیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی، نہ کوئی زیور، اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے، ایک جوڑا دیسی جوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوتے تھے۔ ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لیے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انھیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے انھیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انھیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اُونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بُکل ماری اور جہاں کہیے چلنے کو تیار۔ سفرِ آخرت بھی انھوں نے اسی سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو کر بال سکھائے اور چند ہی منٹوں میں زندگی کے سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دُنیا میں رہی تھیں، اسی خاموشی سے عقبیٰ کو سدھار گئیں۔ غالباً اسی موقع کے لیے وہ اکثر یہ دُعا

مانگا کرتی تھیں، کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ چلتے چلاتے اٹھالے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔۔۔۔

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتّے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی، دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں، لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں کبھی بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر دوپہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا۔ خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لیے انھوں نے براہِ راست کبھی کچھ نہ مانگا۔ پہلے دوسروں کے لیے دُعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوقِ خُدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انھوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا "میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کر دیتا تو انھیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مندی سے سارا دِن اُسے دُعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خورد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائل پور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں تو انھیں کچھ معلوم نہ تھا

کہ انھیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہیں سرِ راہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہوگا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائل پور کے علاقے میں پاپیادہ بھٹکتا رہا۔ لیکن کسی راہ گزر پر انھیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آکر انھوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جو ان دِنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا ڈیرے ڈال دیے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آکر لوگ آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہوگا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھونس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انھی دِنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لیے آیا۔ نانا جی کے پاس آلاٹ منٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انھیں چک سے نکال دیا گیا اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لیے۔ عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتروا لیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کے بائیں کان کا زیریں حصہ بُری طرح سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دِن تھے۔ دِن بھر لُو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لیے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آیا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے سے اپنے چھوٹے بھائیوں کو چُساتی جائیں۔ اس طرح وہ چلتے چلتے چک ۵۰۷ میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آبادکار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لیے لایا کرتی تھیں۔ ان دِنوں انھیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری

طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے اُبال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی بانبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توریئے اور کلتھے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آگیا۔ نانی محنت مزدوری میں مصروف تھی۔ ماں جی نے ساگ چولہے پر چڑھایا۔ جب پک کر تیار ہو گیا اور ساگ کو آلن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہہ کر چولہے میں آپڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولہے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰۷ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربعہ زمین مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرّے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوبِ چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انھوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد و غبار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انھیں مجبوراً ایئر کنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں۔ اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گراں گزرا۔

منیلہ پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی امکان درست کیا۔ عزیز واقارب کو تحائف دیے۔ دعوتیں ہوئیں اور پھر ماں جی کے لیے بر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لیے نانی جی انھیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں۔ اُن دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا تک دوبھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھیے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔

"ماں جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟" ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر اُن سے پوچھا کرتے۔

"توبہ توبہ پُت"، ماں جی کانوں پر ہاتھ لگاتیں "میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے اور بے حد

مفلوک الحال تھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اُٹھا تو یہ انکشاف ہُوا کہ ساری آبائی جائیداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اُٹھ آئے۔

زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انھوں نے ایسی جائداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہوگئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کرکے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کرکے پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اوّل آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اُڑتے اُڑتے یہ خبر سرسیّد کے کانوں میں پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ اُنھوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا۔ اور بی۔ اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لکچرر ہو گئے۔

سرسیّد کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ انھوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان میں جاکر آئی، سی، ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کرکے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انھوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسیّد کو بے حد غصّہ بھی آیا اور دُکھ بھی ہُوا۔ انھوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہُوئے۔

"کیا تم اپنی بُوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟" سرسیّد نے کڑک کر پوچھا۔

"جی ہاں"، عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ ٹکا سا جواب سُن کر سرسیّد صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کرکے پہلے انھوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں، مکّوں، تھپّڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخواست کرکے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا "اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمھارا نام بھی نہ سُن سکوں"۔

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے۔ اتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انھیں سب سے دُور اُفتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دِنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی۔ انہی دِنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پہ گاؤں آئے ہُوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہُوا تھا۔ ان کی منگنی ہوگئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبداللہ صاحب دُلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہُوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انھیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ پانچ روپے پیش کیے۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

"اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟" عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

"اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوا دوں گی" ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انھوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ، وسیع باغ، نوکر چاکر، دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ۔ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یُوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا۔ لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرا بھی اثر نہ ہُوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دِنوں سر مالکم ہیلی حکومتِ برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انھوں نے فراک پہنے ہُوئے تھے۔ اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انھوں نے لیڈی ہیلی سے کہا "تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی گزر ہی گئی ہے۔ اب آپ اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو۔" یہ کہہ کر انھوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور چند مہینوں میں اُسے کھانا پکانا، سینا پرونا، برتن مانجھنا، کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہُوا تو لارڈ کچنر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہُوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچنر نے اپنی تقریر میں کہا "مسٹر گورنر، جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں، براہِ مہربانی میری طرف سے آپ ان کے ہاتھ چوم لیں۔"

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چُومے اور کہا "اگر لارڈ کچنر یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟"

"مَیں،" ماں جی تنک کر بولیں "مَیں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے؟"

"مَیں،" عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا "مَیں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمھیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا، جیسے سر سید کے ہاں سے بھاگا تھا۔"

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار ——— ماں جی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھُن کر کباب ہو گئیں۔ جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورنری" کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!"

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہُوئے تھے۔ رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا "بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے۔ جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت

کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دِل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آگئی۔ "ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ مَیں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں"۔

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاپ سنگھ تک پہنچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھلائے یہ کیا افتاد آپڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیرِ وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگِ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سُن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سُنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

"اب تم دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو" مہارانی نے کہا "کبھی ہمارے لیے بھی دُعا کرنا"۔ مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دُنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دُکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کیے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصہ بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالمِ شباب میں انگلستان جا کر گذر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھُپ چھُپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہُوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر بچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھردری چارپائی پر حسبِ معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائینتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکایک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے "بھاگوان شادی سے پہلے میلے میں مَیں نے تمھیں گیارہ پیسے دیے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟"

ماں جی نے نئی نویلی دلہنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال اُمڈ آئے "ابھی وقت کہاں آیا ہے۔ سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہ کیا ہے۔ اس پر مَیں نے تمھارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمھیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔

لیکن قضا و قدر کے بہی کھاتے میں وقت آچکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبداللہ صاحب گنّے کی قاش منہ میں لیے گاؤ تکیہ پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا، ہلایا، چمکارا لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے لگا لگا کر تلقین کی "بچّہ، رونا مت۔ تمھارے ابا جی جس آرام سے رہے تھے، اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ ان کی رُوح کو تکلیف پہنچے گی"۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا، ورنہ ان کو تکلیف پہنچے

گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انھیں ایک الھڑ دلہن سمجھا اور جس نے "گورنری" کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پہ لاکر نہیں بٹھائی۔

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں، جو قیامت تک انھیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا ملّا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر رو یا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی رُوح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔

۱۸۔ سول لائن

فروری ۱۹۴۷ء میں میرا تبادلہ اڑیسہ ہوا اور کٹک میں مجھے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ڈپٹی سیکرٹری کے طور پر تعینات کیا گیا۔

اس زمانے میں اڑیسہ کے وزیرِ اعلیٰ سری ہری کرشن مہتاب تھے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ کا شعبہ ان کے ماتحت تھا۔ چارج لینے کے بعد میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے پوچھا کہ مجھے رہنے کے لیے کون سا گھر ملا ہے۔ میں نے کہا اڑیسہ گورنمنٹ مجرد افسروں کو رہائشی جگہ دینے کے حق میں نہیں ہے۔ اس لیے میں اب تک سرکٹ ہاؤس میں مقیم ہوں۔

مہتاب صاحب مسکرائے اور کہا "اگر گھر حاصل کرنا ہے تو لگے ہاتھوں شادی بھی کر ڈالو۔"

میں نے وزیرِ اعلیٰ کو مطلع کیا کہ ان کی حکومت نے یہ ضابطہ بھی بنا رکھا ہے کہ شادی کے بعد جب تک کم از کم دو بچے پیدا نہ ہو جائیں کسی افسر کو سرکاری مکان نہیں مل سکتا۔

لگے ہاتھوں بی الفور کئی بچوں کا باپ بننا میرے بس کا روگ نہیں تھا چنانچہ میں کافی عرصہ تک سرکٹ ہاؤس میں رہا۔

ایک روز کچھ فائلیں لے کر ہری کرشن مہتاب صاحب کے پاس گیا، تو انھوں نے پھر میرے مکان کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ وزیرِ اعلیٰ ہونے کے باوجود مہتاب صاحب بڑے پُرخلوص اور نیک دل انسان تھے۔ اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے ذاتی مسائل کی طرف خاص طور پر توجہ دیا کرتے تھے۔

"میرے ذہن میں ایک کوٹھی ہے" مہتاب نے کہا "لیکن اس میں کچھ جن بھوت بھی رہتے ہیں۔ اگر تمھیں اس کی صحبت قبول ہو تو وہ مکان ابھی مل سکتا ہے۔"

جن بھوتوں کے ساتھ مجھے ابھی تک ذاتی تعارف کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ قصّوں اور کہانیوں میں بسنے والی یا مافوق العادت مخلوق میرے نزدیک ایک مہمل وہم کا درجہ رکھتی ہے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے مہتاب صاحب نے سول لائنز کی نمبر اٹھارہ کی کوٹھی مجھے الاٹ کر دی۔

یہ ایک چھوٹی سی خوشنما کوٹھی تھی لیکن سالہا سال سے غیر آباد رہنے کی وجہ سے اس کے در و دیوار سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ کوٹھی کے ساتھ ایک وسیع و عریض لان تھا۔ چاروں طرف لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ زرد زرد سوکھے ہوئے پتے ڈھیر کے ڈھیر بکھرے پڑے تھے۔ جا بجا تازہ اور پرانے گوبر پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ایک چھوٹے سے تالاب میں کائی جمی ہوئی تھی۔ صحن کے جنوبی گوشے میں جامن کا درخت تھا۔ شمال مغرب میں ایک درخت سے بہت سی چمگادڑیں الٹی ہوئی تھیں۔ ناریل کے پیڑ کے نیچے ایک فاقہ زدہ بلی دھوپ سینک رہی تھی۔ برآمدے میں دو آوارہ کُتے اپنے پِلّوں کے ساتھ گردنیں کھجا رہے تھے۔ اور چمگادڑوں کی طرف منہ اُٹھا اُٹھا کر لمبی لمبی تانوں میں رو رہے تھے۔

میرے ساتھ ایک کشمیری ملازم رمضان تھا۔ اُس نے سارا دِن لگا کر مکان کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ دوسری صبح جب وہ شیلو کا پانی لے کر آیا تو اس کا مُنہ لٹکا ہُوا تھا۔ ان دِنوں بہار، بنگال اور اڑیسہ میں جا بجا ہندو مُسلم فساد ہو رہے تھے۔ رمضان نے روئی صورت بنا کر کہا کہ رات جب وہ اپنے کوارٹر میں سویا پڑا تھا تو ایک ہندو دبے پاؤں اندر آیا اور اس کی چارپائی الٹ کر بھاگ گیا۔ رمضان نے اس کا تعاقب کیا تو اندھیرے میں اس کا منہ کھٹاک سے دروازے کے ساتھ لگا، کیونکہ اندر سے کنڈی بند تھی۔

"اگر وہ ہندو باہر سے آیا تھا تو کمرے کی کنڈی اندر سے کیسے بند ہو گئی ہے؟"

"اس میں بھی سالے ہندوؤں کی چال ہو گی۔" رمضان نے وثوق سے جواب دیا۔ اس کے ذہن میں ہندو مُسلم تعصب یُوں کوٹ کوٹ کر بھرا ہُوا تھا کہ اب اس میں مافوق الفطرت حادثات کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہی تھی۔

۱۸۔ سول لائنز کی جو خصوصیات سب سے پہلے کھٹکی وہ یہ تھی کہ وقتاً فوقتاً اس کی چھت انگڑائیاں سی لیتی محسوس ہوتی تھی۔ رات اور دِن میں کئی بار چھت کڑاک کڑاک بجتی تھی، جیسے لوہے کی گرم چادر ٹھنڈی ہو کر چٹختی ہے۔

ایک رات گیارہ بجے کے قریب میں بجلی بجھا کر بستر پر لیٹا تو دروازے پر دستک ہُوئی۔ مَیں نے سوچا کہ شاید رمضانی کوئی چیز بھُول گیا ہے، لینے آیا ہے۔ لیکن دروازہ کھولا تو برآمدہ خالی تھا۔ البتہ ہوا کا ایک گرم سا جھونکا میرے چہرے سے ضرور لگا۔ فروری کی وہ رات خوب ٹھنڈی تھی لیکن برآمدے میں یُوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کہیں پاس ہی الاؤ جل رہا ہے۔

اس رات کے بعد یہ دستک ایک معمول بن گئی۔ جیسے ہی بجلی بجھا کر لیٹتا، دروازے پر تھپا تھپ دو تین بار دستک ضرور ہوتی۔ ایک رات جب یہ دستک نہ ہُوئی تو مجھے عجیب سا لگا۔ مَیں بجلی بجھا کر لیٹ ہی رہا تھا کہ سوئچ کھٹاک سے بجا اور بجلی خود بخود

روشن ہوگئی۔ میں بجلی بجھانے کے لیے اُٹھا تو میرے سلیپر کہیں نظر نہ آئے۔ پلنگ کے نیچے جھانکا۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ لیکن سلیپر ندارد ـــــ اسی اثنا میں سوئچ خود بخود کٹکٹایا اور بجلی بُجھ گئی۔ میں دوبارہ لیٹا تو سرہانے کے نیچے چُرمُر سا ہُوا تکیہ اُٹھا کر دیکھا تو دو سلیپر بڑے سلیقے سے غلاف کے اندر دھرے تھے۔

کوٹھی کا ڈرائینگ روم سونے کے کمرے سے ملحق تھا۔ درمیان میں ایک دروازہ تھا جو عموماً کھلا رہتا تھا۔ دروازے میں سبز رنگ کی جالی کا ایک باریک سا پردہ لٹکا رہتا تھا۔ یکایک دروازے کا پردہ ہلا، اور ڈرائینگ روم میں سرسراہٹ سی ہُوئی۔ جیسے ریشم کا تھان کھل رہا ہو۔ پھر چوڑیاں کھنکھیں اور ایک نسوانی آواز نے چند ہچکیاں لیں۔ فرش پر اُونچی ایڑی والے زنانہ جوتوں کے چلنے پھرنے کی آواز پیدا ہُوئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پردے کے پیچھے سے جھانکا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ لیکن فضا میں حنا کے عطر کی خوشبو رچی ہُوئی تھی۔ میں نے ڈرائینگ روم کا بلب روشن کر کے ماحول کا جائزہ لیا۔ ایک اداس خاموشی کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ واپس آکر پلنگ پر لیٹا تو چھت پر بہت سے بھاری بھرکم قدموں کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی کئی پتھر پے در پے اندر برسنے لگے پھر پتھر میرے دائیں بائیں، آگے پیچھے زور زور سے گرتے تھے لیکن مجھے لگتے نہ تھے۔ دروازہ کھڑکی اور روشن دان بند تھے، لیکن پتھروں کا مینہ بدستور برستا رہا۔ باہر کافی زور کی بارش ہو رہی تھی۔ لیکن کمرے میں گرنے والے پتھر بالکل خشک تھے۔ ایک اینٹ جو میرے بازو کے عین پاس آکے گری، کوئی ڈھائی سیر وزنی تھی۔

صبح سویرے میں نے ان تمام پتھروں کو اکٹھا کر کے باہر پھینک دیا تاکہ رمضانی کے دِل میں ہندوؤں کی خشت زنی کا رعب، نہ بیٹھ جاتے لیکن جب وہ میرے لیے چائے لے کر آیا تو بڑی بے بسی سے مجھے خبر دی کہ ساری رات کئی ہندو اس کے کمرے میں کوڑے کرکٹ کے ٹوکرے پھینکتے رہے ہیں۔ ایک بار تو ایک انسانی کھوپڑی بھی اس

کی چارپائی پر آکے گری۔ رمضان بڑے دِل گردے کا کشمیری تھا کیونکہ جب میں نے اسے رائے دی کہ رات کو ڈرائینگ روم میں آکر سو رہا کرے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

"صاحب اگر میں نے کوارٹر چھوڑ دیا تو یہ سالے ہندو سمجھیں گے کہ یہ مسلمان بڑا بودا ہے۔"

اس روز میں نے دوپہر کے کھانے پر ایک دوست کو بلایا ہُوا تھا۔ کھانے میں پلاؤ، کوفتے اور سیخ کباب تھے۔ جب میں نے نوالہ منہ میں ڈالا تو میرے دانتوں میں ریت ایسی کوئی چیز کچر کچر کرنے لگی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ رمضان نے مصالحہ کچی سل پر پیسا ہے اور سارے کھانے میں کرک آگئی۔ جس جس چیز کا نوالہ منہ میں ڈالتا تھا اس میں کنکریاں سی کڑکڑانے لگتی ہیں۔ لیکن میرا دوست بڑے مزے سے ہر چیز نوش جان فرما رہا تھا اور اس نے ایک بار بھی ریت یا کنکریوں کی شکایت نہ کی۔

کھانے کے بعد میں نے ایک پان لیا۔ منہ میں ڈالتے ہی میرے دانت بُری طرح جھنجھنائے کیونکہ پان میں سپاریوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں بھری ہُوئی تھیں سنگترے کی پھانک میں بھی ریت کے ذرے تھے۔ سیب کا ٹکڑا پکے روڑے کی طرح کٹکتا تھا۔ یہاں تک کہ جب میں نے ایک کیلا چھیل کر کھانے کی کوشش کی تو اس میں بھی کچر کچر کرتی ہُوئی مٹی کی آمیزش پائی۔

شام کے وقت میں ڈرائینگ روم میں اکیلا بیٹھا تھا۔ یکایک کمرے میں بھنتے ہُوئے گوشت کی لپٹیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد سوجی کے گرم گرم حلوے کی سوندی سوندی خوشبو پھیل گئی۔ اس کے بعد یکایک ایک بہت بڑی چمگادڑ زور سے بجلی کے بلب پر آکر لگی۔ بلب ٹوٹ گیا اور اندھیرا ہوتے ہی مجھے یوں نظر آیا جیسے میرے سامنے فرش پہ ایک انسانی جسم سفید چادر میں لپٹا ہُوا ہے۔ میں چھلانگ لگا کر باہر نکلنے لگا تو کمرے کے سارے دروازے کھٹا کھٹ بند ہو گئے۔ چھت پر باجا سا بجنے لگا، جس میں ڈھول،

طبلہ اور شہنائی کے ساز خاص طور پر نمایاں تھے۔ باہر برآمدے میں یُوں سنائی دیتا تھا، جیسے بڑے بڑے شہ زور گھوڑے پکے فرش پر سرپٹ بھاگ رہے ہوں۔ گھپ اندھیرے میں مَیں نے ایک دروازے کو زور سے کھولنے کی کوشش کی تو ساری چوکھٹ اکھڑ کر دھڑام سے زمین پر آگری۔ مَیں لپک کر برآمدے میں آگیا۔ یکایک اکھڑی ہُوئی چوکھٹ اپنی جگہ پر ایستادہ ہوگئی۔ کھٹ کھٹ کرکے کمرے کے سارے دروازے اور کھڑکیاں کھل گئے۔

اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے، مَیں بڑی بے صبری سے رمضان کا انتظار کرنے لگا کہ وہ کھانا لے کر آئے تو مجھے گوشت پوست کا ایک جیتا جاگتا انسان نظر آئے۔

جب کافی دیر تک رمضان نہ آیا تو مَیں نے اپنے ڈرائیور کو آواز دے کر کہا کہ وہ رمضان کو بلا لائے۔ ڈرائیور بھی باورچی خانہ میں جاکر غائب ہوگیا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد مَیں خود وہاں گیا۔ باورچی خانہ خالی تھا۔ چولہے میں آگ بجھی ہُوئی تھی۔ دروازے کے پاس رمضان خاموش پڑا تھا۔ اس کے نزدیک ڈرائیور بھی دُنیا ومافیہا سے بے خبر لیٹا ہُوا تھا۔ مَیں نے ان کے مُنہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تو وہ دونوں جمائیاں لے کر اُٹھ بیٹھے۔ جیسے ابھی طویل نیند سے بیدار ہُوئے ہوں۔ رمضان نے اپنی گھڑی دیکھی، ساڑھے نو بجے کا عمل تھا۔

"اوہو صاحب اتنی دیر ہوگئی۔" اس نے معذرت طلب آواز میں کہا "ابھی تک کھانا بھی تیار نہیں ہُوا۔"

پھر اس نے زیرِ لب جملہ اہلِ ہنود کو چند گالیاں دیں جو کالے جادو کا عمل کرکے بیچارے مسلمانوں کو خواہ مخواہ پریشان کر رہے تھے۔

رمضان نے جلدی جلدی دو انڈوں کا آملیٹ بنایا۔ مَیں نے آملیٹ کا ایک ٹکڑا کاٹا تو اس میں سے گاڑھے گاڑھے خون کی دھار سی بہہ نکلی۔ یوں بھی آملیٹ سڑی بساندی مچھلی کی طرح بدبودار مردار سا ہوگیا۔ مَیں نے جلدی جلدی اس سڑاند چھوڑتی شئے کو کاغذ

میں لپیٹ کر باہر پھینک دیا۔ اگر کہیں غلطی سے رمضان کو پتہ لگ جاتا تو ہندوؤں کے کالے علم کا یہ کرشمہ دیکھ کر اس کے تن بدن کی ساری اسلامی رگیں بُری طرح دکھنے لگتیں۔

لیکن میری کوشش کے باوجود اس کالے علم نے بہت جلد رمضان کے دل و دماغ پر پوری طرح تسلط جما لیا۔ مَیں نے اُسے اسٹور روم میں بھیجا کہ وہ میرا گراموفون اور کچھ ریکارڈ نکال لائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پسینے میں شرابور واپس آیا اور رونی صورت بنا کر بولا۔ "صاحب کوئی حرامزادہ اسٹور میں گھسا بیٹھا ہے اور دروازہ کھولنے نہیں دیتا۔"

مَیں رمضان کے ساتھ اسٹور روم گیا اور اس کے دروازے کو دھکا دیا۔ کواڑ تھوڑا سا کھلا، پھر غلیل کے ربڑ کی طرح زنّاٹے کے ساتھ واپس گھوم کر بند ہوگیا۔ ہم دونوں نے کواڑ کے ساتھ کندھے لگا کر زور سے دھکیلا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شئے اندر سے پُوری قوت کے ساتھ دروازے کو بند رکھنے پر تُلی ہُوئی ہے۔ یکایک رمضان کو ایک ترکیب سوجھی۔ وہ چاروں شانے چت زمین پر لیٹ گیا اور اپنے دونوں پاؤں دروازے کے ساتھ ملا کر پُورے زور کے ساتھ اسے دھکیلنے لگا۔ دروازہ چٹاخ سے کھل گیا اور رمضان اسی طرح لیٹا ہُوا تیز رفتاری کے ساتھ اندر گھسٹتا چلا گیا یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اسے ٹانگوں سے پکڑ کر بُری طرح گھسیٹ رہا ہے۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا۔ مَیں نے بجلی جلائی تو رمضان اُٹھ کر کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ اس کا پیٹ اور کہنیاں بُری طرح چھل گئی تھیں اور کپڑوں پر جابجا خون کے دھبّے پڑے ہُوئے تھے۔

رمضان لنگڑاتا ہُوا خاموشی سے باہر چلا گیا۔ مَیں نے گراموفون اور چند ریکارڈ اٹھائے اور ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔ اتنے میں میرا ڈرائیور اندر آیا اور بولا "صاحب رمضان گاڑی میں باہر جانا چاہتا ہے، لے جاؤں؟"

"کہاں جائے گا؟" مَیں نے پوچھا۔

"شاید شہر جائے گا صاحب"۔

"لے جاؤ" مَیں نے کہا "جلدی واپس آنا"۔

رات کے اندھیرے میں جب میری موٹر کمپونڈ سے باہر نکلی، تو اس کی پچھلی سُرخ بتیاں دُور تک نظر آتی رہیں۔ سُرخ روشنی کو دیکھتا رہا۔ جب کار کی بتیاں نظر سے اُوجھل ہوگئیں تو پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر ایک ہلکا سا ہاتھ رکھ دیا۔ مَیں اُچک کر پیچھے مڑا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ مگر اس غیر مرئی لمس کی جھنجھناہٹ بہت دیر تک میرے رگ و پے میں سرسراتی رہی۔ ماحول کی اس گورستانی کیفیت کو توڑنے کے لیے مَیں نے سہگل کا ایک پسندیدہ ریکارڈ گراموفون پر رکھ دیا اور چابی دینے کے لیے باجے کی کُنجی کو گھمایا۔ چابی لگنے کی بجائے بڑی سرعت کے ساتھ الٹی طرف گھومنے لگی۔ مَیں نے سوچا شاید چابی پہلے ہی سے پوری طرح چڑھی ہُوئی ہے۔ چنانچہ مَیں نے سُوئی بدل کر ساؤنڈ بکس کو ریکارڈ پر رکھ کے چلا دیا۔ ریکارڈ میں سے پہلے ایک ننھے سے بچّے کے رونے کی آواز آئی۔ پھر کسی عورت کی سِسکیاں سُنائی دینے لگیں۔ اور پھر گویا ایک بھونچال سا آگیا۔ ریکارڈ میں بھیانک آوازیں آنے لگیں۔ جیسے بہت سارے گلے بیک وقت بے دردی سے گھونٹے جا رہے ہُوں۔ یوں بھی سارے کمرے میں ایک خوفناک سا ارتعاش چھا گیا اور کھڑکیوں اور دروازوں میں بیسیوں سنکھ بجنے لگے۔ ان ناقوسوں کی آواز ویسی ہی تھی جیسی ہندو ارتھیوں کے ساتھ سنکھ پھونکنے پر برآمد ہوتی ہے۔ بجلی کی روشنی مدھم ہوتے ہوتے موم بتی کی طرح ہلکی ہوگئی اور دھیمی دھیمی روشنی میں سُرخ سُرخ انگارے سے تیرنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے میرے گرد و پیش بہت سی لاشیں چڑچڑ جل رہی ہُوں۔

شمشان بھومی کے یہ وحشت ناک لمحے بے حد طویل ہوگئے، اور صدیاں گزرنے کے بعد جب میری کار کی تیز تیز روشنی دوبارہ کھڑکی پر پڑی تو مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے سارے مکان کو تیز تیز شعلوں نے اپنی آغوش میں لپیٹ لیا ہے۔ رمضان لنگڑاتا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک سفید ریش بزرگ تھے۔ جنھوں نے سبز منکوں کی تسبیح گلے میں ڈالی ہُوئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں موٹا سا عصا تھا اور سر پر درویشوں والی چوگوشہ ٹوپی تھی۔

یہ درویش حاجی علی اکبر ناقوس تھے۔ حاجی صاحب کٹک کی جامع مسجد کے خطیب تھے اور ایک خوش بیان شاعر ہونے کے علاوہ ان کی نیکی اور پارسائی کا بھی بہت چرچا تھا۔

گراموفون بدستور آہ و فغاں میں مصروف تھا۔ اور سنکھوں کی جگر چاک کرنے والی آواز سرنگ میں چیخوں کی طرح گونج رہی تھی۔ حاجی اکبر ناقوس چند ساعت دم بخود کھڑے رہے پھر انھوں نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کے گراموفون کے ساؤنڈ باکس پر رکھ دیا۔ ساؤنڈ باکس زخمی ٹانگ کی طرح لڑکھڑایا۔ ایک دو ثانیہ کے لیے اس میں سے کھڑکھڑ کی آواز آئی اور پھر ریکارڈ میں سہگل کی اپنی آواز "اک بنگلہ بنے نیارا" گانے لگی۔ حاجی علی اکبر ناقوس مسکراتے اور اپنی جیب سے تسبیح نکال کر فرش پر دو زانوں بیٹھ گئے۔ مَیں نے گراموفون بند کرکے ایک طرف رکھ دیا۔ ساؤنڈ باکس پر دھرا ہُوا کاغذ اٹھا کر دیکھا تو اس پر کلمہ طیبہ لکھا ہُوا تھا۔

گراموفون تو ٹھیک ہوگیا لیکن سنکھوں اور ناقوسوں کی آواز اب کچھ اور بھی شدید ہوگئی۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ یہ آوازیں گونجتی جیسے طوفان میں سمندر کی بڑی بڑی لہریں ساحل سے ٹکرا کر گرجتی ہیں۔

حاجی علی اکبر ناقوس آنکھیں بند کرکے تسبیح پھیرنے لگے۔ رمضان بھی پاس ہی

مؤدب بیٹھ گیا اور اپنی جیب سے دُعائے گنج العرش نکال کر ورد کرنے لگا۔ جوں جوں حاجی صاحب کا مراقبہ عمیق ہوتا گیا، چاروں طرف گونجتی ہوئی آوازوں میں ایک نامعلوم سی تسکین پیدا ہونے لگی۔ جیسے آگ کے تیز تیز شعلوں پہ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہو۔ پھر رفتہ رفتہ یہ پھوار بڑھی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ساری خوفناک آوازیں ایک لمبی سی سسکی میں سائیں سائیں کرنے لگیں۔ ہوتے ہوتے یہ سائیں سائیں بھی فضا میں تحلیل ہوتی گئیں اور اس کی آواز چھجوں سے گزرنے والی بوندوں کی ٹپ ٹپ میں تبدیل ہو گئی۔ پھر یکایک ایک چھناکا سا ہوا اور سارے ماحول پر سناٹا سا چھا گیا۔ اس سناٹے میں ایک اُونچی سی تان اُٹھی اور غٹ غٹ کر کے سارے کمرے میں بوتل کے پانی کی طرح بھر گئی۔ دُھند اور غبار کا ایک ریلا سا آیا اور مکان کی اینٹ اینٹ سے بے حد خوش الحان قرأت میں اذان کی صدا آنے لگی۔ یہ اذان مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیل گئی اور اس کی بلند آہنگی اور خوش الحان قرأت میں اذان کی صدا آنے لگی۔ یہ اذان مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیل گئی اور اس کی بلند آہنگی اور خوش الحانی سارے عالم پہ ایک زرکار شامیانے کی طرح چھا گئی۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک روز میں سری ہری کشن مہتاب کے پاس بیٹھا تھا۔ انھوں نے ہنس کر پوچھا۔ سنائیے نئے مکان میں کبھی بھوت پریت سے سابقہ تو نہیں پڑا؟

"بھوت پریت تو عورتوں اور بچوں پر زیادہ اُترتے ہیں۔" میں نے مذاق میں بات ٹالنے کی کوشش کی۔ "میں اکیلا رہتا ہوں میرے پاس بھلا وہ کیا کرنے آئیں گے۔"

"تعجب" وزیرِ اعلیٰ نے کہا "اس مکان میں جو رُوح آتی ہے وہ ایک جوان اور خوبصورت لڑکی کی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ تم میں ضرور دلچسپی لے گی۔"

"وہ لڑکی کون تھی؟" میں نے استعجاباً پوچھا۔

مہتاب صاحب نے اپنی دودھ جیسی سفید کھدر کی ٹوپی سر سے اتار کر میز پر رکھ

دی۔ ان کے چہرے پر کہانیاں سنانے والی بوڑھی دادیوں اور نانیوں والا موڈ طاری ہو گیا۔ وہ آلتی پالتی مار کر کرسی پہ بیٹھ گئے اور بولے کوئی تیس برس قبل اس کوٹھی میں ایک انگریز افسر رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک طرحدار آیا تھی۔ آیا کا نام سوشیلا تھا۔ سوشیلا بڑی خوبصورت اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ اور خوب بن سنور کے رہا کرتی تھی۔ انگریز افسر کا دل سوشیلا پر بُری طرح آ گیا۔ اور اس نے شادی کا چکمہ دے کر اس پری کو شیشے میں اُتار لیا اور سوشیلا نے اس انگریز کو اپنا دیوتا سمجھ کر اس کی خوب خدمت کی۔ ایک روز جب اس نے شرمیلی دلہنوں کی طرح یہ راز افشا کیا کہ وہ عنقریب ہی ماں بننے والی ہے، تو صاحب بہادر کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس نے راتوں رات سوشیلا کا گلا گھونٹ کر اُسے مار ڈالا جب سوشیلا کا گلا گھونٹا جا رہا تھا تو عین اسی وقت اس کے بطن سے ایک مردہ بچی پیدا ہوئی۔ انگریز افسر نے ان دونوں لاشوں کو اسی کوٹھڑی کے کسی کونے میں دبا دیا۔ کہتے ہیں کہ اس روز سے بیچاری سوشیلا کی رُوح اپنی بچی کی لاش اُٹھائے اس کوٹھی میں بھٹک رہی ہے۔"

"اس انگریز افسر کا کیا بنا؟" میں نے پوچھا۔

وہ زمانہ خالص انگریزی راج کا تھا۔" مہتاب صاحب نے ایک ممتاز کانگریسی لیڈر کی تلخی سے کہا "وہ افسر اس کٹک کا کمشنر بھی بنا۔ اسے بہت سے خطابات بھی ملے اور ولایت میں وہ آج بھی بڑی شان سے زندہ ہے۔"

اقبالؔ کی فریاد

آزادی سے قبل تو خیر دوسری بات تھی۔ لیکن اب اللہ کے فضل و کرم سے آپ کو پاکستان مل گیا ہے تو اب ذرا مجھے بھی دم لینے دیجیے۔ شکایت کرنا تو مومن کی شان کے خلاف ہے لیکن جس بے دردی سے آپ میرا پیچھا فرما رہے ہیں۔ اس میں میرے اور میری شاعری دونوں کے لیے بڑی عبرت کی نشانیاں ہیں۔

جلسے جلوس میں گڑبڑ کا احتمال ہو تو اس کی روک تھام کے لیے اقبال کا شعر۔ دھوّاں دھار تقریر میں سانس پھولنے لگے تو دم لینے کے لیے اقبال کا شعر۔ رسالوں میں بچی کھچی جگہ پُر کرنے کے لیے اقبال کا شعر۔ ریڈیو میں فالتو لمحات گزارنے کے لیے اقبال کا شعر۔ گرمیٔ گفتار ہو یا گالی گلوچ، نصیحت ہو یا فصیحت، وقت بے وقت، جگہ بے جگہ میرے غریب اشعار کا حلیہ بُری طرح بگاڑا جاتا ہے۔ خوشامد اور چاپلوسی ہو تو طائرِ لاہوتی کا بیان ہوتا ہے۔ فرعونیت میں اسرارِ خودی فاش کیے جاتے ہیں۔ شراب اور رباب میں رموزِ بے خودی کی تلاش ہوتی ہے۔ چندے کے وقت شاہین بچوں کے بال و پر

اچھالے جاتے ہیں۔ چور بازاروں میں دہقان کی بردزی اور خوشۂ گندم کی داستان چلتی ہے۔ دن کے وقت تعدیرِ امم اور شمشیر و سناں کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ رات کے وقت طاؤس و رباب کی باری آتی ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ آہِ سحر میرے لیے تبرکاً چھوڑ دی جاتی ہے۔ اور اللہ کا نام ساقی کے سپرد ہوتا ہے۔ ورنہ خدا جانے ان دو زمینوں میں بھی کیا کیا گُل کھلائے جاتے۔ سینما والے اپنے اشتہاروں میں "ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ" کی تلقین فرماتے ہیں۔ ایک آملہ ہیر آئیل والے نے تیل کی بوتلوں پر "گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر" کے لیبل چسپاں کر رکھے ہیں۔ ایک خاندانی حکیم صاحب اپنی مقویات اور میرے کے سرموں کی بدولت میرا عشق میری نظر بخش دینے کے دعویدار ہیں الیکشنوں میں خاص طور پر میرے قلب و نظر اور عشق و خرد کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے اور رفاہِ عام کی بہت سی انجمنیں قبر کے کتبوں کے لیے میرے اشعار بلا معاوضہ منتخب کرنے کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ میرے خاص کرم فرماؤں میں قوالوں اور ریڈیو والوں کا درجہ بہت بلند ہے۔ اگر ان اصحاب کی کوششیں بار آور ہوئیں تو عجب نہیں کہ بہت جلد میرے کلام کو پاکستان سے ہجرت کی سعادت نصیب ہو جائے۔ یہ وہ سُنّتِ نبویؐ ہے جو میں جیتے جی خود نہ نبھا سکا۔ لیکن اگر میرے پرستاروں کی اعانت سے میرے کام کو یہ درجہ اب مل سکتا ہے تو زہے نصیب۔ دراصل سچ تو یہ ہے کہ فی زمانہ آپ میری شاعری میں کچھ اس طرح اُلجھ گئے ہیں کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ ایک فیشن ہے چھوڑ دیئے تو مشکل نہ چھوڑیئے تو مشکل۔ لیکن اگر قوالوں اور ریڈیو والوں کی برکت سے میرا کلام اُٹھ گیا تو ہم خرما و ہم ثواب والی بات ہوگی۔ یعنی بیٹھے بٹھائے مفت میں آپ کا پیچھا بھی چھوٹ جائے گا اور مجھے بھی کچھ دم لینے کی مہلت نصیب ہوگی۔

قوالوں کا دستور تھا کہ وہ عموماً فارسی پر اپنی نظرِ عنایت رکھتے تھے۔ اُردو میں ان کا زور نظیر اکبر آبادی کے خمسوں اور حالیؔ کے مسدس کے علاوہ اور کسی چیز پر زیادہ

نہیں چلا۔ لیکن جوں ہی اس فقیر سے شاعری کا گناہ سرزد ہوا اُن کی ساری توجہ ایک طوفان کی طرح میری طرف اُمڈ آئی۔ اب یہ حالت ہے کہ "شکوہ اور جواب شکوہ" کے علاوہ میری دوسری معصوم نظموں کو بھی سُر تال، تلفظ اور گلے کے ایسے پیچ و خم میں سے گزارا جاتا ہے کہ ان کی صُورت مسخ ہو کر کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ یُوں تو قوالیاں عام طور پر اولیائے کرام کے مزاروں پہ ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مجھے درجۂ ولایت عطا نہیں ہُوا اس لیے اس فقیر کی قبر قوالوں کی دسترس سے محفوظ ہے۔ لیکن اب یہ نیا گل کھلا کر قبر کی جگہ اس غریب کے نام پر قوالیوں کا دستور زور پکڑنے لگا ہے۔ چنانچہ جب شادی بیاہ یا جہلم کی رسوم کا بہانہ نہ ہو تو پُر تکلف دعوتوں کے بعد محض "شوقیہ" "اقبال کی قوالیوں" سے جی بہلایا جاتا ہے۔ اُمید تھی کہ شاید مشاعرے اس رسم کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن مملکتِ خداداد میں قوالوں کی تعداد کسی عنوان شاعروں سے کم نہیں ہے اس لیے یہ دونوں مشاغل یکساں رفتار سے جاری ہیں۔

خدا کے فضل سے قوالیوں اور ریڈیو میں کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ جب کہیں قوالی ہو رہی ہو تو ریڈیو کا گمان ہوتا ہے اور ریڈیو چل رہا ہو تو قوالی کا رنگ جم جاتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ریڈیو والوں نے میری عزّت افزائی کے لیے اور بھی بہت سے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ فلمی گانوں کا فرمائشی پروگرام وقت مقررہ سے ایک آدھ منٹ پہلے ختم ہو جائے تو عموماً "اقبال کا ایک شعر" کام آتا ہے۔ اگر عین موقع پہ کوئی مقرر حاضر نہ ہو سکے تو تقریر کا موضوع خواہ "کیمیائی کھاد" ہو یا "پاکستانی کھالیں" اس کی جگہ بڑی بے تکلفی سے "اقبالؔ سے ایک ملاقات" یا "اقبالؔ کا فلسفہ خودی" رکھ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ کی دُنیا میں اقبالؔ کے ملاقاتیوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ بلکہ جُوں جُوں وقت گزرتا جاتا ہے، ان کی تعداد میں کچھ اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اور خدا کے فضل سے میرے فلسفہ خودی کے ماہرین کا فیض بھی بڑا عام ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ

ادھر یہ تقریریں شروع ہوئیں، ادھر ریڈیو کے شائقین نے سُوئی گھما کر دوسرے اسٹیشنوں کی راہ لی۔ اللہ اللہ ایک زمانہ تھا کہ میرا کلام سُننے کے لیے لوگ عید کے چاند کی طرح انتظار کرتے تھے۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسے مجھے ابھی تک یاد ہیں اور مَیں قیامت تک جامع مسجد لاہور کا وہ سماں بھی نہیں بھول سکتا جب نماز جمعہ کے بعد مَیں نے حضورؐ رسالت مآبؐ میں جنگِ طرابلس والی نظم پڑھی تھی۔ آپ کو غالباً یاد ہو گا کہ ایک بار مَیں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی تھی کہ میرا نورِ بصیرت عام کر دے۔ شاید یہ اسی دعا کا اثر ہے کہ اب کراچی ہو ڈھاکہ، لاہور ہو یا پشاور صبح ہو یا شام ریڈیو کا بٹن دبا دیتے، کسی نہ کسی جگہ سے ہر وقت اقبال کا کلام نشر ہو رہا ہے۔ کہیں گلدستہ باقیؔ ہے کہیں سلطانہ جان یا دائم علی یا حاتم خان ہے کہیں شرافت علی، ظرافت علی اور ان کے ہمنوا ہیں۔ کبھی یہ گمان گزرتا ہے کہ درویشوں کی ٹولی گا گا کر بھیک مانگ رہی ہے۔ کبھی رونے کی ریہرسل کا شبہ ہوتا ہے۔ کبھی مرثیہ خوانی کا سماں بندھتا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اکثر لوگ اقبالؔ کے کلام کا اعلان سُنتے ہی ریڈیو کی سُوئی گھما دیتے ہیں۔ ورنہ جس نے ایک بار دل لگا کر ان راگنیوں کو سُنا وہ ہمیشہ کے لیے ان نظموں کو کتابی صُورت میں پڑھنے سے بھی بیزار ہو گیا۔

اکثر اشتہار بازوں، قوالوں اور ریڈیو والوں کی مساعیِ جمیلہ کے باوجود خدانخواستہ میرے نام یا کلام کا کچھ حصّہ سلامت بچ گیا تو رہی سہی کسر نکالنے کے لیے بزرگوں کی ایک جماعت بھی خدمت کے لیے تیار ہے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو میرے ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے، جن کی صحبت میں مَیں نے گناہ و ثواب، عقل و عشق، خودی و بے خودی کی بے شمار منزلیں طے کی تھیں اور جن کے سینے میں ابھی تک میرے غیر مطبوعہ اشعار کے گنجہائے گراں مایہ محفوظ ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے اکثر حضرات ایسے ہیں جن سے اس خاکسار کو کبھی ملاقات کا شرف بھی حاصل نہ ہُوا تھا۔ لیکن اب جس وثوق سے میری زندگی کے رازہائے سربستہ فاش کرنے میں مشغول ہیں اسے دیکھ کر کبھی تو مجھے اپنے

متعلق شبہ ہونے لگتا ہے۔ بچارے منکر نکیر الگ پریشان ہیں کہ یہ کیسا شخص تھا جس کے اعمال خود ہماری نظر سے بھی پوشیدہ رہے۔ چنانچہ اب یہ معمول ہو گیا ہے کہ کسی صاحب نے گفتگو کا یُوں آغاز کیا کہ "ایک روز جب میں حضرت علامہؒ مرحوم کی خدمت میں حاضر تھا . . . . اس گنہگار کے اعمال نامے کی از سرِ نو جانچ پڑتال ہونے لگی۔ پہلے مرنا غالبؔ بھی بہت ناراض تھے کہ یہ دُنیا والے بڑے بے حیا ہیں۔ ان کے ذاتی اور نجی خطوط تک کو اٹھا کر چھاپ ڈالا لیکن جب مَیں نے اپنے خطوط کا حشر ان سے گوش گزار کیا تو وہ مُسکرانے اور فرمانے لگے "میاں اقبالؔ غم نہ کرو، یہ بڑے دل گردے والی اُمّت ہے جس نے اللہ کے رسُولؐ پر بھی بے شمار الٹی سیدھی حدیثیں ایجاد کرنے سے پرہیز نہیں کیا، وہ بھلا تمھارے جیسے خاکپائے رسُولؐ کو کہاں چھوڑتی۔ ہائے، حقیقت خرافات میں کھو گئی۔ یہ اُمّت روایات میں کھو گئی"

اب رہا اقبال ڈے کا معاملہ۔ یہ رسم میری زندگی ہی میں شروع ہو گئی تھی لیکن اب مَیں دیکھتا ہوں کہ زمانے کے انداز بدل گئے۔ اقبالؔ ڈے پر بیچارے اقبالؔ کے سوا ہر چیز کا خوب اہتمام کیا ہوتا ہے۔ سیاست دانوں، طالب علموں، ادیبوں اور تاجروں کی ہر پارٹی اپنی اپنی پالی الگ جماتی ہے۔ سیاست دان دھواں دار تقریریں کرتے ہیں کہ سند رہیں اور بوقتِ انتخاب کام آئیں۔ طالب علم امتحانات ملتوی کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ادیب ایک دوسرے کی پگڑی اُچھالنے کا مشغلہ سنبھالتے ہیں اور تاجر لوگ امپورٹ ایکسپورٹ لائسنسوں کی مشکلات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ سرکاری درباروں میں بھی بڑے ٹھٹتے کے انتظامات ہوتے ہیں اور افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں پر محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ غربا پارکوں اور باغیچوں میں جلسے منعقد کرتے ہیں کھانے پینے کے شوقین ٹی پارٹیاں رچاتے ہیں۔ کہیں کہیں مشاعرہ بھی ہوتا ہے اور میرے دیرینہ کرم فرما ریڈیو والوں کے دم قدم سے نظم خوانی اور قوالیوں کا رنگ بھی خوب جمتا

ہے۔ اگر گاہے گاہے میں فی سبیل اللہ کچھ توجہ میری طرف بھی منعطف ہوتی ہے تو کبھی محمود کا اقبال سامنے آتا ہے۔ کبھی ایاز کا۔ کبھی بندے کا اقبال ظاہر ہوتا ہے کبھی بندہ نواز کا۔ لیکن بیچارے مومن کے اقبال کو کوئی نہیں پوچھتا۔ کہ جس کے لیے میرے دیدۂ تر کی بےخوابیاں، میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں۔ میرے نالۂ نیم شب کا نیاز، میری خلوت و انجمن کا گداز، اُمنگیں، میری آرزوئیں، میری اُمیدیں، میری جستجوئیں ہمیشہ ہمیشہ بیقرار رہتی تھیں۔

اگرچہ عالم بالا میں اقبال ڈے منانے کا رواج نہیں۔ لیکن رضوان کی مہربانی سے اس روز ہم سب کو چھٹی ضرور عطا ہوتی ہے۔ معلوم نہیں آپ کے ہاں کیا دستور ہے؟"

آثارِ قدیمہ

آج سے کوئی ایک ہزار سال کے بعد جب دُنیا میں ایٹم یعنی ذرۂ عظیم کا دور دورہ ہوگا۔ اور ماہرین آثارِ قدیمہ بیسویں صدی کے متعلق چھان بین کریں گے تو اُمید ہے کہ ان کے تاثرات کچھ مندرجہ ذیل قسم کے ہوں گے۔

ادیب:

کچھ کھوپڑیاں ایسی ملی ہیں جن سے اس نظریے کی وضاحت ہوتی ہے کہ اُس زمانے میں ایک قوم بنام ادیب بھی آباد تھی۔ کھوپڑیوں کی مدد سے اس قوم کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچانا مشکل امر ہے کیونکہ کچھ کھوپڑیاں الٹی ہیں اور کچھ سیدھی۔ البتہ دیگر مثالوں کی بنا پر اس کے بہت سے کوائف تحقیق ہو چکے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسل کئی شاخوں میں بٹی ہوئی تھی۔ شاعر، افسانہ نویس، نقاد، مقالہ نگار، یہ چار بڑی شاخیں تھیں۔ ان میں بھی بہت سے فرقوں کا اپنا اپنا

الگ مسلک تھا۔ ترقی پسند، غزل گو، بے قافیہ و بے ردیف، بے سر و پا، مبہم وغیرہ وغیرہ آپس میں جوتی پیزار کے علاوہ ان کا دوسرا محبوب مشغلہ عورت تھی۔ جیسا کہ ہم کسی اور جگہ بیان کر چکے ہیں۔ ایامِ جہالت میں عورت ایک مشہور مخلوق تھی۔ اسے جنسِ لطیف کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا لیکن اس کا اصل مقصد نسلِ انسانی کی بقا کا کام تھا۔ یہ کام آج کل ہماری حکومت میں ایٹمی شعاعوں سے لیا جاتا ہے۔

نسلِ انسانی کی بقا کے علاوہ عورت کو اور بھی بہت سی باتوں کی لت تھی مثلاً شاعروں، افسانہ نویسوں اور مصوروں پر سوار ہونا۔ اس زمانے کا ایک شعر ہے ؎

ہند کے شاعر و صُورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ایک دوسرے بیان کے مطابق معاملہ اس کے برعکس تھا۔ لیکن اس بیان کی ابھی تک تصدیق نہیں ہو سکی۔

ادیبوں پہ سوار ہونے کے علاوہ عورت نامی صنف کا ایک اور مشغلہ حُسن تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ اس مشغلہ کی اصلی نوعیت کیا تھی۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ حسن کا عشق سے گہرا لگاؤ تھا۔ جیسا کہ آپ امراضِ دیوانگی کے سلسلہ میں سُن چکے ہیں۔ عشق ایک خطرناک متعدی مرض تھا جو دل میں فسادِ خون اور دماغ میں خلل کی وجہ سے پیدا ہوتا تھا۔ اس زمانے کے انسانوں میں دِل سینے کے بائیں طرف گوشت کے ایک لوتھڑے کا نام تھا جہاں اب ہم نے برقی ڈائنمو لگائے ہُوئے ہیں اور دماغ کی جائے وقوع کھوپڑی کے نیچے تھی، جہاں اب ضرورت کے لحاظ سے مختلف کینڈل پاور کے قمقمے آویزاں کیے جاتے ہیں۔ قیاس ہے کہ جس طرح چوہوں سے پلیگ اور مکھیوں سے ہیضے کے جراثیم پھیلتے تھے۔ اسی طرح عورت سے عشق کی وبا پھُوٹتی تھی۔ چونکہ قوم ادیب عورت کی پیرو تھی اس لیے یہ مرض اس قوم میں بڑی شدت سے پایا جاتا تھا۔

اس قوم کے دو مشہور فرقوں یعنی رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں کے بہت سے حالات دستیاب ہو چکے ہیں۔ رجعت پسندوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہنسنے سے زیادہ رونے، سونے سے زیادہ جاگنے اور مکانوں کی جگہ سایۂ دیوار کے شوقین تھے۔ تارے گننا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ گلیوں میں دو ٹانگوں کی بجائے سر کے بل چلتے تھے۔ اور قالینوں کی جگہ آنکھیں بچھانے کے عادی تھے۔ کپڑے وہ کبھی پہنتے تھے، کبھی پھاڑ ڈالتے تھے۔ اور ان کی خوراک میں دِل، جگر، خون، زہر، شراب، شربت اور انواع و اقسام کی گالیاں شامل تھیں۔

اس کے برعکس ترقی پسند نہ ہنستے تھے، نہ روتے تھے، نہ سوتے تھے، نہ جاگتے تھے، نہ کھاتے نہ پیتے تھے۔ البتہ ان میں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ وہ کیا لکھتے تھے۔ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتے تھے چنانچہ اسی وجہ سے انھیں ترقی پسند کہا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے ان کا وجود ارتقائے انسانی میں ایک اہم سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ دل و دماغ، عقل و فہم، ہوش و حواس کے بُت توڑ ڈالے اور انسان کے ذہن کو روایتی قیود سے آزاد کیا۔

رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں میں صرف ایک مشابہت تھی۔ وہ یہ کہ دونوں ایک دوسرے کو الٹا دیکھتے تھے۔ رجعت پسندوں کا دعویٰ تھا کہ ترقی پسند سیدھے نہیں اُوندھے ہیں۔ اور ترقی پسند رجعت پسندوں کے متعلق یہی نظریہ رکھتے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دونوں میں سے کس کا دعویٰ صحیح تھا۔ لیکن قیاس ہے کہ دونوں میں بہت سے لوگ سیدھے تھے، اور بہت سے اوندھے۔

ایڈیٹر:

بیسویں صدی کے حشرات الارض میں اخبارات کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ کیونکہ ان

کا کاٹا پانی تک نہ مانگتا تھا۔ اخباروں کو کاٹنے کا مرض ہی نہیں بلکہ جنون تھا سچ تو یہ ہے کہ ان کی زندگی کا دارومدار ہی اس فن پر تھا۔

جس طرح سانپ پالنے والے کو سپیرا اور ریچھ والے کو قلندر کہا جاتا تھا۔ اسی طرح اخبار والے کو ایڈیٹر کہتے تھے۔ ایڈیٹر کا کام یہ تھا کہ وہ موسم کے مطابق اخبارات کو پال پوس کر تیار رکھتا تھا تاکہ وقت آنے پر وہ کاٹنے کے فرائض بطریق احسن سرانجام دے سکیں۔ اس عمل میں کبھی کبھی ایڈیٹر خود بھی کٹ جاتے تھے لیکن جس طرح نیولے کو سانپ کے زہر کے متعلق جڑی بوٹیوں کا علم تھا۔ اسی طرح ایڈیٹروں کے پاس بھی اخبار کے کاٹے کا منتر موجود تھا چنانچہ وہ خود اس زہر سے کبھی نہیں مرتے تھے۔ ایڈیٹر کو کبوتروں کی طرح اخباروں کی خبر رسانی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کبوتر جو پیغام لے کر اُڑتے تھے اسے من وعن منزل مقصود تک پہنچا دیتے تھے۔ لیکن اخباروں کو رائی کا پربت اور سوئی کا بھالا بنانے میں کمال کی مہارت حاصل تھی۔

اخباروں کی خوراک گپ تھی۔ اور ایڈیٹر لوگ گڑبڑ پر گزارہ کرتے تھے۔ یہ خوراکیں ایام جہالت میں کثرت سے کاشت کی جاتی تھیں۔ لیکن جب سے ایٹمی شعاعوں نے کرۂ ارض کو منور کیا ہے، اخباروں اور ایڈیٹروں کے ساتھ ساتھ گپ اور گڑبڑ بھی ناپید ہوگئی ہے۔ بہت سی جستجو کے بعد اب تک ہمیں صرف دو ایڈیٹروں کے ڈھانچے ملے ہیں۔ ان میں یہ خصوصیت ہے کہ اگر انھیں پاس پاس رکھا جائے تو فوراً ایک دوسرے کی طرف پیٹھ موڑ لیتے ہیں۔ اور اگر انھیں ایک دوسرے سے دُور رکھا جائے تو وہ آپس میں سر جوڑ کر بیٹھنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ لوگ آپس میں ہنستے بولتے تھے تو بھی اتفاق رائے سے۔ اس لحاظ سے ان کا شمار بھی ترقی پسندوں میں ہونا چاہیے۔

ادیبوں اور ایڈیٹروں میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ جب ادیبوں کی صورت مسخ ہونے لگتی تھی تو وہ ایڈیٹر بن بیٹھتے تھے اور جب ایڈیٹروں کے چہرے بگڑتے

تھے تو وہ ادیب کہلاتے تھے۔

سیاست دان:

پہلے یہ خیال تھا کہ سیاست دان شاید اگالدان کی قسم کا کوئی ظرف ہوگا۔ لیکن اب یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے۔ دراصل وہ ساربان، کوچوان اور پہلوان کے زمرہ میں شامل تھے۔ جس طرح ساربان اور کوچوان اونٹ، گھوڑے، گدھے یا خچر کی نکیل تھامتے تھے۔ اسی طرح سیاست دان عوام کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پہلوانوں کی طرح دنگل فرمانا بھی آپ کا شیوہ تھا۔ گھوڑ دوڑ کی طرح سیاست دانوں کی دوڑ بھی ایک دلچسپ تماشہ ہوا کرتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ خدانخواستہ سیاست دان خود دوڑ لگاتے تھے، بلکہ وہ تو بس عوام کو دوڑانے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ہاں البتہ دنگلوں میں وہ خود بنفس نفیس اکھاڑوں میں اترا کرتے تھے اور بڑے گھمسان کا رن پڑتا تھا۔ کبھی قوم سیاست دان کی گردن پر اور کبھی سیاست دان قوم کی گردن پر۔ ووٹ ایک قسم کا ہتھیار تھا، جو ایسے موقعوں پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ووٹ کی ساخت غالباً اس بوٹ کی سی تھی جو اس زمانے میں پاؤں میں پہنا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی دنگلوں میں یہ دونوں یکساں چلتے تھے۔

سیاست دانوں کا ایک اور مشغلہ بیان بازی تھا۔ یہ اصل میں پتنگ بازی، بٹیر بازی کی قسم کا ایک فن تھا، جس میں کبھی کبھی باتوں ہی باتوں اور کھیل ہی کھیل میں ہاتھا پائی تک نوبت آجاتی تھی اور بڑے زوروں کی سر پھٹول ہوا کرتی تھی۔ جس وقت سیاست دان دنگا فساد میں مصروف نہ ہوں تو وہ سر راہے کیچڑ اور پگڑیاں اچھال کر اپنا جی بہلایا کرتے تھے۔

سیاست دان فکرِ معاش سے آزاد ہوتے تھے۔ بنی اسرائیل کے بعد یہی ایک قوم تھی جس پر آسمان سے من وسلویٰ نازل ہوتا تھا۔

اگرچہ آجکل یہ نسل ناپید ہے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ اس قوم کے چند بزرگ کسی طرح فرار ہو کر یاجوج ماجوج کی بستی میں روپوش ہو گئے ہیں۔ وہاں پھر انھوں نے ایک تازہ دستورِ اساسی مرتب کیا ہے جس کے مطابق وہ میدانِ حشر میں ایک جنرل الیکشن لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اے بنی اِسرائیل

تیسرے روز صبح سویرے ہی بیروت کا ساحل نظر آنے لگا۔

عرب طالب علم دوڑ دوڑ کر سب سے اُوپر والے عرشہ پر چڑھ گئے اور بڑی خوش الحانی سے اپنے قومی ترانے گانے لگے۔ فرانسیسی نرسوں کو خاص طور پر یہ گیت پسند آئے۔ غالباً وہ مجھ سے بھی پاکستان کا قومی ترانہ سُننے کی فرمائش کرنا چاہتی تھی۔ لیکن میں ان کا ارادہ بھانپ کر اِدھر اُدھر کھسک گیا۔ کیونکہ اپنے قومی ترانے کے الفاظ اگر مجھے یاد تھے تو دھن نبھانا میرے بس کی بات نہ تھی۔

جب جہاز بندرگاہ میں داخل ہُوا تو سب سے پہلے جو چیز نظر آئی وہ لوگوں کا ہجوم تھا جو ساحل پر کھڑے زور زور سے چیخ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور گردنوں کے خشمگیں اشارے ان کی آواز کا برابر ساتھ دے رہے تھے۔ دور سے معلوم ہوتا تھا کہ بلوہ ہو رہا ہے۔ نزدیک پہنچے تو گمان ہونے لگا کہ وہ لوگ جملہ جہاز والوں کو غصّے میں گالیاں دے رہے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد راز کھُلا کہ یہ لوگ بندرگاہ کے قُلی ہیں۔ اور آنے

والے مسافروں کو اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔

ساحل پر جابجا سُرخ ٹوپیاں نظر آتی تھیں جن پر تیل کی چکنائی اور مَیل نمایاں تھی۔ کپڑے بھی میلے کچیلے اور پھٹے پُرانے تھے۔ شور وغل، ریل پیل، دھکم دھکا عام تھی۔ اس دشت کو دیکھ کر بے ساختہ گھر کی یاد آتی تھی۔ پولیس کے سپاہی غیر معمولی طور پر موٹے تھے اور گرمی کی وجہ سے اپنی وردیوں سے بیزار۔ یہ سپاہی زیادہ تر ٹھیلوں یا کھمبوں کا سہارا لیے اُونگھ رہے تھے۔ جب بھی آنکھ کھلی تو یُوں ہی کسی کو دھکا دے کر کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے اپنے منصبی فرائض سے عہدہ برآ ہو رہے تھے۔

یہاں رومن کیتھولک پادریوں کی منزل آگئی تھی اور وہ اپنا سامان اتروا کر بادلِ نخواستہ فرانسیسی نرسوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ پہلے انھوں نے نرسوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دیر تک انھیں سہلایا۔ پھر بڑی بے صبری سے چٹاخ چٹاخ الوداعی بوسے لیے...... اگر دوسرے مسافروں اور قلیوں کی نگاہیں بُری طرح ان پر نہ جمی ہوتیں تو یہ بزرگ نرسوں کو اپنے مقدس سینوں سے ضرور چمٹا لیتے۔

پادریوں نے طوعًا و کرہًا جہاز چھوڑا اور کسٹم ہاؤس کے دروازے تک جاتے جاتے کئی بار فرانسیسی نرسوں کی طرف مڑ مڑ کر دیکھا۔ جواب اپنے ہینڈ بیگ کھول کر اپنے رخساروں کے پاؤڈر اور ہونٹوں کی لپ اسٹک کو از سرِ نو تازہ کرنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔ بوسے مقدس ہستیوں کے ہوں یا گنہگاروں کے، عورتوں کے پاؤڈر اور لپ اسٹک پر ان کا اثر ایک سا ہی ہوتا ہے۔

یہاں جہاز کو چند گھنٹوں کے لیے رُکنا تھا۔ مسافروں کو بیروت کا شہر دکھلانے کے لیے ایک ٹورسٹ ایجنسی نے بہت سی ٹیکسیوں کا بندوبست کیا ہُوا تھا۔ جیسی شاندار ٹیکسیاں یہاں نظر آ رہی تھیں، ویسی موٹر کاریں غالبًا یورپ کے بڑے شہروں کو بھی کم ہی نصیب ہوتی ہوں گی۔ فورڈ، شیورلے اور بیوک کے ماڈل عام تھے۔ کہیں کہیں کیڈی لک

کاریں بھی ٹیکسیوں کے طور پر چلتی نظر آتی تھیں۔ امریکہ کے بڑے بڑے شہروں کے بعد غالبًا بیروت ہی ایسا شہر ہے جس کی سڑکوں پر بیک وقت اس قدر نئی امریکی گاڑیاں چلتی ہیں۔

یُوں بھی بیروت کے چہرے مہرے پر کئی قسم کا بین الاقوامی رنگ و روغن چڑھا ہُوا ہے۔ زبان اور آداب میں یہ شہر فرانسیسی ہے۔ موٹروں کے ماڈل، بوشرٹوں کے ڈیزائن اور یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کے لحاظ سے امریکن ہے۔ ہوٹلوں کے کاروبار اور پُرفضا پہاڑی مقامات کی نسبت نہ صرف بیروت بلکہ سارا لبنان مشرقِ وسطیٰ کا سوئٹزرلینڈ ہے اور جیسا کہ میرے ایک لبنانی دوست مصطفےٰ الفخری نے مجھے ہالینڈ میں بتایا تھا بیروت کی نشاط گاہوں اور نائٹ کلبوں کو پیرس کی ہمسری کا بجا طور پر دعویٰ ہے چنانچہ بہت سے عرب شہزادے جو اپنے ملک یا اپنے محلات میں شراب پینے سے معذور ہیں۔ اپنے پرائیویٹ جہازوں میں جوق در جوق یہاں آتے ہیں اور راتوں رات دادِ عیش دے کر صبح سویرے اپنے فرائضِ منصبی پر واپس حاضر ہو جاتے ہیں۔ میری ٹیکسی کے ڈرائیور نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے وہ ہوٹل بھی دکھایا جس پر مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقاصہ سمیعہ جمال ٹھہری ہُوئی تھی۔ ہوٹل کے دروازے پر سمیعہ جمال کی بڑی تصویر آویزاں تھی۔ تصویر میں اس کے کھلے بال گھنگھور گھٹا کی طرح نظر آتے تھے۔ اور وہ اپنی بڑی بڑی غزالی آنکھوں سے باہر چوک کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جہاں ایک پولیس کانسٹیبل بڑی مستعدی سے ٹریفک کنٹرول کرنے میں مصروف تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بڑے جذبے سے مطلع کیا کہ اس چوک میں ہر تیس منٹ کے بعد ایک حادثہ ہوتا ہے۔ غالبًا یہ لمحہ بھی حادثے والا انتیسواں منٹ تھا۔ کیونکہ اچانک ہماری ٹیکسی نے پہلے ایک راہ گیر اور پھر بہ نفسِ نفیس خود چوک والے کانسٹیبل کو اپنی زد میں لینے کی سرتوڑ کوشش کی۔ بے چارہ راہ گیر تو کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ لیکن ٹریفک کانسٹیبل نے سیٹی بجا بجا کر ہمارا تعاقب کرنے کی تھوڑی بہت کوشش ضرور کی۔ لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے ایکسی لیٹر دبا کر رفتار اور بھی تیز

کر دی اور ہم خطرناک پہاڑی موڑوں کو کسی خاص معجزے کی مدد سے طے کرتے ہوئے ٹریفک کانسٹیبل اور سمیعہ جمال دونوں کی زد سے باہر نکل آئے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے معذرت کرتے ہوئے مجھے یقین دلایا کہ اس چوک میں ایسے حادثات کوئی خلافِ معمول چیز نہیں ہیں۔ سمیعہ جمال کی آنکھوں میں ایسا جادو ہے کہ راہ گیر ڈرائیور اور ٹریفک کانسٹیبل سب بیک وقت اسی کی طرف دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں اگر ٹریفک میں تصادم کے واقعات رونما نہ ہوں تو یہ انسان کی بڑی کور ذوقی ہوگی۔

بیروت کی سڑکوں پر حادثات کا ہونا کچھ سمیعہ جمال کی سحر کار آنکھوں ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ ہم جہاں کہیں بھی جاتے تھے مجھے یہی احساس ہوتا تھا کہ ہم مسلسل حادثے کی زد میں معلق ہیں۔ کھلی سڑکوں اور گنجان گلیوں میں ٹیکسی ایک ہی رفتار سے بھاگتی جا رہی تھی اور اس کی سپیڈ پینتیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے شاید ہی نیچے گرتی تھی۔

کوٹ پتلون والے راہ گیروں کے درمیان تو ٹیکسی بڑے اطمینان سے ہارن بجاتے ہوئے گزر جاتی۔ لیکن عباؤں والوں کے درمیان ڈرائیور متذبذب ہو جاتا۔ ڈرائیور نے وضاحت کی، بولا:

"پتلون والے راہ گیر کی ٹانگیں دُور سے واضح طور پر نظر آجاتی ہیں اور پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کدھر سے کدھر کو جا رہا ہے۔ اس کے برعکس عبا کے نیچے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ راہ گیر آگے کی طرف جا رہا ہے یا پیچھے کی طرف۔" مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ مغربی لباس کا یہ افادی پہلو اب تک میری نظر سے پوشیدہ تھا۔

امریکن یونیورسٹی کے قریب ایک فیشن ایبل ریستوران کے سامنے ٹیکسی روک کر ڈرائیور نے مجھے ہدایت کی کہ کوئی خوش مذاق سیاح اس ریستوران میں بیئر کا گلاس یا چائے کی پیالی نوش کیے بغیر بیروت سے واپس نہیں جاتا۔ اپنی سیاحت اور خوش مزاجی کی لاج رکھنے کے لیے میں نے بھی اندر جا کر چائے کا آرڈر دیا۔

ریستوران میں زیادہ تر لوگ غیر ملکی تھے اور غالباً وہ سب سیاح تھے اور اپنی ٹیکسیوں کے ڈرائیوروں کی ہدایات کے مطابق اپنی خوش مزاجی کی داد لینے آتے تھے۔

ایک نوجوان بیرے نے مجھے چائے لا کر دی۔ اس کی مونچھیں باریک اور تیکھی تھیں۔ سفید وردی میں ملبوس وہ کسی جاسوسی ناول کا ہیرو دکھائی دیتا تھا، جو بھیس بدل کر کسی گہرے راز کی تلاش میں ہوٹلوں کی ملازمت کر رہا ہو۔ چائے کا ٹرے میز پر رکھ کر وہ میرے پاس مؤدب کھڑا ہو گیا۔ اور فرنچ نما انگریزی میں بولا "آپ کون ہیں؟"

"میں پاکستانی ہوں۔"

"مرحبا مرحبا!" اُس نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اور آپ؟" میں اخلاقاً پوچھا۔

"الحمد للہ کہ میں مُسلمان ہوں۔"

بیرے کے اس بے ساختہ جواب نے مجھے چونکا دیا۔ عربوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سب سے پہلے عرب ہوتے ہیں۔ پھر شامی یا لبنانی یا عراقی یا مصری ہوتے ہیں اور اس کے بعد مُسلمان۔ لیکن تیکھی مونچھوں والا یہ نوجوان بیرا نہ صرف سب سے پہلے مسلمان تھا بلکہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر بغیر کسی حجاب کے خُدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا۔

"مجھے بھی مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہے۔" میں نے کہا۔

"الحمد للہ۔ الحمد للہ!" بیرے نے پھر خوشی سے اپنے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "آپ نے اخوان المسلمین کا نام سُنا ہے کیا۔؟"

"اخوان کو کون نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں بھی اس تحریک کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔" بیرے نے فخر سے کہا۔ "ہم ساری دُنیا کے مُسلمانوں کے بھائی اور خدمت گار ہیں۔"

"کیا آپ پاکستان کی فارن سروس میں ہیں؟" بیرے نے اچانک پوچھا۔

"جی نہیں،" مَیں نے کہا ——— "آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟"

"مشرقِ وسطیٰ میں جو سیاح آتے ہیں وہ اکثر سفارت خانوں کے افسر ہوتے ہیں یا وہ گرجوں کے پادری ہوتے ہیں، یا ان کا تعلق تیل کے چشموں سے ہوتا ہے۔" بیرے کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی آگئی۔ "سفارت خانوں سے وہ ہماری حکومتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گرجوں کے ذریعے وہ ہمارے دین میں دخل دیتے ہیں اور تیل کے چشموں سے وہ ہمارے پیٹ کنٹرول کرتے ہیں۔" پھر اس نے کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور گردن جھکا کر سرگوشی میں کہنے لگا۔ "ہم اخوان ایسے سیاحوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔"

باتوں ہی باتوں میں بیرے نے مجھے بتایا کہ اس ریستوران کا مالک ایک فلسطینی عیسائی ہے اور یہاں کام کرنے والا ہر بیرہ اسے پانچ سے چھ پونڈ تک ہر ہفتہ تنخواہ دیتا ہے۔

"بیرہ ریستوران کے مالک کو تنخواہ دیتا ہے؟" مَیں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ تو اُلٹی بات ہُوئی۔"

"یہاں یہ بات بالکل سیدھی ہے۔" بیرے نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ہمارا گزارہ محض گاہکوں کی بخشش پر ہے۔ امریکن سیاح بہت زیادہ ہیں۔ وہ ہمیں اچھا ٹپ دیتے ہیں۔ اور ہمیں اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ریستوران کے مالک کی نذر کرنا پڑتا ہے۔"

چائے ختم کر کے مَیں نے بل طلب کیا۔

"آپ میرے مہمان ہیں۔ آپ کا بل مَیں خود ادا کروں گا۔" بیرے نے بڑے خلوص سے کہا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ بیرے سے کہوں کہ بل نہیں تو مجھ سے کم از کم ٹپ ہی قبول کرے تاکہ ریستوران کے مالک کی تنخواہ میں کمی واقع نہ ہو۔ لیکن بیرے کی متانت

اور خلوص کے سامنے مجھے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

وہ مجھے باہر ٹیکسی تک چھوڑنے آیا۔

جب ٹیکسی روانہ ہُوئی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ مَیں ریستوران کے ایک بیرے سے نہیں، بلکہ دُنیا کے ایک بہت بڑے مفکّر سے مل کر آ رہا ہُوں۔ اس نوجوان بیرے میں ایک اچھے مبلّغ کی صداقت اور ایک سچّے مومن کی فراست کوٹ کوٹ کر بھری ہُوئی تھی۔ ایسے سادہ اور پُرکشش کردار مَیں نے بہت کم دیکھے تھے۔

بیروت کے مضافات میں جابجا چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کی آبادیاں پھیلی ہُوئی تھیں۔ ان میں فلسطین کے عرب مہاجر رہتے تھے۔ مہاجر کراچی میں ہوں یا بیروت میں۔ ان کے جھونپڑوں پر وہی کثافت اور چہروں پر وہی فلاکت برستی ہے۔ جس طرح کراچی میں، یہاں مہاجر بستیوں کے درمیان بڑی سرعت سے سیمنٹ کی بڑی بڑی عمارتیں بلند ہو رہی ہیں۔ بالکل اسی طرح بیروت میں بھی فلسطینی مہاجروں کے اردگرد بلند و بالا خوبصورت مکان تعمیر ہو رہے تھے اور چند امریکن سیاح جوان جھونپڑیوں اور مکانوں کی تصویریں اتار رہے تھے، بڑی گرمجوشی کے ساتھ عربوں کی سیاست پر بھی رائے زنی فرما رہے تھے۔

"خدا کی قسم"۔ ایک سیاح کہہ رہا تھا۔ "جس دن بھی ان جھونپڑے والوں نے اُٹھ کر ان خوبصورت عمارتوں کو جلانا شروع کر دیا، تب سے مشرقِ وسطیٰ میں کمیونزم کا غلبہ ہو جائے گا۔"

"بائی جو! تم میرے پالتو خرگوش کے بچّوں سے بھی زیادہ کوتاہ اندیش ہو۔" دوسرے سیاح نے اپنے ساتھی کو پیار سے گالی دی۔ "کمیونزم آگ لگنے کا انتظار نہیں کرتا۔ کمیونزم کا راستہ تو اسی روز ہموار ہو گیا تھا جب ان غلیظ جھونپڑوں کے درمیان ان معقول عمارتوں کی بنیاد رکھی گئی تھی۔"

”تم دونوں کُتیا کے بچے ہو“ تیسرے امریکن نے فیصلہ صادر کیا ”جب تک یہاں اِسلام کا جذبہ غالب رہے گا۔ کمیونزم کے آنے یا نہ آنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔“

اسلام کا یہ کارآمد جذبہ کئی رنگ سے غالب آتا ہے —— نزہہ کے پاس جو سگریٹ لائٹر تھا اس پر نقرئی حروف میں کلمہ طیبہ لکھا ہُوا تھا۔ بیروت، بغداد، دمشق اور قاہرہ میں ایسے سگریٹ لائٹر جابجا فروخت ہوتے ہیں۔ سفری ایجنسیاں اپنے ہدایت ناموں میں متنبہہ کرتی ہیں کہ مشرقی ممالک میں کچی سبزیاں سلاد اور ٹماٹر نہ کھایئے۔ کیونکہ ان میں مہلک جراثیم ہوتے ہیں۔ اور کالے یا سفید رنگ کے چلتے پھرتے خیموں میں نہ جھانکیے، کیونکہ ان میں عورتیں ہوتی ہیں۔ جب تک مشرقی عورت خود آنکھ نہ لڑائے اس سے آنکھ نہ ملایئے، کیونکہ اس سے ان کا مذہب بگڑ جاتا ہے۔

بندرگاہ کے قریب ایک کھلا میدان ٹاٹ اور ٹین اور چٹائیوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں سے کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ میدان کے چاروں طرف لوہے کے خاردار تار کھنچے ہُوئے تھے اور پولیس کے کچھ سپاہی پہرے پر مامور تھے۔ میدان میں سینکڑوں مرد اور عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح محصور تھیں اور فضا میں دُور تک بول و براز کی عفونت پھیلی ہُوئی تھی۔ تمازتِ آفتاب میں یہ سارا میدان انگیٹھی کی طرح دہک رہا تھا۔ کچھ ضعیف عورتیں ایک چادر کو پانی میں تر کرکے بار بار اپنے چہروں پر مل رہی تھیں۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ یہ لوگ فلسطین کے مہاجر نہیں ہیں بلکہ یہ میدان حاجیوں کا کیمپ ہے جو حکومت نے خود اپنے خرچ سے قائم کر رکھا ہے۔ کئی کئی مہینوں تک دور دراز سے لوگ آآ کر اس کیمپ میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جو خوش نصیب ہیں انھیں ہوائی یا سمندری جہاز میں جگہ مل جاتی ہے۔ باقی لوگ انتظار کرکے واپس چلے جاتے ہیں۔

ٹیکسی ڈرائیور کے اندازے کے مطابق (جو باقاعدہ اعداد و شمار پر مبنی تھا)

کیمپ میں ایسے لوگ بھی تھے جو دو دو تین تین چار چار سال سے بندرگاہ پر انتظار کرنے کے بعد بے نیلِ مرام واپس جا رہے تھے۔ اگر علمائے کرام کراچی یا بیروت یا قاہرہ سے بھی واپس لوٹ جائے تو اسے ایک حج کا ثواب مل سکتا ہے۔

حاجی کیمپ کے ایک گوشے میں نمازِ عصر کی جماعت ہو رہی تھی۔ باقی دُنیا کے اسلام کی طرح اس کیمپ میں بھی حاجی زیادہ تھے اور نمازی کم۔ ایک بوڑھی عورت بڑے خضوع و خشوع سے سربسجود تھی۔ اس کی چادر میلی تھی اور کُرتے کا دامن پھٹا ہُوا تھا۔ یُوں اس سارے ماحول پر ایک ایسی المناک غربت اور صعوبت چھائی ہُوئی تھی۔ یہاں پر انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہے۔

”بے شک ہم تمھیں کچھ خوف اور بھُوک سے اور مال و جان اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے۔ صبر کرنے والوں پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خوشخبری دے دو کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے رحمتیں اور عنایتیں ہیں اور یہی لوگ ہمت والے ہیں۔“

بیروت کا شمار بھی دُنیا کے ان مہذب شہروں میں ہوتا ہے جہاں غریب ہونا تو کوئی جُرم نہیں۔ البتہ بھیک مانگنا ضرور منع ہے۔ بندرگاہ کے باہر پولیس کا ایک سپاہی بید کی چھڑی گھما گھما کر بہت سے گداگروں کو منتشر کر رہا تھا جو آتے جاتے سیاحوں پر بھُوکی چیلوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ فلسطینی مہاجروں کا ایک خاندان سپاہی کی نظر بچا کر ایک کونے میں سہما کھڑا تھا۔ ظاہراً وہ دستِ سوال دراز نہیں کر رہے تھے۔ مگر ان کے چہرے اپنی زبانِ بے زبانی سے پکار پکار کر اپنی بھُوک اور اپنی بے بسی ہی کی فریاد کر رہے تھے۔

اس خاندان میں ایک چھ یا سات سال کا لڑکا تھا۔ ایک نو سال کی لڑکی تھی۔ ان کی ماں ایک ادھوری بہار کی طرح، جسے وقت سے پہلے ہی خزاں نے [illegible] ل کر ڈالا

ہو۔ وہ کبھی اپنے بچّوں کی طرف دیکھتی، کبھی راگیروں کی طرف، اور کبھی اس سپاہی کی طرف جو بید کی چھڑی گھما گھما کر بھیک منگوں کو بھگا رہا تھا۔ مجھے رُکتے ہُوئے دیکھ کر وہ لڑکا میری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا "کیا آپ ہماری تصویر کھینچنا چاہتے ہیں ؟"

جس طرح کراچی کے فقیر دیا سلائی یا بوٹ پالش کا سہارا لے کر بھیک مانگتے ہیں۔ اسی طرح فلسطین کے مہاجر تصویریں کھنچوا کر بخشش کی فریاد کرتے ہیں۔ ان کے خوبصورت خدوخال تیکھے تیکھے نقش اور اداس آنکھیں سیاحوں کے لیے بڑی جاذب نظر ہوتی ہیں اور وہ ان کے فوٹو اتار کر فراخدلی سے بخشش دیتے ہیں اور اس طرح اہلِ فلسطین پر اپنی ہمدردی، منصف مزاجی اور غیر جانبداری کی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔

تصویر کی فرمائش سُن کر میرا جی چاہا کہ بچے کو اٹھا کر گلے سے لگاؤں اور کہوں میرے معصوم فرشتے ابھی خُدا نے وہ مصوّر پیدا ہی نہیں کیا جو تیری تصویر کا حق ادا کر سکے۔ تیرے کپڑے پھٹے ہُوئے ہیں۔ اس جُھلستی دُھوپ میں تیرے پاؤں ننگے ہیں اور تیری سہمی ہُوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی خشک ہو چکی ہے۔ وہ تیری ماں ہے جسے قدرت نے شباب کی منزل سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا ہے۔ اس کے بھنچے ہُوئے ہونٹوں پر فریاد لرز رہی ہے۔ لیکن سپاہی کے ڈر سے وہ اپنا منہ نہیں کھول سکی۔ یا شاید اس کے سوکھے ہونٹوں پر ایک غضب ناک بددُعا تڑپ رہی ہے جو اس نے اس کے ڈر کے مارے روک رکھی ہے کہ کہیں اس کی بددُعا سے دُنیا کا بھی وہی حشر نہ ہو جو عاد اور ثمود اور نوحؑ کی قوموں کا ہوا تھا۔ اور وہ تیری گڑیا سی بہن جس نے ایک ہاتھ سے ماں کا دامن تھاما ہُوا ہے اور دوسرے ہاتھ سے تمھیں واپس بلا رہی ہے تاکہ کوئی راگیر تمھیں زبردستی اُٹھا کر نہ لے جائے۔ اس ننھی منّی کے پاؤں بھی ننگے ہیں۔ اس کے کپڑوں میں بھی سُوراخ ہیں۔ اسؐ کے سنہری بال ریشم کے اُلجھے ہُوئے گچھوں کی طرح پریشان اور گھنگریالے

ہیں۔ ان خوبصورت بالوں میں ریت کے ذرّے ابرک طرح چمک رہے ہیں۔ اس کی پلکیں گھنی اور نوک دار ہیں ــــ اُداس آنکھوں میں نیلی نیلی جھیلوں کی بے پناہ گہرائیاں خوابیدہ ہیں ــــ اگر یہ بچّی آسمان پر پیدا ہُوتی ہے۔ اور بنی آدم اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں خدا کا یہ شاہکار بھُوک سے...... مرجھایا ہُوا ہے، خوف سے سہما ہُوا ہے، بے گھر ہے، بے سہارا اور بے حد اداس ہے......

اس بچّی کی جلد زیتون کے تیل کی طرح تازہ اور شفاف ہے۔ اس کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا ہے۔ اس میں ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کے چشموں کا پانی اور فلسطین کے پھُولوں کی نکہت اور فلسطین کے انگوروں کا رس رچا ہُوا ہے۔ اس لڑکی کے وجود میں یروشلم کی اَن گنت صدیوں کے تقدّس کی امانت پوشیدہ ہے۔ اس کی پرورش بڑے بڑے برگزیدہ پیغمبروں کے زیرِ سایہ ہُوئی ہے۔ اس کی تربیت بھی آسمانی صحیفوں کے ہاتھ ہے جو خدا نے اس ارضِ مقدّس پر نازل فرمائے۔ اس لڑکی کے آباؤ اجداد ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کی خاک میں دفن ہو رہے ہیں۔ لیکن آج یہ لڑکی روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے ننگے پاؤں اور ننگے سر بیروت کی گلیوں میں پریشان حال ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کی بھٹکی ہُوئی بھیڑوں کو اچانک وہ گھر یاد آنے لگا ہے جہاں سے دو اڑھائی ہزار سال قبل خدا نے انھیں نکال باہر کیا تھا۔ یہودیوں کا سب سے نیا صحیفہ BALFOUR DECLARATION ہے جو دو نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ کی وزارتِ خارجہ کی طرف سے نازل ہُوا تھا اور جس میں بشارت دی گئی تھی کہ شاہ انگلستان کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی گھر مہیا کرنے کے حق میں ہے اور اس سلسلے میں یہودیوں کی ہر ممکن مدد کرے گی۔

جس عقیدت مندی سے یہودی اس انسانی بشارت کی پیروی کر رہے ہیں۔ اگر اسی جذبہ سے انھوں نے اپنی الہامی کتاب توریت کو اپنایا ہوتا تو شاید بنی اسرائیل کو ان گنت صدیوں

تک دربدر کی خاک نہ چھاننی پڑتی۔

اے بنی اسرائیل وہ دِن یاد کرو جب خدا نے تمھیں سارے جہان کے لوگوں سے بڑھایا تھا۔ جب خدا نے تمھیں قومِ فرعون کے شکنجے سے چھڑایا تھا جو تمھیں بڑے دُکھ دیتے تھے۔ تمھارے بچوں پر تو چھُری پھیرتے تھے لیکن تمھاری عورتوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رہنے دیتے تھے۔ جب خدا نے تمھارے لیے دریا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تم کو بچا کر فرعون کے آدمیوں کو تمھارے دیکھتے دیکھتے ڈبو دیا۔ جب خُدا نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا۔ جب موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی پتھر پر ماری اور اس میں سے تمھارے لیے پانی کے بارہ چشمے پھُوٹ نکلے۔

اے بنی اسرائیل وہ دِن بھی یاد کرو جب خُدا نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم حق کے ساتھ باطل کو نہ ملاؤ گے اور خُدا کی آیات کو سستے داموں نہ بیچو گے۔ لیکن تم نے یہ وعدہ ایفا نہ کیا اور تم نے بڑی ہٹ دھرمی سے بچھڑے کو اپنا خدا بنا لیا۔ تم نے من و سلویٰ کی نعمت سے اُکتا کر ساگ پات اور ککڑی اور لہسن اور مسُور و پیاز کی فرمائش کی۔ اپنی اکڑ میں آ کر تم نے بعض پیغمبروں کو جھُٹلایا اور بعض کو جان سے مار ڈالا اور خُدا نے تمھاری نافرمانیوں کی پاداش میں کبھی تم کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کا حکم دیا۔ کبھی تمھیں آسمانی بجلی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کبھی تم راندہ درگاہ ہو کر بندر بنا دیے گئے۔ کبھی تمھارے سر پر طُور کا پہاڑ لٹکا دیا گیا . . . .

اے بنی اسرائیل بے شک تمھارے دِل پتھر ہو چکے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ کیونکہ پتھروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور پانی رسنے لگتا ہے۔

اے بنی اسرائیل آج تمھاری نسل بھی اسی طرح مسخ ہو چکی ہے جس طرح کہ تم نے خُدا کے کلام توریت کی شکل بدل دی تھی۔

تمھاری رگوں میں جو لہو گردش کر رہا ہے اس میں اسرائیلی خون کی آمیزش بہت ہی کم ہے۔ ہزاروں سال سے تم دُنیا کے گوشے گوشے میں مارے مارے پھر رہے ہو اور تمھاری نسل دوسری قوموں میں خلط ملط ہو کر اب اپنی امتیازی حیثیت نہیں رکھتی۔ یُوں بھی تم نے خُدا کے رسُولوں کی جگہ اب امریکہ اور انگلستان میں اپنی مرضی کے پیغمبر تلاش کر رکھے ہیں اور تمھاری موجودہ توریت CLARATION NAHDA ہے، لیکن یاد رکھو اس عرب بچّی کا سہما دل اور اس کی غمزدہ ماں کی دبی ہوئی آہ تمھارے سر پر کوہِ طُور سے بھی زیادہ خطرناک پہاڑ کی طرح لٹک رہی ہے۔ اس معصوم بچّے کی بے بس نگاہوں تلے غضب ناک اور قہرناک بجلیاں تڑپ رہی ہیں۔ اگرچہ آج کل بندر نچانے کا رواج عام نہیں ہے۔ لیکن اگر خدا اپنی بات کا سچّا ہے تو تم امریکہ اور انگلستان میں ڈھلے ہوتے سونے اور چاندی کے بچھڑوں کی جس قدر چاہے پوجا کرو۔ لیکن عذاب کا جو چکر تمھارے پاؤں میں پڑا ہُوا ہے۔ اور اس سے تمھیں نجات نہیں مل سکتی۔

ایک پنکچر

سہسرام کا شہر کئی لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک تو یہاں شیر شاہ سُوری کا مقبرہ ہے۔ دوسرے یہاں آغا جانی کا بازار ہے اور تیسرے اسی شہر میں ایک بار رالو کی موٹر کار کے دو ٹائر پنکچر ہو گئے تھے۔

جس طرح شیر شاہ سُوری کی عظمت آغا جانی کے بازار کے پس منظر کے بغیر اُدھوری رہ جاتی ہے۔ اسی طرح رالو کی کار کے بغیر سہسرام کا شہر بھی اپنی تاریخی اہمیت کھو بیٹھا ہے۔ آغا جانی کے بازار کا قصہ یُوں ہے۔ کسی زمانے میں اس مقام پر ایک قصبہ آباد تھا۔ یہاں کے سردار کا لقب آغا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی، جسے لوگ جانی کہتے تھے۔ غالبًا جانی اس کا نام نہ تھا بلکہ اس لفظ کی دلفریب شانِ محبُوبیت سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ بے حد خوبصُورت اور حسین و جمیل لڑکی تھی جس پر بہت سے لوگ دِل و جان سے فریفتہ تھے۔ ان میں سے ایک فرید خاں بھی تھا۔

فرید خاں خواب دیکھنے کا شوقین تھا۔ خوبصورت خواب، بھیانک خواب،

جنگ وجدال کے خواب، ہندوستان کی بادشاہت کے خواب۔ جانی کے خواب، جانی کی آنکھوں، جانی کے بالوں کے، جانی کی مسکراہٹوں کے دلفریب سپنے۔ اور جب اس کے خوابوں کی تعبیر نکلی۔ اور شیر شاہ نے ہندوستان کی بادشاہت کا تاج پہنا تو ایک تیز رفتار قاصد یہ پیغام لایا کہ "جانی! میرا انتظار کرنا۔ میں بہت جلد اپنی ملکۂ عالم کے حضور میں آرہا ہوں۔" شیر شاہ بادشاہت کرتا رہا۔ اور جانی انتظار۔ انجام کار، شیر شاہ پر ایک سنگلاخ تاریخی مقبرہ تعمیر ہوگیا۔ اور جانی کے نام پر جانی بازار کی بنیاد پڑگئی۔ جہاں ہر روز اس شہیدِ وفا کی یاد میں بیسیوں جانیاں بن سنور کر، سولہ سنگار کر کے سو سو کینڈل پاور کے برقی قمقموں کے عین نیچے کرسیاں سجا کر۔ . . . . خیر، یہ تو ایک دوسری کہانی ہے۔ یہاں پر قصہ تو رانو کی موٹر کار کا تھا۔ جسے پنکچر بھی ہونا تھا تو سہسرام میں۔ اب اگر وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اُسے کون روک سکتا تھا؟ اگر وہ شیر شاہ کے مزار پر چلی جاتی تو شاید وہاں پر سوئی ہوئی خاک کی چٹکی میں ایک لمحہ کے لیے آگ سی بھڑک اُٹھتی۔ اور اگر وہ جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی، تو . . . . . . خیر، یہ بھی حُسنِ اتفاق تھا کہ وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جانے کی بجائے کچہریوں کی طرف چلی آئی۔

اس وقت عدالت کے سامنے چوری کا کوئی معمولی سا مقدمہ زیرِ سماعت تھا۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما بڑے جوش وخروش سے ایک گواہ پر جرح فرما رہے تھے۔ وہ مقامی عدالتوں کے سب سے زیادہ سربرآوردہ، خرانٹ اور کہنہ مشق وکیل تھے۔ جب وہ گواہ سے کوئی مفید مطلب بات کہلا لیتے تھے تو بصد ادب واحترام، جھک کر چرب زبانی سے فرماتے تھے کہ "عالی جناب عدالت اس فقرے کو نوٹ کر لے۔" لیکن ان کی ایک بھینگی آنکھ جو مدعی، مدعا علیہ، گواہ اور مجسٹریٹ کو ایک ہی ترچھے زاویے سے دیکھنے کی عادی تھی، پکار پکار کر کہتی تھی کہ "ارے او مجسٹریٹ کے بچے، اس فقرے کو یاد رکھنا!" گواہ کی جرح پورے طور پر ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ عدالت نے اچانک مقدمے کی سماعت اگلی پیشی تک ملتوی

کردی۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما نے لاکھ کہا کہ "حضور ابھی صفائی کے دو گواہ اور بھی موجود ہیں۔ جنابِ عالی! وہ بڑی مشکل سے کلکتہ سے بلائے گئے ہیں۔ سرکار والا وہ آج رات کی گاڑی سے واپس جانے پر مصر ہیں . . . . . ." ان کی بھینگی آنکھ نے بھی اپنی مخصوص زبان میں بہت سے اُلٹے سیدھے وار کیے۔ لیکن عدالت کا فیصلہ اٹل تھا۔ ابھی ابھی عدالت نے ملاحظہ فرمایا تھا کہ آج اس کی سرزمین پر سُرخ حاشیے کے سینڈلوں والے دو خوبصورت اور نازک پاؤں یوں محوِ خرام تھے جیسے کسی ستار پر دو حنائی اُنگلیاں مدھر مدھر سُروں میں درباری کا الاپ بجا رہی ہوں۔ کچہری کے احاطے میں اچانک ایک مدہوش سی شمیم بس گئی تھی۔ اور سفید جارجٹ پر بڑے بڑے گلابی پھولوں والی ایک ساڑھی نے ساری فضا کو گلنار کر دیا تھا۔ چاروں طرف ایک سناٹا سا چھا گیا جیسے کمشنر صاحب بہادر اچانک کسی ہنگامی معائنے پر نمودار ہوگئے ہوں! عدالت کو ایک حسین مقدمے کے تخیل نے سرشار کر دیا تھا۔ عبدالوہاب پیش کار کچھ عرصے کے لیے پان کی پیک نگلنا بھول گیا اور اس کے چند قطرے سامنے پڑی ہوئی تعزیرات ہند کی جلد پر ٹپک گئے۔ جو اس نے نظر بچا کر کُرتے کے دامن سے پونچھ ڈالے۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما نے بھی اپنی آنکھ کا زاویہ بدلا اور اس دھڑکتی ہوئی خاموشی میں ساری دُنیا نے سُنا کہ ایک موسیقار آواز کسی اردلی سے پوچھ رہی تھی۔ "کیا یہاں کسی کے پاس موٹر کار ہے؟"

یُوں تو سہسرام کے مقدمہ بازوں، وکیلوں، مجسٹریٹوں، کلرکوں اور چپراسیوں کو اکثر یہ خیال آیا ہوگا کہ دُنیا میں موٹر کار بھی ایک نعمت ہے۔ لیکن اس وقت انھیں یہ احساس نہایت شدّت سے ستانے لگا کہ موٹر کار نہ ہونا ایک ناقابلِ عفو جرم اور ناقابلِ تلافی گناہ ہے۔ اس جنسِ نایاب کے فقدان نے کچہری کے احاطے میں حیرانی اور پشیمانی کا ماحول سا پیدا کر دیا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ ایک زبردست احساسِ بے مائیگی سے آب آب ہونے لگا۔ "ہائے، عجیب جنگلی شہر ہے یہ۔ ارے بھئی اگر

موٹر نہیں تو پنکچر لگانے کا سامان تو ہو گا کسی کے پاس، ٹائر، رینچ، جیک، ربر سلیوشن وغیرہ وغیرہ،" رانو بات تو اردلی سے کر رہی تھی۔ لیکن ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ وہ خاص اسی سے مخاطب ہے۔ اور ان کے پشیمان چہرے زبانِ حال سے یہ فریاد کر رہے تھے کہ میری جان! یہ ایک موٹر ہی ہمارے بس کا روگ نہیں۔ ورنہ تم کہو تو ہم آسمان سے تارے نوچ لائیں۔ چاند اتار کر تمہارے پاؤں پر رکھ دیں۔ کالی گھٹاؤں کو تمہارے گیسوؤں سے لڑا دیں۔ شیر شاہ سُوری کا مقبرہ تمہاری ٹھوکریں لا بچھائیں، جانی کا بازار تمہارے آگے پیچھے بسا دیں۔ لیکن اے جان! یہ موٹر کار کا جوتا ہمارے منہ پر نہ مارو۔ ہم روسیاہ .....

رانو جلدی میں تھی۔ اس لیے وہ اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں بلبلاتے ہوئے کسمساتے ہوئے فریادی چہروں کی آواز نہ سُن سکی اور نہ اس نے حسرت و یاس، شرمندگی اور بے بسی کا وہ امتزاج دیکھا جو ایشر داس سائیکل ڈیلر کے منہ پر گرم گرم کول تار کی طرح تہہ بہ تہہ بچھا جا رہا تھا۔ وہ دن بھر درجنوں مقدمہ بازوں، منشیوں اور مختاروں کے سائیکلوں کے پنکچر درست کیا کرتا تھا۔ لیکن اے وائے! کہ زندگی عزیز کے اس انمول لمحے اس کا سارا کمال بے کار، بے سُود، رائیگاں تھا۔ اگر خالی ربڑ کی بات ہوتی تو خیر وہ تو اپنی کھال تک کھینچ لیتا۔ لیکن اس کے پاس نہ کوئی بڑا رینچ تھا۔ اور نہ ہی جیک۔ چنانچہ اب وہ اپنی ماڈرن سائیکل ورکشاپ کے سامنے ایک بے یار و مددگار اپاہج کی طرح کھڑا تھا جس کا مال و متاع اس کے سامنے لُوٹا جا رہا ہو۔" اب قسمت سے یہاں آ گئی ہو تو اپنا نور پھیلاتی جاؤ۔ تمہارے نور میں تو کوئی کمی نہ ہو گی۔ لیکن یہ زندگیاں غیر فانی ہو جائیں گی۔ یہ گھر آباد ہو جائیں گے۔ آنے والی نسلیں تمہارے گیت بھی اسی شوق، اسی سوز، اسی حسرت سے گائیں گے۔ جس طرح اب جانی کے قصے گائے جاتے ہیں۔ "......

"کوئی ہوٹل، کوئی ڈاک بنگلہ، کوئی ریسٹ ہاؤس؟ ہائے یہ بھی کیا مجبوری ہے۔ اس نگوڑی کار کو بھی اسی جنگل میں پنکچر ہونا تھا۔ پھر ایک بھی نہیں، بیک وقت

دو ٹائر پنکچر ہو گئے ہیں۔ شاید ایک ٹیوب بالکل ہی پھٹ گئی ہو۔ اب اس اجاڑ بیابان میں نئی ٹیوب کہاں ملے گی بھلا؟ ہلتے دن بھی ڈھلتا جا رہا ہے۔ بنارس یہاں سے کوئی پچاس ساٹھ میل ہی تو ہو گا۔ اگر یہ کمبخت کار پنکچر نہ ہوتی تو اب تک وہاں پہنچ بھی گئی ہوتی۔ بنارس پہنچ کر اس کو ابھی کتنے کام کرنے تھے۔

"کیا یہاں پہ رات گزارنے کے لیے کوئی اچھا ہوٹل ہے؟"

ارے ہوٹل میری جان، تجھے ہوٹل کی کیا حاجت؟ یہ دل دیکھو، یہ سینہ دیکھو، یہ آنکھیں دیکھو۔ یہ سارے پٹ تمہارے ہی لیے وا ہیں۔ آؤ یہ کاشانے تمہارے ہی منتظر تھے۔ اب تم کہاں جاؤ گی؟ یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں۔ وُہ آئیں ہمارے گھر میں خُدا کی قدرت ہے......؛

"ہائے نہیں، مَیں کسی کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی۔ کیا یہاں کوئی ڈاک بنگلہ بھی نہیں؟ کوئی ریسٹ ہاؤس؟"

سہسرام کی کچہری کے احاطے میں جتنے دل دھڑک رہے تھے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ ہوٹل یا ڈاک بنگلہ یا ریسٹ ہاؤس کا رتبہ حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگے اور ان کے کواڑ بے قراری سے بار بار کھلتے تھے اور دامن پھیلا پھیلا کر فریاد کرتے تھے کہ آؤ گھڑی دو گھڑی کے لیے ان ویرانوں کو آباد کرتی جاؤ۔ اگر یہ لاجواب ساعت بیت گئی تو کون جانتا ہے کہ پھر دوبارہ واپس آئے نہ آئے۔ اگر تم یُوں ہی چلی گئیں، تو یہ تاریکی جو تمہارے بعد پھیلے گی کبھی دُور نہ ہو سکے گی۔

"خاک،" رانو جھلا سی گئی۔ "کیا نام اس شہر کا؟"

سہسرام کا ذرہ ذرہ پکارنے لگا کہ ہمیں سہسرام کہتے ہیں۔ پہلے ہمارا نام سہہ سرام تھا۔ بادشاہوں کے آرام فرمانے کی جگہ۔ وہ دیکھو، سامنے جو ایک سنگلاخ عمارت نظر آ رہی ہے وہ ایک مقبرہ ہے۔ ایک بادشاہ کا مقبرہ۔ ہماری آغوش میں آج

بھی ایک جلیل القدر بادشاہ محوِ استراحت ہے، لیکن یہ قدر ناشناس لوگ پھر بھی ہیں سہسرام ہی کہے جاتے ہیں۔ جاہل، پاگل، احسان فراموش۔ دیکھو تو سہی۔ تمہاری کار کے پنکچر تک نہیں جوڑ سکتے۔ گنوار، نالائق، نکمّے ......

اُس روز موٹر سائیکل کو بار بار اچانک دھکّے لگتے تھے۔ اسرافیل رہ رہ کے اپنا صُور پھونکتا تھا جیسے پہاڑ ٹکرا گئے تھے۔ زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مل گئے تھے اور اس نفسانفسی کے عالم میں رانو کے مرمریں بازو میری کائنات پر ایک مرغولۂ نور کی طرح آویزاں ہو رہے تھے۔ لیکن پھر وہ بگڑنے لگی۔ غصیلی ناگنوں کی طرح بل کھاتی ہوئی تیوریاں اس کی پیشانی پر یُوں تلملانے لگیں جیسے برفانی بادلوں کے آنچل میں بجلیاں تڑپ رہی ہوں۔ جیسے مرمر کی سلوں پر چاندی کے تار سیماب کی طرح جھلملا رہے ہوں۔ غصّے میں بھی کیا کیف ہوتا ہے۔ کیا نشہ ہوتا ہے۔ کیسی رعنائی! چنانچہ اگر اس روز قدم قدم پر ٹھوکروں اور ہچکولوں نے ہمارا استقبال کیا تو اس میں نہ میرا قصور تھا اور نہ موٹر سائیکل کا، نہ سڑک کا۔ بلکہ ساری کائنات اس شہابی غبار کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی جو غصّے کی تمازت میں رانو کے گالوں پر قوس قزح کی طرح چھایا جاتا تھا ــــ اور بخُدا! وہ کیا ہی لاجواب، لافانی انمول لمحہ تھا۔ جب اس کے ڈرائیور نے قطعی طور پہ کہہ دیا کہ "میم صاحب! پنکچر لگانے کا سامان نہیں مل سکا۔ جب تک یہ سامان نہ ملے، گاڑی بےکار ہے۔"

رانو کی کار سڑک کے کنارے اس خاموش گائے کی طرح کھڑی تھی، جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہو۔ اور بیس بیس کوس کسی سلوتری کا ہسپتال ملنا محال ہو۔ ڈرائیور کا فیصلہ سُن کر رانو کے گالوں کا شہابی غبار آتش فشاں کی طرح لاوے سے اگلنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں جوالا مکھی کے شعلے سے بھڑکنے لگے اور اس کے نازک پاؤں سہسرام کی اس خوش نصیب سرزمین کو غصّے سے یُوں پیٹنے لگے جیسے فرید خاں

ہندوستان کا تخت پانے کے خواب بُن بُن کر بے چینی سے ادھر سے اُدھر پاؤں مارتا تھا اور جیسے جانی انتظار کی گھڑیوں میں بے بس، پریشان، مجبور ایڑیاں رگڑتی تھی۔ آج شام تک رانو کا کلکتہ پہنچنا کس قدر لازمی تھا۔ اس کا احساس نہ ڈرائیور کو تھا، نہ موٹر کار کو، جو ایک اپاہج گائے کی طرح سڑک کے کنارے دم توڑے پڑی تھی۔ حالانکہ یہ اشد ضروری تھا کہ وہ شام تک کلکتے پہنچ جائے کیونکہ آج رات جشنِ آزادی کی رات تھی اور رات کے عین بارہ بجے جب آزادی کی دیوی آکاش سے اُتر کر اس دھرتی پر آئے گی۔ اس وقت گرینڈ ہوٹل کا بال روم اپنے پُورے جوبن کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ یُوں تو گرینڈ ہوٹل کا بال روم ہر شب شبِ برات مناتا ہے لیکن آزادی کی رات بھی کوئی روز روز آتی ہے۔ اگر رانو نے یہ زرّیں موقع کھو دیا تو نہ جانے اسے یہ جشن دوبارہ منانے کے لیے کتنے سو کتنے ہزار برس انتظار کرنا پڑے۔ اور پھر ہزہنس نے اسے اس موقع پر خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ ہزہنس اس کا منگیتر تھا۔ بڑا البیلا، خوش باش، خوش دل جوان تھا اور ناچتا بھی کیا خوب تھا۔ خصوصاً آج کی رات جب گرینڈ ہوٹل کا آرکسٹرا نئی نئی سُریلی دُھنیں بجائے گا۔ جب بال روم کی فضا میں عطر اور لیونڈر، شمپین، قہقہے اور خوبصورت نازک اندام، سیمیں اجسام ایک تیز و تند خمار کی طرح چھا جائیں گے۔ جب رات کے بارہ بجے ہزاروں سال کے انتظار کے بعد آزادی کی دیوی وسکی جن شیری کے گلاسوں کی خوشنما جھنکار کے ساتھ زمین پر اُترے گی تو ہزہنس کے رمبا میں کیا کیا ترنگ نہ ناچے گی۔ اس کے سبک قدم رقص گاہ کے شفاف اور لچکیلے فرش پر یُوں پڑیں گے جیسے کسی جھیل کی لہروں میں کنول کے پھول تیرتے پھر رہے ہوں اور اس کے گرسنہ بے قرار بازو رانو کو ایک شعلۂ بے قرار کی طرح اپنی لپیٹ میں لیے ناچ گھر کے جھمگٹے میں یُوں رقصاں ہوں گے، جیسے دیا سلائی کو بھڑکتی ہوئی آگ میں چابکدستی سے تیز تیز گھمایا جائے اور اسے آگ نہ لگنے پائے ــــ لیکن تقدیر کا نوشتہ

کس نے مٹایا ہے اور کون مٹائے گا؟ عین اس وقت جب کلکتے میں ہرنس اپنے ڈنر سوٹ کے کالر میں لگانے کے لیے سفید گلاب کے ایک بڑے سے پھول میں پرلائن پیرس کا عطر "پیشن" سوئیوں سے چھو چھو کر بسا رہا تھا۔ رانو گرینڈ ٹرنک روڈ پر ایک خیراتی سرائے کی طرح بسے ہوئے چھوٹے سے شہر سہسرام میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے چھوٹے سے، تاریک سے بنگلے میں ایک ناقابلِ بیان، بے کسی بیزاری اور مایوسی کے عالم میں اپنا سامان اتروا رہی تھی۔ لیکن اس مہمان کی آمد پر صدیوں سے سویا ہوا بنگلہ انگڑائی سی لے کر بیدار ہو گیا۔ اس کی اونگھتی ہوئی بے جان دیواروں میں زندگی کے آثار لہرانے لگے۔ جمی ہوئی کھڑکیاں اور فرسودہ دریچے نو دمیدہ کلیوں کی طرح کھلنے لگے۔ تاریک چھتوں پر جیسے چاند اور تارے طلوع ہو گئے ہوں اور جب رانو نے اپنے لاجواب ہاتھوں سے ڈرائنگ روم کی کرسیوں اور میزوں پر بکھری ہوئی کتابوں کو الماری میں رکھ کر صوفے کا رُخ قدرے بدل کے رکھا تو اس بھولے بسرے، پریشان حال کمرے میں نشاط اور شالامار کی گل پوش روشیں آراستہ ہو گئیں۔ اور پھر آج کی تاریخی رات کلکتہ نہ پہنچ سکنے کا غم غلط کرنے کے لیے رانو نے اپنی پکنک باکس سے جن، رم اور وسکی نکال کر چند تیز عنابی رنگ کے کاک ٹیل بنا کے نوش جان فرمائے۔ ان کا خمار گلابی ڈوروں کی صورت میں اس کی غزالی آنکھوں میں چھلک آیا اور اس کے گالوں پر آتش بازی کی مہتابیاں انار چھوٹنے لگے۔ آدھی رات کے قریب جب ہم شیر شاہ کے مقبرے کی چھت پر جا کے بیٹھ گئے تاکہ سہسرام کے گلی کوچوں میں آزادی کا نفوذ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں تو اس وقت وہ ویران مقبرہ گرینڈ ہوٹل کے بال روم سے زیادہ منوّر اور بارونق محسوس ہونے لگا۔ اور اس کے سنّاٹے میں ایک عجیب سماوی سا ارکسٹرا بجنے لگا۔ سہسرام کی سرزمین پر ایک نئے شیر شاہ نے جنم لیا، جس پر تاریخ کبھی کوئی یادگار مزار تعمیر نہ کر سکے گی۔ اور ایک نئی جانی نے ظلمتِ شب کو اپنے گیسوئے عنبریں سے تابانی عطا فرمائی۔ لیکن اس کے نام پر غالباً کوئی بازار

قائم نہیں ہوا۔ گھڑی کی سوئی بارہ بجنے سے کچھ منٹ ادھر دھیمے دھیمے لرز رہی تھی جیسے کسی حسینہ کے دہکتے ہوئے ہونٹ انکار اور اقرار کے مابین تھرتھرا رہے ہوں۔ شیر شاہ سوری کے مقبرے کے گرد جو تالاب ہے، اس کی سیڑھیوں پر بہت سے بچے خوشی اور جوش سے کلکاریاں مارتے ہوئے انار مہتابیاں، چھچھوندریں اور پٹاخے جمع کر رہے تھے اور انھیں تالاب کے گرد اس خوبی اور کوشش سے سجا رہے تھے جس طرح رانو نے میرے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے پیچیدہ کاکلوں کو آراستہ کیا تھا۔ کلکتہ گرینڈ ہوٹل میں بال روم اپنے جوبن پر تھا۔ ہرنس رانو کی آمد سے مایوس ہو کر مس پرمیلا کو اپنی بانہوں کے حلقے میں لیے آزادی کا رقص ناچ رہا تھا: "ڈارلنگ" مجھے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو۔ رانی اپنی مخمور، موسیقار آواز میں کہہ رہی تھی "بائی گاڈ، میں اس مقدس رات کو آسانی سے برداشت نہیں کر سکتی۔ بائی گاڈ، میں وفورِ جذبات سے مر جاؤں گی۔" آزادی کے انتظار میں رانو بھی ان بچوں کی طرح بے خود اور بے قرار ہو رہی تھی۔ جو نیچے تالاب کی سیڑھیوں پر آتش بازی کی قطاریں سجا رہے تھے۔ اف ایک بچہ دھڑام سے پھسل کر سنگلاخ فرش پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ کا انار تڑاخ سے پھٹ گیا۔ اس کا چہرہ گرم گرم دھوئیں کے غبار میں لپٹ گیا۔ اس کی آنکھیں جھلس کر مند گئیں۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے اس دیوی کی شانِ نزول نہ دیکھ سکے گا جس کا استقبال کرنے کے لیے اس نے اپنی توتلی زبان سے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانا سیکھے تھے۔ آسمان پر ایک تارا ٹوٹا اور دور تک ایک خطِ نور کھینچتا ہوا غائب ہو گیا۔ جانی کے بازار میں طبلے پر زور کی تھاپ پڑی۔ گھنگرو ناچے۔ شیر شاہ کے مقبرے کے سنگلاخ پتھر سنگِ مرمر بن گئے۔ چھت کے اندھیرے میں ایک شمع فروزاں بھڑکی۔ آزادی کی دیوی سوا نیزے پر آ گئی تھی اور میرے کانوں میں ایک نازک سی مترنم سی آواز کہہ رہی تھی، "چاکلیٹ سر؟"

میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ہلکے نیلے فراک والی ائر ہوسٹس بسکٹوں، چاکلیٹوں،

چوسنے والی مٹھائیوں کی ٹرے لیے میرے سیٹ پر جھکی ہوئی تھی اس کے احمر بالوں کی ایک لٹ بڑے بے پروائی سے لہرا رہی تھی اور اس سے یاسمین کے سینٹ کی ہلکی ہلکی سی شمیم یوں آ رہی تھی۔ جیسے پھولوں کے کنج سے ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم کے جھونکے چھن رہے ہوں۔

بی۔او۔اے۔سی کا طیارہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنے چار انجنوں کی طاقت سے پوری رفتار پر پرواز کر رہا تھا۔ راوی گزر چکی تھی اور اس کے رومان بھی۔ اب ہم دریائے سندھ کے پاس پرواز کر رہے تھے، جس پر فقط سکھر بیراج ہی تعمیر ہو سکتے ہیں۔ اور گنگا اور جمنا، اور سون ہگلی کے مرغزار بہت پیچھے رہ گئے تھے، جہاں کے صنم خانوں میں رانوازل تک راج کرے گی۔ لیکن آزادی کی دیوی اب کبھی دھرتی پر نہ اترے گی۔ سہسرام کی سڑک پر کسی کار کو پنکچر نہ ہوں گے۔ شیرشاہ کا مقبرہ اب پھر آباد نہ ہوگا۔ اس کے سنگلاخ پتھر مرمر نہ بن سکیں گے۔ اس کی چھت پر کوئی شمع فروزاں نہ بھڑکے گی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ نا ید

نمبر پلیز

بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ جب ٹیلیفون کے تاروں میں ایک نغمہ سا لہراتا ہے۔ جب ریسیور میں ایک پائل سی ناچتی ہے تو وہ زوبی کی آواز ہوتی ہے۔ جس وقت وہ سوچ بورڈ کا بٹن دبا کر "نمبر پلیز؟" پوچھتی ہے تو بہت سے صاحب دل نمبر بتانے کی جگہ دردِ دل، دردِ جگر اور غمِ جاناں کی داستان سنانے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ زوبی کی آواز میں ایک عجب پیار، ایک عجب سوز، ایک حسین بے تکلفی ہے۔ جو سننے والوں کے دردہائے نہانی کو بے ساختہ چھیڑ دیتی ہے اور انھیں دعوت دیتی ہے کہ مجھے اپنا غم بتاؤ، مجھے اپنے زخم دکھاؤ۔ شاید کہ میں تمھارے کام آ سکوں ٹیلیفون کے تاروں میں زوبی کی آواز یوں چھن چھن کر آتی ہے۔ جیسے رستے ہوئے زخموں اور جلتے ہوئے ناسوروں پر الٹرا وائلٹ شعاعیں پڑ رہی ہوں۔ لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ادھر زوبی نے پوچھا "نمبر پلیز؟" اور ادھر نمبر کی جگہ نام بتایا گیا۔ اور نام کے بعد فرمائش ہوئی کہ "ڈارلنگ، تمھارا پیارا نام کیا ہے؟" "سویٹی، تمھاری ڈیوٹی کے بجے سے کے بجے تک ہوتی ہے؟"

"آج شام پکچر؟" ایسے موقعوں پر زوبی سوچ بورڈ سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور پھر کئی کئی گھنٹوں تک ٹیلیفون کے تار اس کی آواز کی موسیقی کے بغیر ویران رہتے ہیں اور بنی نوع انسان ان بنفشی شعاعوں کی مسیحائی سے محروم ہوجاتی ہے۔

جس ایکسچینج میں زوبی کام کرتی ہے، وہاں ٹیلیفون کے کوئی سات سوا سات سو نمبر ہیں۔ ٹیلیفون آپریٹروں کی تعداد چھ ہے۔ دو مرد اور چار لڑکیاں۔ زوبی کے علاوہ مس پروین اور مس ڈی سوزا جوان اور خوبصورت لڑکیاں ہیں۔ چوتھی کا نام مس پری جمال ہے۔ مس جمال کے نام میں جو لطافت ثلاثہ ہے، وہ صریحاً جھوٹ ہے۔ دھوکہ ہے، فریب ہے۔ نہ تو وہ مس ہے۔ کیونکہ اس کی شادی ہوئے بارہ برس ہوچکے ہیں۔ اور وہ دو لڑکیوں اور تین لڑکوں کی ماں ہے۔ نہ ہی اسے کسی زاویۂ خیال سے پری کہا جاسکتا ہے اور جمال اگر اس کے شوہر نامدار کا لقب ہو تو خیر، ورنہ وہ جمال سے بھی اتنی ہی دُور ہے، جتنی کوہ قاف سے۔ تاہم اسے اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور ابھی تک کسی نے محکمۂ ٹیلیفون کے پاس اس امر کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ ان چاروں کے علاوہ ایکسچینج میں دو مرد ہیں۔ ان کی حیثیت اخباری ضمیموں کی سی ہے۔ چنانچہ جب تک کوئی خاص حادثہ درپیش نہ آتے۔ ان کا وجود بے کار اور بے سود سا رہتا ہے بس پھر وہ اپنے اپنے سوچ بورڈ کے سامنے بیٹھ کر پان چباتے ہیں۔ بیڑی پیتے ہیں۔ لڑکیوں کو گھورتے ہیں۔ اور کبھی کبھی مس پری جمال کے ہونے والے چھوٹے بچے کا نام منتخب کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمہ کیے ہوئے جاسوسی ناول پڑھنے کا شوقین ہے اور دوسرا اپنے فرصت کے لمحات میں تعزیرات ہند کی ایک کہنہ سال، بوسیدہ جلد کا مطالعہ کیا کرتا ہے۔ یہ بات نہیں کہ خدانخواستہ اسے کسی کچہری وچہری سے واسطہ پڑتا ہے یا پڑنے کا احتمال ہے۔ بلکہ وہ ٹیلیفون کے نمبروں کا تعزیرات ہند کی مختلف دفعات سے مقابلہ کرنے کا بے حد شوقین ہے اور

اس عمل سے اسے ٹیلیفون والوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق حیرت انگیز انکشافات کرنے میں یدِطولیٰ حاصل ہے۔

علم ہندسہ کی یہ نئی صنعت ایکسچینج والوں کا محبوب مشغلہ ہے اور اس کی مدد سے انھوں نے بہت سے معززین شہر کے جسمانی، دماغی، جنسی اور روحانی رجحانات کی نسبت عجیب وغریب نظریات قائم کر رکھے ہیں۔ چنانچہ ٹیلیفون نمبر ۱۲۱ والے قاضی ابوالحسن برکات جو مسجدوں میں شریعت لا کے متعلق لیکچر فرماتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ پیشین گوئی ہے کہ وہ کسی روز خطبۂ بغاوت ارشاد فرمانے کے بعد کالے پانی کی راہ لیں گے۔ چوہدری عبدالعزیز ڈسٹرکٹ سول افسر کو بے تکلفی سے رشوت لینے کا حق پہنچتا ہے۔ کیونکہ ان کے ٹیلیفون کا نمبر ۱۶۱ ہے اور ۴۹۸ نمبر والے سردار حشمت اللہ خاں سوزا اپنی خوبصورت سُرخ سنگر کار میں جو ہر روز ایک نئی حسینہ اڑائے پھرتے ہیں۔ وہ یقیناً دوسرے لوگوں کی بیویاں ہوتی ہوں گی!

اسی طرح ٹیلیفون نمبر ۳۷۶، ۳۷۷، ۴۲۰، ۳۰۲ والے بزرگوں کی نسبت بھی ریسرچ کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ لیکن جس وقت نمبر ۳۰۲ کی باری آتی ہے تو ایکسچینج کی جیوری میں شدید اختلاف رائے پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ ٹیلیفون نمبر ڈاکٹر نسیمہ اختر کے نرسنگ ہوم میں نصب ہے اور تعزیرات ہند کی رُو سے اس پر قتل کا جرم عاید ہونا چاہیے۔ مس پری جمال کا خیال ہے کہ یہ ٹیلیفون نمبر غلط جگہ لگا ہوا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر مس نسیمہ اختر تو بڑی شریف النفس، سلیقہ شعار، نیک دل خاتون ہے۔ مس پری جمال اپنی زچگی کے سیزن اسی کے نرسنگ ہوم میں گزارا کرتی ہے اور اس نے وہاں کبھی کسی قسم کا گول مال نہیں دیکھا البتہ اگر اسے شکایت ہے تو بھاری فیس کی ہے جو ہر بار اس بے چاری کی پیٹھ توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اگر مس پری جمال کے کمر ہوتی تو یقیناً اس جگہ کمر ٹوٹنے کا محاورہ زیادہ فصیح ہوتا۔ لیکن حقائق کو زبان کی صحت پر قربان نہیں کیا جاسکتا! اس لیے اس کے برعکس

دوسرے مرد آپریٹر کی رائے ہے، کہ ڈاکٹر مس نسیمہ اختر کے ٹیلیفون پر ۴۰۲ کا نمبر یُوں فٹ آتا ہے جیسے اس کے بدن پر ۳۸ انچ چھاتی والا بلاوز یا اس کے پاؤں میں باٹا کا ۵ نمبر والا سینڈل - یہ تفصیلات اس نے ڈاکٹر نسیمہ کی پوربن آیا سے بڑی کاوش سے فراہم کی ہیں - کیونکہ وہ اسی کے محلّے میں رہتی ہے اور کبھی کبھی پان بیڑی کے لیے پیسے وصول کرنے چوری چھپے اس کے ہاں بھی آجایا کرتی ہے - اس آپریٹر کا نظریہ یہ ہے کہ ڈاکٹر مس نسیمہ کو قاتل نہ سمجھنا بھی حد درجہ کی بے ذوقی اور کور مذاقی ہوگی۔ کیونکہ، تیری آنکھیں نہیں یہ تو تیر ہیں! اور یہ مصرعہ گاتے گاتے اس کے مُنہ سے پانوں کی پیک میں غلطیدہ رال ٹپک ٹپک کر منشی تیرتھ رام فیروز پُوری کے ناولوں کو رنگین سے رنگین تر کرنے لگتی ہے - البتّہ ڈاکٹر نسیمہ کے نرسنگ ہوم اور اس کے سنگین ٹیلیفون نمبر کی رمز اگر کوئی سمجھتی ہے تو مس ڈی سوزا ہی پُوری طرح سمجھتی ہے - کیونکہ ایک بار اس نے بھی چند ہفتے اس کی نرسنگ ہوم میں گزارے تھے اور اس نے یہ راز بڑی مشکل سے محض مس پروین کو بتایا تھا - چنانچہ وہ دونوں اپنے اپنے سوچ بورڈوں پر جُھک کر ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتی ہیں اور چپکے چپکے مُسکراتی ہیں، جیسے موقع واردات پر ملزم کو پکڑ کر پولیس کا تھانیدار اپنی لانبی لانبی گھنی مونچھوں کے درمیان کامیابی سے مسکرائے۔

زوبی ان قانونی موشگافیوں میں حصّہ نہیں لیتی اور نہ ہی اسے دوسرے لوگوں کے جسمانی یا روحانی غلافوں کے نیچے جھانکنے کا شوق ہے البتّہ اسے اس امر پر ایک گونہ اطمینان ہے کہ ایکسچینج کے نجومی ۱۱۰ نمبر ٹیلیفون پر اپنی قانونی دوربینیں لگانے سے قاصر ہیں - ایک روز اس نے چوری چوری تعزیراتِ ہند میں دفعہ نمبر ۱۱۰ تلاش کرنے کی کوشش کی، جیسے کوئی شرمیلی کنواری چُھپ چُھپ کر دیوان سے اپنے منگیتر کے نام پر فال نکالے لیکن زوبی نے دیکھا کہ یہ نمبر تو قانون کی دسترس سے بھی باہر ہے - ہر جرم سے پاکیزہ

ہے - ہر الزام سے بری ہے - ہر گناہ سے بلند ہے اور اس خیال سے اس کے گالوں پر کچھ فخر، کچھ حیا، کچھ سرور کی سُرخی غازے کی طرح پھیل گئی - کچھ ایسی ہی سُرخی، مس ڈی سوزا کے چہرے پر بھی نمودار ہُوا کرتی ہے - لیکن اسی روز جب اس کے باپ سے بچی ہوئی رم کی بوتل اس کے ہتھے چڑھ جائے یا اس کو کیفے ہلال میں ڈانس اور تمبولا کے لیے جانا ہو - جس روز مس پروین کے منہ پر گلابی ڈورے جھلک رہے ہوں تو وہ پکار پکار کر کہا کرتے ہیں کہ آج تار گھر کی سیڑھیوں پر ٹیلیفون سپروائزر نے اسے زبردستی چوم لیا ہے - مس پری جمال کے چہرے پر خون کی نمایاں گردش عام طور پر ایک نئے برخوردار کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے - لیکن جب زوبی کے گالوں پر شفق کھلے، جب اس کے ہونٹوں پر گلاب کی پتیاں بکھر جائیں، جب اس کی آنکھوں میں کنول کے پھول تیرنے لگیں تو آسمان کے فرشتوں اور جنّت کی حوروں کے سوا اور کوئی نہیں پہچان سکتا کہ اس وقت ٹیلیفون نمبر ۱۱۰ کے تار میں ایک نغمہ سا لہرا رہا ہے - ایک پائل سی ناچ رہی ہے اور زوبی اپنے سوچ بورڈ پر جُھکی ہوئی پوچھ رہی ہے: "نمبر پلیز؟"

نمبر بتاتا ہے۔

زوبی نمبر دہراتی ہے۔

"شکریہ!" وہ کہتا ہے۔

اور ان چار فقروں کے سحر سے ایک نئے آدم ایک نئی حوا اور ایک نئی جنّت کی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے - زوبی کو یقین سا ہو چلا ہے کہ یہ ٹیلیفون اسی جگہ ہے جہاں اسے ہونا ہی چاہیے جس طرح تعزیراتِ ہند والے آپریٹر کو یقین ہے کہ اگر اس میں ۷۸۶ نمبر والا ٹیلیفون بھی ہوتا تو وہ ضرور جامع مسجد میں نصب کیا جاتا -

زوبی کا پورا نام زبیدہ ہے - زبیدہ رحیم بخش - زوبی محض بے تکلفی اور پیار کا نام ہے - چونکہ بلیشتر حضرات اس سے بے تکلف ہونے اور پیار کرنے کے شدت سے قائل ہیں -

اس لیے عموماً اسے زبیدہ کی جگہ زوبی ہی کہا جاتا ہے۔ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد اس نے پرائیویٹ میٹرک کیا۔ اور آج کل وہ ایف۔ اے کی تیاری کر رہی ہے۔ اسے کسی چیز سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اور اس نے کبھی ٹیلیفون پر چوری چوری دوسرے لوگوں کی گفتگو سننے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ اگر مس ڈی سوزا کھُلم کھُلا اپنے تجربات پر تبصرہ نہ کیا کرتیں، تو غالباً زوبی کو ساری عمر یہ معلوم نہ ہو سکتا کہ جس وقت خاں صفدر علی ٹیلیفون پر سیٹھ ہمت شاہ کی بیگم صاحبہ سے یہ کچھ کہہ رہا تھا کہ "آج آپ دونوں غریب خانہ پر کھانا تناول فرمائیں" تو اصل میں اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ آج شام خالی ہے۔ سیٹھ صاحب دورے پر جا رہے ہیں۔ "رات کے آٹھ بجے جم خانہ کے باہر انتظار کروں گا۔" اسی طرح ٹیلیفون کی اصطلاح میں زکام کا مطلب دردِ دل ہوتا ہے۔ مسجد میں سے سینما کا کام لیا جاتا ہے۔ گھر سے کلب مقصود ہے۔ لائم جوس سے وسکی کا پہلو نکلتا ہے اور موسم کی گرمی سردی میں حسن یار کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ یہ باتیں اپنے دزدیدہ رومانوں کی قوسِ قزح سے ایکسچینج کی فضا کو رنگین کر جاتی ہیں۔ انھیں سُن کر مس پروین کی پلکیں اس کی آنکھوں پر بوجھل ریشمی پردوں کی طرح گر جاتی ہیں۔ مس ڈی سوزا کے ہونٹ آتشدان کے سامنے پڑے ہوئے گلدستے کی طرح تمازت کھا کر خشک ہو جاتے ہیں اور کسی وقت مس پری جمال بھی دم بھر کے لیے ایامِ زچگی کی عبرت انگیز یاں بھلا کر اپنے ماحول کی ترنگ میں بہہ نکلتی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ٹیلیفون نے دوسرے ٹیلیفون کو گلے لگانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ ایک ریسیور نے دوسرے ریسیور کے ہونٹ چومنے کی کوشش کی تو اس وقت ایک قیامت سی آجاتی ہے۔ ٹیلیفون کے تاروں میں بجلیاں سی کڑکنے لگتی ہیں۔ سوئچ بورڈوں کی چابیاں الجھنے لگتی ہیں اور مس ڈی سوزا اور مس پروین بے تاب ہو کر ایک دوسرے کے بلا وزنک تار تار کر ڈالتی ہیں۔ کسی وقت مس پری جمال پر بھی رعشہ سا طاری ہونے

لگتا ہے۔ لیکن زوبی پر ان طوفانوں کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ یہ زبردست آندھیاں اس کے آنچل کو ذرا بھی نہیں ہلاتیں۔ وہ اپنے سوئچ بورڈ کے سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک قانونِ خدا ہے کہ عورتوں پر نبوت کا نزول نہیں ہوتا۔ پھر بھی جب نمبر ۱۱۷ پر لگا ہوا چھوٹا سا برقی قمقمہ ٹمٹمانے لگتا ہے تو طُور پر بجلی چمکتی ہے۔ زوبی موسیٰ کی طرح غش کھا کر گر نہیں جاتی بلکہ موسیقار آواز میں پوچھتی ہے۔ نمبر پلیز؟

وہ نمبر بتاتا ہے۔

زوبی نمبر دہراتی ہے۔

"شکریہ" وہ کہتا ہے۔

اور زوبی دل ہی دل میں سرشار ہو جاتی ہے۔

مس پروین کو اس نمبر سے چڑ ہے، اور مس ڈی سوزا کو بھی۔ ان کا خیال ہے کہ اس ٹیلیفون سے مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی اور دانت صاف کرنے سے خلال کی بُو آیا کرتی ہے۔ اس ٹیلیفون کا مالک دن بھر گاؤ تکیہ کا سہارا لیے پان چباتا ہوگا۔ اس کے پہلو میں ایک یا دو یا شاید شرعی لحاظ سے چار بیگمات اپنا اپنا اگالدان سامنے رکھے بیٹھی ہوں گی ...... دالان میں درجن بھر بچوں کی فوج کریا بہ بخشائے برحال ماکا ترانہ گاتی ہوگی اور وہ ہر کورٹ پر شکریہ بسم اللہ ماشا۔ اللہ کی مہارت کرتا ہوگا .... لیکن زوبی کے پردۂ خیال پر یہ نقوش کوئی نشان نہیں چھوڑتے۔ رات کے وقت جب وہ تار گھر کے عقب میں اپنے چھوٹے سے کوارٹر میں ایف۔ اے کے امتحان کی تیاری کرتی ہے تو کبھی کبھی اس کا دماغ ٹیلیفون کے تاروں کا سہارا پکڑ کر نمبر ۱۱۷ کی طرف رینگنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ طلسمی ہندسے اس پر طرح طرح کا سحر کرتے ہیں۔ کبھی وہ دُبِ اکبر کی طرح جگمگاتے ہیں۔ کبھی ان پر کہکشاں کا نور برستا ہے۔ کبھی وہ تاریک ویرانوں میں کھو جاتے ہیں۔ اور زوبی بھٹکتی جاتی ہے۔ گرتی جاتی ہے۔ ایک اندھے کنوئیں میں،

ایک عمیق غار ہیں۔ اور کوئی معزز فرشتہ اس کے دہانے پر وحی لے کر نازل نہیں ہوتا۔ کیونکہ عورتوں پر وحی کا نزول تقاضائے خداوندی کے خلاف ہے۔

کچھ دنوں کی بات ہے کہ زوبی کے دِل اور دماغ پہ کچھ حیرانی، کچھ پریشانی کے مبہم سے سائے لرزنے لگے۔ نمبر ۱۱۷ کئی روز سے خاموش تھا۔ اس ٹیلیفون کے پردۂ ساز سے جو رُوح پرور نغمے پیدا ہوتے ہیں، ان پر سکوت طاری تھا۔ اور اس کی خاموش کائنات کی ساری رنگینیاں صابن کے بلبلوں کی طرح مٹ رہی تھیں۔ رات کے وقت جب زوبی ایف اے کے امتحان کی تیاری کرنے بیٹھتی تو ۱۱۷ کے سحر کار ہندسے بھوتوں کا روپ بھر بھر کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے ہیں۔ صبح سے شام تک وہ منتظر رہتی تھی کہ نہ جانے کس وقت سوچ بورڈ پر نمبر ۱۱۷ پر لگا ہُوا ننھا سا قمقمہ روشن ہو کر ساری دُنیا کو اپنے نور سے لبریز کر دے گا۔ لیکن وہ تجلی چمکی پر نہ چمکی۔ زوبی سوچتی تھی کہ شاید وہ چلا گیا ہو۔ شاید وہ بیمار۔ شاید..... آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کی خیریت پوچھے؟ ایک چھوٹی سی ہمدردی کوئی گناہ بھی تو نہیں۔ اگر مس پروین اور مس ڈی سوزا نے دیکھ لیا تو بے شک وہ بڑی بڑی باتیں بنائیں گی۔ اور مس پری جمال تو حسد سے جل بجھ ہی جائیں گی۔ تعزیرات ہند والا آپریٹر بھی زیرِ لب مُسکرائے گا۔ لیکن بلا سے۔ یہ بھی کوئی جُرم ہے بھلا؟ اور آخر سوچ سوچ کر، ہچکچاتے ہچکچاتے، کانپ کانپ کر زوبی نے سب کی نظریں بچا کر نمبر ۱۱۷ کو ٹیلیفون کر ہی ڈالا۔ پلگ لگا کر اس نے ریسیور اٹھایا اور دھڑکتے ہُوئے دِل سے گویا اپنی قسمت کا فیصلہ سُننے لگی جو شاید ازل ہی سے لوحِ مقدس میں لکھا جا چکا تھا! ۱۱۷ نمبر ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جیسے نجد کے صحرا میں جرسِ ناقۂ لیلا..... یا جیسے کسی نے غفور الرحیم کی زنجیرِ عدل کو ہلا دیا اور ساتویں آسمان پر گھنٹیاں بج رہی ہوں.......

"ہیلو" ٹیلی فون نے کہا۔

"جی، معاف کیجیے، مَیں ٹیلیفون آپریٹر بول رہی ہُوں" زوبی نے اقبالِ جرم کیا۔

"کون آپریٹر؟" ٹیلیفون کچھ حیران سا ہُوا۔

"جی، زوبی۔ میرا مطلب ہے، زبیدہ رحیم بخش" اس کی زبان لڑکھڑائی۔

"ہاہاہا" ٹیلیفون میں ایک بلند قہقہہ صُورِ اسرافیل کی طرح گونجا "گرینڈ گرینڈ۔ فرمائیے، فرمائیے"

زوبی کچھ حیران ہُوئی، کچھ پریشان ہُوئی۔ لیکن دِل پر قابو پا کے اس نے کہنا شروع کیا "جی معاف فرمائیے۔ مجھے فکر ہُوا........ جی میرا مطلب ہے کہ آپ کا ٹیلیفون کئی روز سے خاموش تھا۔ مَیں نے سوچا کہ نصیبِ دشمنان کہیں آپ کی طبیعت خراب نہ ہو۔ جی، محض انسانی ہمدردی کے....."

"ہاہاہا" صُورِ اسرافیل اور بھی زور سے گونجا "مَیں سمجھا۔ تم شاید نصیر صاحب کے متعلق پوچھ رہی ہو۔ دیکھو مائی ڈیر، وہ تو یہاں سے تبدیل ہو چکا ہے لیکن خدا کی قسم! مَیں اپنے دوست کی ساری ذمہ داریاں بعنوانِ شائستہ سنبھال سکتا ہوں۔ ہاہا۔ زوبی ڈارلنگ، مَیں ٹھیک چھ بجے ایکسچینج کے باہر انتظار کروں گا۔ مائی گڈنیس گریشس۔ وہاٹ اے لائف۔ وہٹ اے ڈیم گلورلیس لائف....."

شام کے عین چھ بجے ایکسچینج کے دروازے پر ایک نیلے رنگ کی خوبصورت واکسٹر بیوک آ کے رُکی اور رحمت ایزدی نے زوبی پر اپنا نور کامل کر دیا۔

پکّے پکّے آم

علی الصبح جب ریل گاڑی جموں توی کے قریب پہنچی، تو بڑا حسین منظر تھا پنجاب کی جھلستی ہُوئی لو کی جگہ خنک ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ سامنے ایک پہاڑی پر جموں کا شہر آباد تھا۔ جیسے کسی نشیب پر کلیاں اُگی ہُوئی ہوں۔ پس منظر میں پہاڑوں کی چوٹیاں تہہ در تہہ متوازی خطوط کی طرح بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اور انہی کا نکتہ عروج برف پوش ہمالیہ کا وہ سلسلہ کوہ سے تھا، جو ان سب کے پیچھے ایک سنگلاخ چٹان کی طرح ایستادہ تھا۔

جس طرح جموّں کے پس منظر میں پہاڑوں کی بلند سے بلند تر چوٹیاں ہیں۔ اسی طرح جموّں شہر میں سب سے نمایاں چیز یہاں کے مندر ہیں۔ کالے مندر۔ سُرخ مندر۔ سفید مندر۔ سونے کی چادروں میں لپٹے ہُوئے زرکار مندر۔ رابرٹ لانگ نے دُوربین لگا کر ان کے کلس گننے کی کوشش کی لیکن جس طرح تارے گنتے وقت ہر خالی جگہ پر ایک نیا ستارہ جھلملانے لگتا ہے، بالکل اسی طرح ہر لمحہ کسی مکان یا درخت یا دیوار کی اوٹ سے

ایک نئے مندر کا کلس نمودار ہوجاتا تھا اور اس کی کوشش رائیگاں جاتی تھی حکیم گوراندتہ مل جو لاہور سے سوار ہوتے تھے۔ رابرٹ کی مشکل بھانپ کر اور کمال شفقت سے اس کی معلومات میں اضافہ فرمانے لگے۔ وہ ایک بھاری بھرکم کوٹ میں ان دوائیوں کی شیشیاں اور پیکٹ بھرے بیٹھے تھے جو وہ لاہور سے خرید کر لائے ہوئے تھے۔ اس کوٹ کے اندر کی طرف بے شمار تہہ خانے اور چور جیبیں بنی ہوئی تھیں اور وہ ٹٹول ٹٹول کر ہر خالی جگہ شیشیاں اور ڈبے ٹھونس رہے تھے۔ اس حرکت کے جواز میں فرمایا کہ ریاست میں دوائیوں پر تین سو فیصدی تک کسٹم ڈیوٹی عاید ہوتی ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے چنانچہ حکیم گوراندتہ ایسا ایماندار اور شریف انسان بھی مجبور ہے کہ وہ اپنے عجیب وغریب کوٹ کی جیبوں میں دوائیوں کو چھپا کر کسٹم ڈیوٹی بچاتے۔ وہ اپنے شہر کا مسیحا نفس اور ہر دلعزیز طبیب ہے۔ اس کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ مفلس و نادار مریضوں کو کم سے کم قیمت پر دوائیاں فراہم کرے۔ اس فرض کی انجام دہی میں اگر اسے کسٹم سے بچنے کے لیے چوری یا دھوکہ دہی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے تو یہ کوئی جرم نہیں، بلکہ عین ثواب ہے اخلاقیات پر طبع آزمائی کے بعد حکیم صاحب مندروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور رابرٹ لانگ کو اطلاع دیتے ہیں کہ جموں شہر میں ۲۷ مندر ہیں۔ سونے کی چادر میں منڈھا ہوا رگھناتھ مندر جس میں ضرورت کے وقت حضور مہاراجہ بہادر بنفس نفیس قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ دیوانوں کا مندر۔ وزیروں کا مندر۔ ٹھنہ کے راجپوتوں کا مندر، منادر کے ذیلداروں کا مندر...... ذات پات رتبہ بہ رتبہ، بنے ہوئے مندروں کی تفصیلات کے ساتھ حکیم گوراندتہ مل جموں کے نام کی وجہ تسمیہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اور راجہ جامبولوچن سے لے کر مہاراجہ ادھیراج شری ہری سنگھ تک بہت سی تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات میں کچھ اس طرح الجھے کہ ان کی تقریر کا مفہوم رابرٹ لانگ کی سمجھ سے بالاتر ہوجاتا ہے۔ دراصل یہ حکیم صاحب کا قصور نہیں۔ کیونکہ وہ رابرٹ سے زیادہ اپنے مداری کے تھیلے

ایسے کوٹ اور دواؤں کے ڈبے کے ساتھ زیادہ مشغول ہیں۔ یوں بھی ایک خاندانی حکیم کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی غیر ملکی نامہ نگار پر وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنے اپنے غریب مریضوں کے لیے سستی دوائیں فراہم کرنے کی زیادہ کوشش کرے۔

اس ڈبے میں ایک سردار جی بھی ہیں۔ غالباً کپڑے کے تاجر ہیں اور اپنے غریب گاہکوں کے لیے سلک، بوسکی اور جارجٹ سستے داموں فراہم کرنے کی سر توڑ کوشش فرما رہے ہیں۔ اپنے کپڑے اتار کر وہ سلک، بوسکی اور جارجٹ کے ٹکڑے اپنی ٹانگوں، پیٹ، چھاتی اور بازوؤں پر تہہ در تہہ لپیٹ لیتے ہیں اور ان کے اوپر پاجامہ، قمیض واسکٹ اور کوٹ چڑھا لیتے ہیں۔

جس کے جسم کی ساری ہڈیاں کسی حادثے میں ٹوٹ گئی ہوں اور پلاسٹر آف پیرس لگا کر اسے سر سے پاؤں تک پٹیوں میں باندھ دیا گیا ہو حکیم گوراندتہ مل بھی اپنے کوٹ میں عجیب الخلقت چیز نظر آتا ہے۔ لیکن کیا کریں بیچارے دونوں اپنے احساس فرض سے بیحد مجبور ہیں۔

جموں میں ٹیکسیوں کا رواج نہیں۔ اس لیے رابرٹ لانگ حکیم گوراندتہ مل اور اپنے ہم سفر استاد جی کے ساتھ ایک تانگے میں سوار ہوجاتا ہے۔ کسٹم ہاؤس کے سامنے ایک وردی پوش محالدار تانگے کو روکتا ہے۔ اس کے آگے دو اور تانگوں کی تلاشی ہو رہی ہے۔ ٹرنک، سوٹ کیس اور بستر سڑک کے عین درمیان کھلے پڑے ہیں۔ کسٹم ہاؤس کا ایک جواں سال افسر جس نے کھلے گلے کی زرد قمیض اور سفید پتلون پہنی ہوئی ہے ایک برقعہ پوش عورت کے برقعے کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کی کمر اور سینے کی تلاشی لے رہا ہے۔ ایک دبلا پتلا مریل سا آدمی جو اس کا خاوند یا بھائی ہے پاس کھڑا غصے سے بل کھا کھا کر احتجاج کر رہا ہے۔ لیکن ایک وردی پوش سپاہی اپنے ہاتھ کا موٹا سا ڈنڈا دکھا کر اسے خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

رابرٹ لانگ حکیم گوراندتہ مل سے پوچھتا ہے کہ کیا اس ریاست میں عورتوں کے جسم پر بھی محصول لگتا ہے ؟

حکیم گوراندتہ مل حسبِ معمول اس کے سوال کی طنز آمیز تلخی کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ دہانہ پھاڑ کر ہنستا ہے اور رابرٹ کو ایک راز کی بات بتاتا ہے کہ مسلمان عورتوں کے ساتھ یہ حرکت جائز ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ سرکار کے خزانے کو دھوکہ دینے کے لیے انھوں نے اپنے برقعوں کے اندر مال چھپایا ہوا ہو۔

برقعہ کے اندر اچھی طرح ٹٹول کر کسٹم ہاؤس کا جواں سال افسر ناک بھوں چڑھاتا ہے اور اپنے پاس کھڑے ہوتے وردی پوش سپاہی کو حکم دیتا ہے "رام لال! جانے دو۔ وہاں پلپلے آموں کے سوا کچھ نہیں۔ جاؤ گڑوی میں پانی لاؤ اور میرے ہاتھ دھلاؤ۔ خواہ مخواہ بدمزہ ہو گئے صبح صبح"

دوسرے ٹانگے میں ایک شخص واویلا مچا رہا تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے سیالکوٹ سے سیر بھر مٹھائی لیتا آیا ہے۔ اب کسٹم والے ڈیڑھ روپیہ کی مٹھائی پر ۱۳ ؍ آنے محصول طلب کر رہے ہیں۔ اس بار سے بچنے کے لیے وہ ٹانگے میں بیٹھے بیٹھے جتنی مٹھائی کھا سکتا ہے کھا لیتا ہے۔ اور باقی ماندہ پر آس پاس منڈلاتے ہوتے وردی پوش سپاہی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

جب رابرٹ لانگ والے تانگے کی باری آتی ہے تو حکیم گوراندتہ مل ہاتھ جوڑ کر کسٹم ہاؤس کے جواں سال افسر کو سلام کرتا ہے۔ کیلاش جی نمستے۔ یہ صاحب بہادر ریذیڈنسی سے آئے ہیں۔ شاید سرکار کے لیے ضروری کاغذات لائے ہوں۔ معلوم نہیں گیسٹ ہاؤس کی کار ابھی تک کیوں نہیں پہنچی۔ جب سے سرکار نے کرنیل عدالت خاں کو گیسٹ ہاؤس کا انچارج بنایا ہے۔ سارا انتظام ہی درہم برہم ہو گیا ہے۔ خیر میں دکان پر پہنچتے ہی سارا انتظام کر دوں گا۔ بھلا سوچیے تو سہی کیلاش جی۔ ہم سرکار کی بدنامی کیسے برداشت کر سکتے

ہیں۔ اچھا کیلاش جی نمستے۔

کیلاش اپنی فیلٹ ہیٹ اٹھا کر رابرٹ لانگ کو سلام کرتا ہے۔ اور ان کا ٹانگہ بڑی عزت اور رعب کے ساتھ کسٹم ہاؤس سے روانہ ہوتا ہے۔ رابرٹ لانگ حکیم گوراندتہ مل کے سفید جھوٹ پر کسی قسم کا احتجاج نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ چال چلنے سے اس کے دو کیمرے، نصف درجن فلمیں، دوربین اور دیگر بہت سی اشیاء بھی بڑی صفائی کے ساتھ کسٹم کے جھنجھٹ سے بچ نکلتی ہیں۔

ڈاک بنگلہ پہنچ کر جب رابرٹ لانگ شیو اور غسل سے فارغ ہوا تو حسن علی خانساماں اپنی کتاب اٹھائے اس سے ناشتہ، لنچ اور ڈنر کا آرڈر لینے آیا۔

"جناب بریک فاسٹ پہ پوریج، ٹوسٹ، مکھن، جیم، چائے یا کافی اور فروٹ تیار ہوگا۔ صاحب انڈا بوائل مانگتا یا فرائی؟" حسن علی خانساماں لہجے اور زبان کے حساب سے جان میکفرسن کے بیرے افضل کی برادری کا قریبی رشتہ دار معلوم ہوتا ہے۔

رابرٹ لانگ نے کافی اور تلے ہوئے انڈوں کی فرمائش کی۔

لنچ کے لیے حسن علی خانساماں نے سوپ، مچھلی، کولڈ مٹن، سبزی، پلاؤ بنانا مری ٹرز اور کافی کا حکم لگایا۔

رابرٹ لانگ نے سر تسلیم خم کیا۔

جب ڈنر کی باری آئی تو حسن علی خانساماں اچکن کی پیٹی پہ ہاتھ باندھ کے رابرٹ لانگ کے حکم کے انتظار میں ہمہ تن گوش کھڑا ہو گیا۔

رابرٹ لانگ بھی سنبھل کر سیدھا ہو بیٹھا۔ معاً اسے شاہد کی بات یاد آئی کہ جموں اور کشمیر کے ڈاک بنگلوں میں ڈنر کے ہر کورس میں ایک نیا رومان پوشیدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب چکن کا حکم دیا جاتے تو خانساماں محض مرغی پکاتا ہے۔ لیکن اگر چوزے کی فرمائش ہو تو ۱۵ یا ۱۶ برس کی تازہ چھوکری حاضر ہوتی ہے اور مرغی مانگیے تو اس سے زیادہ ہر عمر اور ہر سائز کی

عورت ملتی ہے۔ رابرٹ لانگ کے چہرے پر شرارت کی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے حسن علی خانساماں پر کچھ طبع آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔

"خانساماں تمہارا نام کیا ہے؟" رابرٹ لانگ نے کچھ کچھ بے تکلفی کی ابتدا کی۔

"صاحب، ہمارا نام حسن علی خاں خانساماں ولد بخشن علی خاں خانساماں ہے تین پشت سے ہم برابر اس ڈاک بنگلے میں کام کرتا ہے۔" حسن علی اپنے نام کے ساتھ خاں التزام سے لگاتا تھا۔ جیسے شاعر تخلص کو استعمال کرتا ہے۔

"بہت خوب، تم بڑے خاندانی شخص نظر آتے ہو۔"

"ہمارا کیا منہ، جناب! ہم تو صاحب لوگ کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ آپ کی دعا سے تین پشت سے پیلس کا سارا سپلائی بھی برابر ہمارے ہاتھ سے جاتا ہے۔"

"آہا، پھر تو تم بڑے کار آمد اور تجربہ کار انسان ہو۔" رابرٹ لانگ نے خانساماں کو شہ دی۔

"صاحب! ہم اپنے منہ سے کیا بول سکتا ہے۔ ہم صاحب لوگ کا خدمت برابر اپنا فرض سمجھتا ہے۔"

"اچھا تو خانساماں، پیلس میں چوزہ زیادہ چلتا ہے یا مرغی؟" رابرٹ لانگ نے دریافت کیا۔

اس سوال پر خانساماں ذرا سنبھل کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کن انکھیوں سے بغور رابرٹ لانگ کا جائزہ لینے لگا۔

رابرٹ اس کی ہچکچاہٹ کو تاڑ گیا۔

"گھبراؤ نہیں، خانساماں،" اس نے کہا۔ "میں کوئی ریذیڈنسی سے نہیں آیا بلکہ محض ایک ٹورسٹ ہوں اور امریکہ میں لکھنے کا کام کرتا ہوں۔"

"صاحب امریکی ہے؟ صاحب ٹورسٹ ہے؟ صاحب بولتا کہ صاحب ریذیڈنسی سے نہیں آیا۔" خانساماں نے مزید اطمینان کے لیے تفتیش کی۔

"ہاں، خانساماں! تمہارا خیال بالکل درست ہے۔"

اب حسن علی خاں نے کچھ اطمینان کا سانس لیا۔ صاحب پوچھنا مانگتا ہے کہ پیلس میں مرغی زیادہ لگتا ہے یا چوزہ؟"

"ہاں، خانساماں۔ بالکل ٹھیک۔"

جواب دینے سے پہلے خانساماں نے بڑی احتیاط سے دائیں بائیں آگے پیچھے گھوم کر جائزہ لیا کہ کوئی ان کی باتیں تو نہیں سن رہا۔ اس نے دیکھا کہ برآمدے میں گلابو مہتر جھاڑو دینے کے بہانے ان کی طرف لپکا۔ "تخم خنزیر تم اس طرف اپنی ماں حرامزادی کے پاس آتا ہے؟ جاؤ دوسری طرف کام کرو۔ لعین۔ بےشرم کمینہ۔"

گلابو مہتر سے نپٹ کر خانساماں واپس آیا اور دوبارہ گردوپیش کا جائزہ لے کر اس نے رابرٹ لانگ کو اس بھید سے آگاہ کیا کہ مہاراجہ کے محل میں کم سن لڑکیاں اور جوان عورتیں دونوں برابر کام کرتی ہیں۔

"صاحب پہلے ہم برابر مسلمان چھوکری سپلائی کرتا تھا۔ کیونکہ اس وطن میں یہ جنس غریب سستا ہے۔ اس دن سے ہم کو بہت منافع بچتا تھا۔" حسن علی خانساماں نے اپنے منہ پر زور سے تھپڑ مار کر کہا۔ "صاحب اس وقت ہم کافر تھا۔ ہم خنزیر تھا۔ ہم شیطان کا بچہ تھا۔" اپنی شان میں ہر کلمے پر خانساماں اپنے دائیں اور بائیں رخساروں پر اس زور سے تھپڑ مار رہا تھا کہ اس کی آنکھوں سے بے اختیار پانی نکل آیا۔

"لیکن صاحب! باخدا اب ہم نے توبہ کر لیا ہے۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اب ہم مسلمان چھوکری کو اپنا ماں بہن سمجھتا ہے۔ اب ہم پیلس سے لے کر ڈاک بنگلے تک صرف ہندو چھوکری لگاتا ہے۔ اس میں ہم کو منافع بہت کم بچتا ہے۔ لیکن جناب پروا نہیں۔ اب ہم نے توبہ کر لیا ہے۔ باخدا۔" حسن علی خانساماں نے کندھے پر سے کابیاں صاف کرنے والا انگوچھا اتار کر پہلے اس سے آنکھیں پونچھیں اور پھر اس میں زور سے اپنی

ناک صاف کی۔

”صاحب جب حق تعالیٰ سے ہمارا حساب بے باق ہو جائے گا تو ہم فوراً یہ دھندا چھوڑ دے گا۔ صاحب ہم ہجرت کر کے مدینہ شریف چلا جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پہ سر پٹک پٹک کے اپنا گناہ کا معافی مانگے گا۔ صاحب ہم بڑا موذی گنہگار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نام پر حسن علی نے شہادت کی انگلیاں ملا کر چوما اور بڑی عقیدت سے اپنی آنکھوں پر لگایا۔

عورتوں کی دلالی اور روحانیت کے ذکر کے بعد حسن علی خانساماں نے سیاحت کی طرف توجہ مبذول کی اور بڑے بڑے رازدارانہ لہجے میں رابرٹ لانگ کو آگاہ کیا کہ پہلے وہ نیشنلی تھا لیکن اب مسلم کانفرنسی ہے۔ ”صاحب جب حضرت جناح صاحب جموں تشریف لایا تھا تو اللہ تعالیٰ کی برکت سے اس ڈاک بنگلے میں ٹھہرا تھا۔ صاحب ہم نے خود اپنے ہاتھ سے حضرت جناح صاحب کا کھانا پکایا تھا اور بوٹ صاف کیا تھا اور سوٹ پر استری کیا تھا۔“ حسن علی خاں نے اپنے ہاتھ اٹھا کر انہیں بڑے پیار سے دیکھا اور پھر تعظیماً انہیں اپنی سفید داڑھی پر ملا۔

ان انکشافات کے بعد حسن علی خاں خانساماں نے ایک بار پھر رکابیاں صاف کرنے والے انگوچھے سے ناک صاف کی اور پھر اچکن اور پیٹی کو درست کر کے اپنے آبائی انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”صاحب، آج رات جناب ڈنر پر چکن مانگتا یا چوزہ مانگتا یا مرغی مانگتا؟ ہم ہر چیز صاحب کی مرضی کے موافق پیش کرے گا۔“ اس نے دریافت کیا۔

رابرٹ نے صرف چکن کی فرمائش کی۔

آرڈر لینے کے بعد جب خانساماں رابرٹ کے کمرے سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ گلابو مہتر دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا ہے۔ حسن علی نے لپک کر اس کو

گردن سے پکڑ لیا اور اس کے منہ پر زور زور کے طمانچوں اور گھونسوں کی بارش برسانے لگا۔ جب اس کے ہاتھ تھک گئے، تو اس نے حسبِ توفیق پاؤں سے بھی گلابو بھنگی کی مرمت کی لیکن یہ حربہ کچھ زیادہ کام نہ آیا۔ کیونکہ حسن خانساماں ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا۔

مار کھانے کے بعد گلابو مہتر نے اطمینان کی سانس لی۔ اور خانساماں کے پاؤں پہ سر رکھ کے گڑگڑا کر کہا۔ ”خانساماں جی، اب تو اس غریب پر مہربانی کرو۔ تمہارے سر کی سوگند اب تو نتھیا بالکل تیار ہے۔“

تخم خنزیر، ابھی اس کا عمر بارہ برس ہے۔ تم اس کو کیسے تیار بولتا ہے؟ دو برس اور صبر کرو۔ قانون میں لڑکی ۱۴ برس سے پہلے بالغ نہیں ہوتا۔“

گلابو مہتر نے کچھ اور گڑگڑانا چاہا۔ لیکن حسن علی خانساماں نے اس کے منہ پر تھوک کر خاموش کر دیا۔ ”حرامزادے کے بچے، تم ہم کو جیل بھیجنا چاہتا ہے؟ ہم نابالغ چھوکری کو خراب کر کے اپنی عاقبت نہیں بگاڑے گا......“

خانساماں بڑبڑاتا ہوا، لنگڑاتا ہوا وہاں سے چل دیا لیکن گلابو مہتر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ دیر تک اسے حسرت و یاس سے دیکھتا رہا۔ نتھیا اس کی پانچ بیٹیوں میں سب سے بڑی لڑکی تھی۔ اور کالو نے اسے بڑے ارمانوں سے پالا تھا۔ زندگی کا ہر سال جو نتھیا کے خون میں گرمی اور اس کے بڑھتے ہوئے جسم میں تناؤ پیدا کرتا تھا۔ کالو کے لیے بڑی خوش آئند توقعات کا پیش خیمہ ہوتا تھا۔ نتھیا سارے خاندان کی امیدوں کا سہارا تھی۔ جب وہ جوان ہو گی تو حسن علی خانساماں کی مدد سے وہ ضرور ڈاک بنگلے میں دھندے پر لگ جائے گی۔ پھر تو بس گلابو کے دن بھی پھر جائیں گے۔ وہ تو نوکری چھوڑ کر چین کی بنسی بجائے گا اور دن رات جی کھول کر اپنی محبوب چرس پیا کرے گا۔ نتھیا کی کمائی سے اس کی چار چھوٹی بہنوں کی بیاہ شادی کا سامان بھی ہو جائے گا اور شاید نتھیا کی ماں کا علاج بھی ہو جائے جو کئی برس سے چارپائی پر لگی تپ دق کے مرض میں گھل گھل کر دم توڑ رہی ہے وہ نتھیا کی جوانی کا بڑے شوق اور بڑی بے صبری

سے منتظر تھا جس طرح آم بیچنے والا کچے آموں کو بھوسے میں دبا کر ان کے پکنے کا بیقراری سے انتظار کرتا ہے۔

اس وقت گلابُو بھنگی کو مہاراج ادھیراج کے خزانے سے مبلغ سات روپے آٹھ آنے ماہوار ملتے تھے۔ پچھلے سال جب سرکار ولایت سے پولو کا میچ جیت کر واپس آئے تھے تو اس خوشی کی یادگار میں اس کی تنخواہ میں چار آنے ماہوار کا اضافہ بھی ہوا تھا لیکن ان پونے آٹھ روپوں میں سے بارہ آنے میونسپلٹی کا داروغہ وصول کر لیا کرتا تھا۔ ایک روپیہ سونے کے کلس والے رگوناتھ مندر کے محکمہ دھرمارتھ میں داخل ہو جاتا تھا اور باقی چھ روپوں میں نہ تو گلابُو کو جی بھر کر چرس ملتی تھی۔ نہ اس کی بیٹیوں کی شادی بیاہ کا سامان ہو سکتا تھا، اور نہ ہی اس کی مدقوق بیوی کا علاج ممکن تھا۔ چنانچہ گلابُو بھنگی اور اس کا سارا خاندان کچھ عرصہ سے گلابُو جی یہ دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہو رہا تھا کہ نتھیا کا جسم جوانی کے تناؤ سے کمان کی طرح کھچ گیا تھا۔ اس کی سیاہ جلد کے نیچے گرم گرم خون کی سُرخی جوش کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بیقرار مخمور سی رہنے لگی تھیں۔ اور چال میں بھی ایک مستانہ سی لچک اور بے باکی آگئی تھی۔ یہ علامات گلابُو کے مستقبل کا پیش خیمہ تھیں۔ لیکن خانساماں کی باتوں نے اس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ حرامزادہ اسے ابھی دو برس اور صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔

اگرچہ جب پشپا پہلی بار پیلس گئی تھی تو اس کی عمر گیارہ برس سے ایک دن بھی زیادہ نہ تھی اور کملا اور رینکا اور شانتی اور پریتم اور جمنا...... اور یُوں بھی گلابُو مہتر کو زمانے کے اس عجیب انصاف پر بڑا غصہ آیا کہ قانون میں لڑکی ۱۴ برس سے پہلے جوان ہی نہیں ہو سکتی۔ کاش کہ قانون بنانے والوں نے ایک نظر اس کی نتھیا کو بھی دیکھا ہوتا۔

پھوڑے والی ٹانگ

نندہ بس سروس کی جس اسٹیشن ویگن میں رابرٹ لانگ کو جگہ ملی۔ اس میں پانچ سواریاں اور بھی تھیں۔ پرنس آف ویلز کالج جموں کے ایک کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب تھے جو کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہونے پر سری نگر جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی پنڈتانی بیوی صاحبہ تھیں۔ اگرچہ اس وقت جموں میں کوئی ۱۱۰ درجہ گرمی تھی لیکن حفظِ ماتقدم کے طور پر پروفیسر صاحب نے نسواری رنگ کے پٹو کا چوڑی دار پاجامہ، اس کا ہم رنگ گلے کا گرم کوٹ اور سر پر اونی کنٹوپ پہنا ہُوا تھا۔ کندھوں پر اعلیٰ پشمینے کی کتھئی رنگ کی کاڑھی ہُوئی چادر تھی۔ پروفیسر صاحب کے کوٹ کی جیبیں پھُول کر باہر نکلی ہُوئی تھیں۔ ایک میں نمک، الائچی، سیاہ مرچ، ادرک، لونگ اور دارچینی کی پڑیاں تھیں۔ دوسری جیب میں لیموں اور امرت دھارے کی شیشیوں کے ڈبے تھے۔ یہ انتظامات پروفیسر صاحب کی بیوی کے لیے تھے جسے بانہال روڈ کے پے دَر پے موڑوں پر شدید چکر آیا کرتے تھے۔ پنڈتانی نے سفید لٹھے کا فرن پہنا ہُوا تھا جو کلیسائی راہباؤں کے لبادے کی طرح

ٹخنوں ٹخنوں تک آتا تھا۔ پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں تھیں۔ سر پر گہرے سُرخ پشمینے کی خوبصورت
چادر تھی جس کے نیچے سے اس کی دراز زلفوں کا جوڑا سانپ کے پھن کی طرح جھانک رہا
تھا۔ ان کی عمر کوئی تیس برس کے قریب ہوگی۔ رنگ گورا تھا جس میں گلابی رنگ کی ہلکی سی
تحریر جھلک رہی تھی۔ جموں کی تمازت سے رخساروں کے گلاب مرجھا گئے تھے۔
اب سرینگر پہنچتے ہی ان پر تازگی آجائے گی اور اس کے گال پھر کانگڑی میں دہکتے ہُوئے
کوئلوں کی طرح تمتمانے لگیں گے۔ پنڈتانی کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی ناک
اور آنکھیں تھیں۔ اس کی ستواں ناک میں ایک ناقابلِ بیان نزاکت تھی، جیسے دودھیَ
بلور کو تراش کر اسے سانچے میں ڈھالا گیا ہو۔ اس کی گہری نیلگوں آنکھوں میں بڑا حسین
حزن تھا۔ جیسے سکوتِ شام میں کسی دور دراز جھیل پر سکون کی اداسی چھائی ہُوئی ہو۔
ماتھے پر قشقہ تھا۔ مانگ میں سہاگ کے سیندور کی لکیر تھی اور ہونٹوں پر اخروٹ کے چھلکے
کی سُرخی کبوتر کے خُون کی طرح چمک رہی تھی۔ پنڈتانی کے ہاتھ میں سُرخ، سبز اور نیلے
ابرک سے منڈھی ہُوئی ایک کانگڑی تھی۔ اس میں وہ گھر سے راکھ بھر کے لائی تھی تاکہ
بانہال سڑک کے موڑوں پر جب اس کا جی متلائے تو وہ آسانی سے اس میں قے کر سکے۔

اسی سٹیشن ویگن میں پرنس عبدالرحیم سمرقندی بھی تھے۔ ان کے ساتھ ان کی
بیگم صاحبہ کے علاوہ ایک حسین و جمیل جواں پارسی خاتون تھی۔ اس کا نام لولو تھا۔ اور
وہ پرنس سمرقندی کے ساتھ مسوری سے مہاراجہ بہادر کے مہمان کی حیثیت سے کشمیر
میں موسم گرما گزارنے آ رہی تھی۔

پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے گیبرڈین کی جودھپوری برجس اور بند گلے کا کوٹ پہنا ہُوا
تھا۔ سر پہ ہلکے فاختئی رنگ کی فیلٹ ہیٹ تھی۔ جس پہ موتیوں اور ہیروں سے جڑا ہُوا
مور کے پَر کا بروچ آویزاں تھا۔ پرنس سمرقندی کی عمر پینتالیس برس سے زیادہ نہ تھی لیکن
دیکھنے میں وہ کافی معمر نظر آتے تھے۔ اس کے سُرخ و سفید چہرے پر ریشم کے سلوٹوں کی

طرح جھُریاں ہی جھُریاں تھیں اور آنکھوں کے پپوٹوں کے نیچے سیاہی مائل حلقوں کے
درمیان سُوجے ہُوئے گوشت کی تھیلیاں سی لٹک رہی تھیں۔ اگر غور سے نظر جما کر
دیکھا جائے تو پرنس سمرقندی کے ہاتھوں میں رعشہ کی ہلکی سی کپکپاہٹ بھی تھی، جسے
چھپانے کے لیے وہ باتیں کرتے وقت اپنے ہاتھوں کو بار بار بڑے ڈرامائی انداز میں
جھٹکا کرتے تھے۔ جب وہ باتیں نہ کر رہے ہوں تو ان کے ہاتھ عموماً ایک خوبصورت
ریشمی اسکارف سے کھیلتے رہتے تھے جو ہر وقت اس مقصد کے لیے ان کی جیب
میں موجود رہتا تھا۔

بیگم سمرقندی کی عمر اپنے خاوند سے کوئی دس برس کم تھی۔ لیکن شکل و شباہت سے
وہ پچیس چھبیس برس کی نوخیز دلہن سے زیادہ نظر نہ آتی تھی۔ اس کا قد سرو کی طرح بلند
اور جسم چنار کی طرح   تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی غزالی تھیں۔ جلد میں ایرانی
قالینوں ایسی نرمی اور دبازت کا احساس تھا۔ اور رخسار قندھاری اناروں کی طرح
دہکتے تھے۔ بیگم سمرقندی کے بال کمر کمر تک لمبے تھے۔ اور وہ انھیں بڑی خوبصورتی
سے کھُلا چھوڑ دیتی تھی۔ اس کے سراپا میں جوانی اور صحت اور نسوانیت کی بڑی
دلکش تکمیل نظر آتی تھی۔

پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے اپنا شجرۂ نسب اصلی آرٹ پیپر پر سنہری حروف میں چھپوایا
ہُوا تھا۔ جس کے مطابق ان کا حسب نسب چند پُشت پہلے سمرقند اور بخارا کے شاہی خاندان
کے ساتھ ملتا تھا۔ جب ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب غروب ہُوا۔ تو پرنس
عبدالرحیم کے آباؤ اجداد غالباً اس ڈوبتی ہُوئی کشتی کو سہارا دینے کے لیے ہندوستان میں
وارد ہُوئے۔ یہاں آکر انھوں نے کمپنی بہادر کے نیچے بڑے بڑے عہدے حاصل کیے۔
ان کی دانست میں کمپنی بہادر ملکہ وکٹوریہ اعظم کے فرزند ارجمند کا اسم گرامی تھا، جو اپنی والدہ
ماجدہ کا سکہ چلانے کے لیے بہ نفسِ نفیس ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب

انھیں معلوم ہوا کہ کمپنی بہادر تو محض تاجروں کی ایک جماعت کا نام ہے، تو اس کی ملازمت کو انھوں نے اپنی شاہی خاندان کے روایات کے منافی سمجھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کو خیرباد کہا، اور ہندوستانی راجوں مہاراجوں سے تعلقات پیدا کیے۔ یہاں بھی انھیں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ چنانچہ پرنس عبدالرحیم سمرقندی اب تک بڑی وفاداری سے اپنے خاندان کی روایات پر گامزن تھے اور مہاراجگان کشمیر، پٹیالہ، الور، جے پور، بیکانیر وغیرہ سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ ان میں سب سے زیادہ لگاؤ انھیں جموں کشمیر کے مہاراجہ کے ساتھ تھا اور وہ پچھلے ستائیس برس سے برابر اس کی مصاحبت میں چلے آرہے تھے۔ اس وفاداری اور دوستی کے صلہ میں سرکار نے انھیں سرینگر کے قریب ایک وسیع و عریض باغ، ایک شاندار کوٹھی، دو پیکارڈ موٹروں کے علاوہ دربار میں کرسی نشین درجہ اوّل کا اعزاز عطا فرمایا تھا۔

راجوں مہاراجوں کی برادری میں پرنس عبدالرحیم سمرقندی کی بڑی مانگ تھی۔ ایک ماہر اور جدّی و پشتی درباری ہونے کے علاوہ وہ ایک اچھے دوست اور وفادار ساتھی بھی تھے اور ان کے کمالات کا شہرہ یورپ اور ہندوستان کے شاہی حلقوں میں عام تھا۔ مہاراجگان اور مہارانیوں کی مشکلات اور ضروریات کو فوراً بھانپ جانا اور چشم زدن میں ان کے حل فراہم کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مہاراجہ الور کی ضروریات کے پیشِ نظر پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ریاست میں ہر اسامی کے لیے درخواست کے ساتھ اُمیدواروں کی تازہ ترین فوٹو بھی ضرور آنا چاہیے۔ یہ زریں مشورہ کچھ ایسا کارآمد ثابت ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے راج پیپلا، چھتیس گڑھ اور ایسٹرن سٹیشن ایجنسی کے سب راجوں اور رانیوں نے اس رسم کو بڑے شد و مد سے اپنا لیا۔

مہاراجہ پٹیالہ کی اکتالیسویں سالگرہ پر پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے انھیں ایک بجلی کی مشین تحفہ دی تھی، جو اُنھوں نے خاص فرمائش کر کے پیرس میں بنوائی تھی۔ اس مشین

کی مدد سے مہاراجہ صاحب اکتالیس سال کی عمر میں بھی گیارہ عورتوں کی ٹیم کے ساتھ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ فٹ بال کا میچ کھیل سکتے تھے۔ یوں بھی شاہی خاندانوں پر پرنس سمرقندی کا فیض بڑا عام تھا۔ بانجھ مہارانیوں اور پیدائشی نامرد مہاراجوں کے ہاں ولی عہد پیدا کرنا ان کا خاص کمال تھا۔ جس کی برکت سے وہ ہندوستان کے بے شمار شاہی خاندانوں کی نسل برقرار رکھنے کے ذمّہ دار تھے۔ ریاست جموں وکشمیر پر بھی ان کا بڑا احسان تھا۔ جب حضور مہاراجہ بہادر کی عمر چالیس برس ہونے کو آئی اور یکے بعد دیگرے چار مہارانیوں کے باوجود راج محل میں ولی عہد کے کوئی آثار نظر نہ آئے، تو راج دربار میں بڑی تشویش پیدا ہونے لگی۔ خاندان کی بڑی بوڑھیوں نے ہر دوار جا کر چلّہ کشی کی۔ راج گرو نے سونے اور چاندی کی جھنکار سے اپنے سوتے ہوئے خداؤں کو جگانے کی کوشش کی۔ سونے کے کلس والے رگھوناتھ مندر کے پجاریوں نے بھی حسبِ توفیق ہاتھ پاؤں مارے۔ فرانس، جرمنی، انگلستان اور امریکہ سے بڑے بڑے ڈاکٹر بھی آئے۔ ایک یوگی کے کہنے پر خود مہاراجہ بہادر بھی صبح سویرے لنگوٹ باندھ کر شبنمی گھاس پر . . . . . . آسن کی مشق فرمانے لگے۔ لیکن شاہی نسل کے جو ناکے بند ہو چکے تھے، وہ بند ہی رہے۔ ساری ریاست کی ڈوگرہ اور راجپوت برادری پر مایوسی کا عالم چھانے لگا۔ ولی عہد کا نہ ہونا نہ صرف راج گدی کے لیے پیچیدگیوں کا موجب ہوگا بلکہ یہ ڈوگرہ اور راجپوتوں کی مردانگی پر بھی کلنک کا زبردست ٹیکا تھا۔ چوتھی مہارانی کانگڑے کی تھی اور وہاں کے راجپوت ابھی سے جموں کے ڈوگرہ راجپوتوں پر طعن و تشنیع پر اُتر آئے تھے۔ اس نازک وقت پر پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے اپنی کرامت دکھائی اور مہارانی تارا دیوی کے بطن سے ایک خالص سو فیصدی راجپوتی خون والا ولی عہد برآمد کر کے انھوں نے ریاست جموں وکشمیر کے ڈوگروں کی لاج رکھ لی۔ یہ معجزہ پیرس میں سرانجام دیا گیا تھا اور اس کی برکت سے مہاراجہ کو یوراج، مہارانی کو بیٹا۔ ٹھاکر جموال سنگھ کو ڈیڑھ لاکھ سالانہ جاگیر اور پرنس عبدالرحیم سمرقندی کو سری نگر

کے مضافات میں پھولوں اور پھلوں کے وسیع باغات عطا ہوئے تھے ۔

اسٹیشن ویگن میں داخل ہوتے ہی بیگم سمرقندی نے ناک بھوں چڑھا کر احتجاج کیا "ڈارلنگ ہم اس کباڑ خانے میں کیسے سفر کریں گے ؟ ہائے میرا تو یہاں دم گھٹتا ہے"۔ بیگم سمرقندی کے لہجے میں ایک خوبصورت سی بیگانگی تھی ۔ جو سمرقند اور بخارا کے شاہی خاندان کے افراد کے لہجہ میں بہرحال ہونی ہی چاہیے ۔

پرنس سمرقندی نے اپنی بیگم کو کم اور اسٹیشن ویگن کے دوسرے مسافروں کو زیادہ مخاطب کرکے اس بات کی صفائی پیش کی، کہ آج اپنی دو دو پیکارڈ گاڑیاں چھوڑ کر کرائے کی اس ویگن پر سوار ہونے کے لیے کیوں مجبور ہوئے ہیں ۔ ایک پیکارڈ جس پر وہ مسوری سے آ رہے تھے جموں پہنچ کر خراب ہوگئی ۔ اگر وہ سری نگر ٹیلیفون کر دیتے تو شام تک ان کی دوسری پیکارڈ بھی آجاتی ۔ لیکن جموں کی گرمی میں سارا دن کون بسر کرتا ؟ یوں بھی ان کے ایک اشارے پر صوبہ جموں کے سارے افسر، جاگیردار، سفید پوش اور کرسی نشین اپنی موٹر گاڑیاں ان کی خدمت میں پیش کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے لیکن اپنے آرام کے لیے دوسروں کو تکلیف پہنچانا ان کے اصول کے خلاف ہے "صاحب مہربان، صرف آٹھ نو گھنٹے کی تو بات ہے ۔ شام تک ہم لوگ سری نگر پہنچ جائیں گے ۔ اس وقت تک جس طرح گزارا ہو سکے گزارا کرنا چاہیے "۔

اس تقریر کے بعد اُنھوں نے مسافروں کے چہرے پر آئے ہوئے تاثرات کو غور سے بھانپا ۔ کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب نے ان کا رتبہ پہچان کر پرنس عبدالرحیم سمرقندی کو خوب جھک کر سلام کیا ۔ خاوند کا اشارہ پا کر ان کی پنڈتانی نے بھی اپنے مرمریں مخروطی ہاتھ جوڑ کر بیگم سمرقندی کو پرنام کیا اور وہ دونوں میاں بیوی (پچھلی) سیٹ پر یوں سمٹ کر بیٹھ گئے، جیسے انھوں نے ویگن پر سوار ہو کر پرنس سمرقندی کی شان میں کوئی بڑی گستاخی کی ہو ۔

رابرٹ لانگ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا ۔ جہاں سفید چمڑی سے واسطہ ہو ۔ وہاں پرنس سمرقندی ایک مختلف کے قائل تھے ۔ چنانچہ انھوں نے خود پیش قدمی کرکے رابرٹ کے ساتھ اپنا تعارف کرایا ۔ اور بڑی نیازمندی سے معذرت کی کہ ان کے ساتھ زیادہ سامان ہونے کی وجہ سے شاید اسے تکلیف ہوئی ہو ۔ رابرٹ لانگ نے خوش اخلاقی سے انھیں یقین دلایا کہ اسے مطلقاً کوئی تکلیف نہیں ہوئی ۔ اور حقیقت میں وہ بڑے آرام میں ہے ۔ اس تعارف کے بعد پرنس سمرقندی نے رابرٹ لانگ کو کد کے ڈاک بنگلے میں اپنے ساتھ لنچ کھانے کے لیے مدعو کیا ۔ بیگم سمرقندی نے بھی تائید کی اور رابرٹ نے شکریہ کے ساتھ دعوت قبول کر لی ۔

جموں شہر سے نکل کر جب گاڑی مہاراجہ بہادر کے موسم سرما کے محلات کے قریب پہنچی ۔ تو پرنس سمرقندی نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ تعظیماً اس مقام پر گاڑی کی رفتار بہت کم ہونی چاہیے ۔ جب تک محلات کے سامنے سے گزرتی رہی ۔ پرنس سمرقندی اپنی فلیٹ ہیٹ ہاتھ میں لیے مؤدبانہ بیٹھے رہے ۔ بیگم سمرقندی نے بڑے شوق سے لولو کو سرکار کے بیٹھنے، کھانے، اور سونے کے کمروں کی کھڑکیاں دکھائیں ۔ کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب نے رومال منہ کے سامنے کرکے پرنس سمرقندی کے اس اظہار وفاداری پر خوب ناک چڑھائی، اور کہنی مار کر اپنی بیوی کو بھی یہ تماشا دیکھنے کی تلقین کی، لیکن بیچاری پنڈتانی یہ منظر نہ دیکھ سکی، کیونکہ وہ اپنے فرن کے گریبان میں منہ ڈال کر کانگڑی میں بڑی شدت کے ساتھ قے کرنے میں مصروف تھی ۔

جموں سے ادھم پور تک بے آب و گیاہ پہاڑوں کا سلسلہ کوہ تھا ۔ نہ زیادہ چڑھائی تھی، نہ اُترائی ۔ لیکن سڑک بڑی پیچیدہ اور گھنگریالے بالوں کی طرح بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی ۔ کہیں کہیں بکریاں پہاڑ کی ڈھلوان پر جھاڑیاں چرتی ہوئی نظر آتی تھیں ۔ کہیں کہیں

اچانک کوئی پہاڑی جھرنا آجاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں چٹانوں پر ایسا جمود چھایا ہُوا تھا۔ کھیتوں میں خونخوار صورت اور بڑی بڑی مونچھوں والے ڈوگرے بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ یا اپنے جوتے ہاتھوں میں اٹھائے ننگے پاؤں مٹرگشتی میں مصروف تھے کبھی کبھی کسی پگڈنڈی یا موڑ پر اچانک کوئی ڈوگری آجاتی تھی تو فضا میں ایک بجلی سی کوند جاتی تھی۔ لانبے لانبے قد۔ رنگ برنگے چُست کرتے، سڈول ٹانگوں پر سانس کی طرح بل کھاتے ہُوئے چوڑی دار پاجامے۔ قوسِ قزح کی طرح فضا میں لہراتی ہُوئی رنگین چنریاں۔ گورا گورا رنگ، تیز تیز عقابی آنکھیں۔ اس حسن میں ایک عجیب جلال تھا۔ سر پر دودھ کی مٹکیاں یا لکڑی کے گٹھے اٹھائے جب یہ ڈوگریاں مستانہ چال سے پہاڑی پگڈنڈیوں پر چلتی ہیں تو فضا میں ایک ارتعاش سا چھا جاتا تھا۔ پرنس سمرقندی بڑی فصاحت اور بلاغت سے ڈوگری نسل کی فضیلت پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کیوں کہ حضور مہاراجہ بہادر بھی اسی نسل کے چشم و چراغ تھے۔ "مہربان صاحب یہ سمجھ لو کہ دُنیا میں بس دو خاندانوں کا خون اب تک ناپاک نہیں ہُوا۔ ایک تو سرکار کا خاندان مبارک ہے اور صاحب مہربان دوسرا خاندان شہزادگان سمرقندی کا ہے۔ ڈوگرہ نسل گنگا جل کی طرح پوتر ہے۔ اور خان صاحب مہربان، شاہزادگان سمرقندی کا خون آبِ زمزم کی طرح مصفّا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے جموّں شہر سے نکلتے ہی اپنے ہینڈبیگ سے کاک ٹیل شیکر، جن، بٹرز اور سنتروں کی بوتلیں نکال لی تھیں اور خانم سمرقندی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اپنے سرتاج کو لذیذ سے لذیذ کاک ٹیل تیار کر کے پیش کر رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پرنس سمرقندی بڑی فصاحت سے سرکار کے شکار کے شوق کی داستانیں سُنا رہے تھے۔ جب انھوں نے سرکار کے لیے سوّر، شیر، چیتے اور ریچھ کے شکار کے لاجواب انتظامات کیے تھے۔

کوئی آدھی درجن نوش جان فرما کے پرنس سمرقندی نے سرکار کو چھوڑ کر لولو کی طرف رجوع کیا جو بیزاری کے عالم میں بیٹھی مہاراجہ کے شکار کی تفصیلات اور خانم سمرقندی سے

مہاراجہ کے محلات کے مختلف کمروں کی کلر سکیم، فرنیچر، قالینوں اور پردوں کے حالات بیں سُن رہی تھی۔ نشے کی ترنگ میں آکر پرنس سمرقندی نے لولو کے دائیں رخسار کے تل پر انگلی رکھ کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بڑی رقت سے فرمایا:

"صاحب مہربان! اس دل آویز تل کی کیا بات ہے۔ لولو میری جان! ہمارے آباؤ اجداد نے تمہارے اس خال پر سمرقند اور بخارا کی بادشاہی قربان کر دی تھی۔ ہائے صاحب مہربان! بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را!"

لولو نے غصّے سے پرنس سمرقندی کا ہاتھ ایک طرف جھٹک دیا اور احتجاجاً ان کی بیوی کی طرف دیکھا۔ خانم مُسکرانے لگی "لولو! تُو ان کی باتوں کا خیال نہ کر، یہ تو تیرے باپ کی جگہ ہیں۔ ایسے ہی مذاق کرنا تو ان کی عادت ہے۔ سرکار کو ان کا مذاق بہت پسند ہے۔ ایک روز انھوں نے سرکار کے سامنے مہارانی کو چوم لیا تھا۔ پیلس میں بڑا شور ہُوا، لیکن سرکار نے کہا، کوئی بات نہیں، پرنس سمرقندی تو مہارانی کا بھائی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

لیکن لولو پر ان دلائل نے کچھ اثر نہ کیا۔ پرنس سمرقندی اب اس کے رخسار کے تل سے ہٹ کر اس کی کمر کی گولائی ناپنے پر اتر آئے تھے اور اس عمل میں بار بار اسے اپنی گود میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ برسرِ عام یہ اظہارِ عشق دیکھ کر لولو کا منہ غصّہ سے لال ہو گیا۔ اس نے ہاتھ گھما کر پرنس سمرقندی کے منہ پر ایک زنّاٹے کا طمانچہ رسید کیا اور "اوہ یو ڈیم سوائن" کہتی ہُوئی ان کے پاس سے اُٹھ کر دوسری سیٹ پر آ بیٹھی۔

لولو کے طمانچے نے پرنس سمرقندی پر خاطر خواہ اثر کیا۔ یکے بعد دیگرے دو اور کاک ٹیل اپنے گلے میں انڈیل کر وہ اپنی خانم کے ساتھ لپٹ گئے اور اس کی گردن پہ منہ رکھ کے بے اختیار رونے لگے۔ خانم بڑی شفقت سے اس کا سر سہلانے لگی اور رفتہ رفتہ ہچکیوں کے درمیان پرنس سمرقندی ایک معصوم بچے کی طرح سو گئے۔ خانم نے ان کا

سر بڑی احتیاط سے اپنی گردن سے اُٹھا کر اپنے زانوؤں پر رکھ دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سمرقندی اس گداز مخملیں تکیے پر لیٹے لیٹے خراٹے لینے لگے۔ خراٹوں کی شدّت سے پرنس سمرقندی کا جھرّی زدہ چہرہ ایک پُرانے فٹ بال کی مانند پھیلتا اور سکڑتا تھا جس میں بڑی کوشش سے ہَوا بھری جاتی، لیکن وہ ہر بار نکل جاتی۔ رخساروں اور ہونٹوں کے اس زیر و بم کے ساتھ ان کے مصنوعی دانتوں کا جبڑا بھی ڈھیلا ہو گیا تھا اور ہر خرّاٹے کے ساتھ یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ کھٹاک سے باہر آ پڑے گا۔ خانم سمرقندی نے اپنے ریشمی دوپٹے کا پلّو اپنے سرتاج کے چہرے پر ڈال دیا اور پھر ملامت سے پُر آنکھوں سے لولو کی طرف دیکھا۔

لولو سیٹ کے کنارے یُوں بیٹھی تھی۔ جیسے خطرہ کا اشارہ پاتے ہی اُٹھ کر بھاگنے پر آمادہ ہو۔ غصّے سے اس کا چہرہ تنا ہُوا تھا اور اس کے رنگ کی قدرتی پلپلاہٹ میں اب ایک ہلکی قرمزی جھلک بھی نمایاں تھی۔ خانم سمرقندی کو اپنی طرف گھُورتے دیکھ کر لولو نے خود بھی پیش قدمی کی۔ "مجھے افسوس ہے آنٹی۔ لیکن مَیں سری نگر نہیں جانا چاہتی۔ مَیں کد سے کسی بس پر واپس آ جاؤں گی۔"

لولو کا عزم سُن کر خانم سمرقندی کی آنکھوں سے ملامت کی خشونت یُوں غائب ہو گئی جیسے اُبلتی ہُوئی ہنڈیا کی بھاپ ہوا میں آ کر یکایک تحلیل ہو جاتی ہے۔ ملامت کی جگہ اب اس کی آنکھوں میں لجاجت، خوشامد اور عاجزی کے موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ وہ جلدی سے اُٹھی کہ لولو کو گلے سے لگا لے۔ اس عمل میں اسے سرتاج کا بھی خیال نہ رہا جو اس کے زانوؤں کے تکیے پہ سر ٹکائے مزے سے پڑا سو رہا تھا۔ بیگم سمرقندی جب سرعت سے اُٹھی تو پرنس سمرقندی کا سر تربوز کی طرح ہَوا میں اُچھل کر پہلے سیٹ کے گدّے پر گرا اور پھر کر کے سیٹ کی چوبی پشت کے ساتھ کٹاک سے ٹکرایا۔

لیکن بیگم سمرقندی کے مشاق ہاتھوں کے بنائے ہُوئے آٹھ کاک ٹیلز کا نشہ اتنا کچا نہ

تھا کہ اس معمولی سے جھٹکے سے ٹوٹ جاتا۔

"میری پیاری لولو جان!" بیگم سمرقندی نے لولو کو گلے سے لگا کر کہا "تم اتنی سی بات پر بگڑ گئیں۔ لو، تم میرے منہ پر جتنے طمانچے جی چاہے مار لو!"

بیگم سمرقندی نے اپنے گالوں کے قندھاری انار لولو کے سامنے جھکا دِیے لیکن یہ پیش کش بھی لولو کے غصّہ کو ٹھنڈا نہ کر سکی۔

"میری جان لولو۔" بیگم سمرقندی نے اب اپنی آواز میں رقت پیدا کر کے کہا "تم نے اس درویش کی بات کا بُرا منا لیا؟ دیکھو تو بیرا فقیر کس طرح ایک بے ضرر خرگوش کی طرح سویا پڑا ہے۔ مَیں نے پُورے پچیس سال اس کے ساتھ گزارے ہیں۔ خدا کی قسم، اس میں عورت کو ضرر پہنچانے کا مادہ ہی نہیں۔" یہ کہہ کر بیگم سمرقندی نے لولو کو معنی خیز انداز سے جھنجھوڑا اور اپنا چنار ایسا جسم تان کر جھرجھری سی لی۔ اپنے خاوند کی معصومیت کا دعویٰ کچھ جھوٹا نہ تھا۔ کیونکہ پچیس سالہ ازدواجی زندگی کے باوجود پرنس سمرقندی اپنے آباؤ اجداد کی شاہی نسل برقرار رکھنے کے لیے کوئی صورت پیدا نہ کر سکے تھے۔ یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ ہندوستانی ریاستوں کے لیے ولی عہد فراہم کرنے والا پرنس سمرقندی خود اس نعمت سے محروم تھا۔

پرنس سمرقندی کی جسمانی اور جنسی صلاحیتوں کی تفصیلات نے بھی لولو کے دل کو نرم نہ کیا۔ وہ بدستور منہ پھُلائے بیٹھی رہی اور کد سے کسی بس پر واپس آنے کا دوبارہ اعلان کیا۔

لولو کی اس ضد نے خانم سمرقندی کے اعصاب کو شل کر دیا۔ اس کے جسم کے شاندار چنار پر پت جھڑ کی سی بے رونقی چھا گئی۔ آنکھوں کے بڑے پیالے میں آنسو چھلک آئے اور خانم سمرقندی کو اپنے شاہی خاندان کا مستقبل بڑا تاریک نظر آنے لگا۔ کیا کیا جتن کر کے انھوں نے لولو کو سرکار کا مہمان بننے پر آمادہ کیا تھا۔ اب، اگر ولایت

ہی میں واپس لوٹ گئی، تو وہ سری نگر جا کر سرکار کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اپنے خطوط میں انھوں نے لولو کی دلآویز رعنائی، اس کے چھریرے بدن کی نزاکت اور اس کے کندن کی طرح دمکتے رنگ کو نئے نئے زاویوں سے پیش کیا تھا۔ اور اب سرکار بڑی شدت سے اس کی آمد کا انتظار فرما رہے ہوں گے۔ اگر لولو سری نگر نہ گئی تو شاہانِ سمرقند کی تاریخی ناک کٹ جائے گی۔ اور راج دربار میں ان کے رتبۂ عالی کو بڑا صدمہ پہنچے گا۔ راج دربار کا دستور تھا کہ ہر سال بہار کے موسم میں سرکار کے مقربینِ خاص بڑی جستجو کے بعد مہاراجہ بہادر کے لیے حسین و جمیل مہمان لایا کرتے تھے۔ حضور مہاراجہ بہادر کی ذات مبارک تو افلاطونی عشق کی اس منزل پہ پہنچ چکی تھی جسے مرزا غالبؔ نے یوں ادا کیا ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

چنانچہ جنسی لحاظ سے ان مہمانوں پہ تذکیر و تانیث کی کوئی قید نہ تھی، جسے ساغر ملتا تھا، وہ ساغر لے آتا تھا۔ جسے مینا میسّر ہوتی تھی، وہ مینا حاضر کرتا تھا۔ پچھلے ستائیس برس سے پرنس سمرقندی بڑی باقاعدگی سے ساغر و مینا کے اس کاروبار میں بڑھ چڑھ کے حصہ لے رہے تھے۔ سرکار کو ان کے حسنِ معاملہ پر بڑا بھروسہ تھا۔ اس وجہ سے دوسرے درباری دل ہی دل میں پرنس سمرقندی اور خانم سمرقندی کے خلاف بہت کڑھتے تھے۔ اب اگر وہ لولو کے بغیر سری نگر پہنچے تو ستائیس برس کے بے داغ اور شاندار ریکارڈ کے بعد ان کی یہ پہلی شکست ہوگی۔

خانم سمرقندی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپک رہے تھے، جو اس کے سلکی بلاؤز پر پھیل پھیل کر جذب ہو جاتے تھے۔ لولو بدستور غصّے کے جوش سے کمان کی طرح تنی بیٹھی رہی۔

مجھے افسوس ہے آنٹی! میرا ذرہ بھر بھی ارادہ نہیں کہ آپ کو کوئی رنج پہنچے۔ لیکن

میں آگے نہیں جا سکتی۔ مجھے کد سے واپس آنا ہی ہوگا۔"

"لولو، میری جان! تم بہت غصّے میں ہو۔ اس وقت تم میری کوئی بات نہ مانو گی۔ میرے درویش کو اُٹھنے دو۔ وہ تمھیں ضرور منا لے گا۔ میرا فقیر سب کو منا لیتا ہے۔ لولو میری جان! دیکھو اب چڑھائی شروع ہوگئی ہے۔ یہ لو، ایک فروٹ ڈراپ چوس لو، تمھاری طبیعت بشاش رہے گی۔" خانم سمرقندی نے اپنے پرس سے ایک لیمن ڈراپ نکال کر لولو کو دیا اور پھر آئینہ دیکھ کر اپنے چہرے پر مخملی پھر کے سے پوڈر کیا۔

اُدھم پور کے بعد بانہال روڈ کی چڑھائی شروع ہوگئی تھی۔ پیچ در پیچ چکر کھاتی ہوئی سڑک مہیب پہاڑ کے گرد ایک سیاہ اژدہے کی طرح لپٹی ہوئی جا رہی تھی۔ کشمیری پروفیسر کی پنڈتانی بیوی کا جی اب اور بھی متلانے لگا تھا۔ پروفیسر صاحب خود ہمہ تن گوش بنے بیٹھے تھے۔ اور پرنس سمرقندی خانم اور لولو کے ڈرامے کا ہر لفظ اور ہر سین بڑی محنت سے ذہن نشین کر رہا تھا۔ پے در پے چکروں کی وجہ سے رابرٹ لانگ کا جی بھی کچّا ہونے لگا تھا، اور وہ سیٹ پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کیے آرام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کوئی ایک بجے کے قریب جب اسٹیشن ویگن کد کے ڈاک بنگلے کے سامنے جا کر رُکی تو خانم سمرقندی کا معصوم درویش بھی اپنے مراقبے سے بیدار ہو چکا تھا اور پرنس سمرقندی اپنی پشت ہا پشت کی درباداری کے آداب جمع کر کے لولو کی خوشامد میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی زبان کی مٹھاس میں بہت سی ریاستوں کے تخت اور تاج اپنے تاجداروں سمیت ایک مکھی کی طرح بے دست و پا گرفتار تھے۔ بیچاری لولو کی کیا مجال تھی کہ ان کے سحر سے بچ نکلتی۔ چنانچہ جب پرنس سمرقندی اپنی خانم، لولو اور رابرٹ لانگ کے ساتھ ڈاک بنگلے میں لنچ پر بیٹھے، تو ساری رنجشیں بیئر کے جھاگ دار گلاسوں میں ڈوب کر مٹ چکی تھیں۔ اور مچھلی مرغ، پلاؤ، کوفتے اور ملائی دار سوئیوں کے ہر

کورس کے ساتھ دوستی اور وفاداری کا ایک نیا باب کھل رہا تھا۔

لنچ کے بعد قیلولہ کا اہتمام تھا۔ پرنس سمرقندی اور خانم لباس شب خوابی زیب تن کرکے ایک کمرے میں چلے گئے۔ لولو نے برآمدے میں آرام کرسی کو انتخاب کیا اور رابرٹ لانگ کو نظام دین سقے کی جستجو ہوئی، جو اس ڈاک بنگلے میں پانی لایا کرتا تھا۔ اس نے ڈاک بنگلے کے بیرے سے نظام دین کے گھر کا پتہ پوچھا۔

بیرا رابرٹ لانگ کی معلومات کی وسعت اور اس کے انتخاب کی صحت پر مسکرایا، "صاحب، اس کی ٹانگ میں پھوڑا نکلا ہوا ہے۔ دس بارہ روز سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہے۔ اور ڈاک بنگلہ میں پانی نہیں لاتا۔"

"کوئی بات نہیں،" رابرٹ لانگ نے کہا "تم مجھے اس کے گھر کا پتہ بتا دو۔ میں خود اسے دیکھنے جاؤں گا۔"

بیرے نے سر ہلا کر مایوسی کا اظہار کیا۔ "کوئی فائدہ نہیں صاحب۔ اس کے پاس بڑا اچھا دانہ ہے، لیکن وہ اسے ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔ وزیر وزارت صاحب، پولیس کپتان صاحب، تحصیلدار صاحب، تھانیدار صاحب، سب کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے بھی آپ جیسے صاحب لوگوں کے لیے بڑے بڑے جتن کیے ہیں۔ لیکن وہ حرامی نظام دین کسی طرح قابو میں نہیں آتا۔ اس کے پاس جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ صاحب!" اس اطلاع کے بعد بیرے نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر صاحب کا جی چاہتا ہے تو وہ دس منٹ میں خیرائیتی تیلی کی سترہ سالہ لڑکی لا سکتا ہے۔ شکل و صورت میں وہ کسی طرح نظام دین کی جمیلہ سے کم نہیں۔ اس کا خاص طرۂ امتیاز یہ ہے کہ ایک روز جب سرکار یہاں سے گزر رہے تھے، تو ان کی نظر خیرائیتی تیلی کی بیٹی پر پڑی جو ایک پتلی سی چادر اوڑھے نشیبی چشمے پر بیٹھی نہا رہی تھی۔ سرکار نے اپنی موٹر روکی، اور مووی کیمرہ نکال کر اس کے بہت سے فوٹو لیے.....

رابرٹ لانگ نے بڑی کوشش سے بیرے کو یقین دلایا کہ اس کو خیرائیتی تیلی کی بیٹی اور اس کے خاص اعزازات سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ وہ نظام دین بہشتی سے ملنا چاہتا ہے۔ کیا بیرا اس کی مدد کر سکتا ہے؟

بیرے نے طوعاً و کرہاً خیرائیتی تیلی کی بیٹی کا بیان چھوڑ کر رابرٹ لانگ کی طرف مایوسی سے دیکھا جو اس رنگین اور گداز حقیقت کو چھوڑ کر خواہ مخواہ نظام دین کا کھمبا نوچنے چلا تھا۔ خیر اس نے باورچی خانے سے ایک چھوکرے کو بلا کر رابرٹ لانگ کے ساتھ کر دیا کہ وہ اسے نظام دین سقے کے گھر لے جائے۔

پہاڑی پگڈنڈیاں چڑھتے چڑھتے رابرٹ لانگ کا سانس پھول گیا۔ لیکن ان کا راہنما لڑکا ایک سبکسار گلہری کی طرح بھاگتا، پھلانگتا، پھسلتا بڑھتا گیا۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر جا بجا خوشنما کوٹھیاں سانپ کی پھنوں کی طرح ایستادہ تھیں۔ کہیں کہیں جھرنوں کا سرود تھا۔ کسی جگہ ناشپاتی کے درختوں سے جھولے بھی لٹک رہے تھے۔ کوئی ڈیڑھ دو میل چل کر چیڑ کے گنجان درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنگل کی ہوا ان درختوں کے بیچ بڑی مہیب چیخیں مارتی ہوئی گزرتی تھی۔ ان چیخوں کے علاوہ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا اور اس سناٹے میں نظام دین سقے کی جھونپڑی واقع تھی۔ نظام دین اپنی جھونپڑی کے آگے ایک کھاٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے پھوڑے والی دائیں ٹانگ کھول کر دھوپ میں پھیلائی ہوئی تھی اور ہاتھوں سے پہاڑی سن ککڑے کی رسیاں بنا رہا تھا۔ ڈاک بنگلے کے چھوکرے کے ساتھ ایک گورے صاحب کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا، اور حفظ ماتقدم کے طور پر وہ اپنی لاٹھی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

"خبردار،" نظام دین نے ڈاک بنگلے والے چھوکرے کو ڈانٹ کر للکارا "تم اپنی ماں کے خصم کو کہاں لا رہے ہو؟ میں تم دونوں حرامزادوں کی گردن کاٹ دوں گا۔"

رابرٹ لانگ نے اپنی امن پسندی کے اظہار میں اپنا سفید رومال ہوا میں لہرایا۔

"تم یہ رومال اپنی ماں کو دکھاؤ"۔ نظام دین غصّے سے پاگل ہوکر چلّایا "یہ رومال اپنی بہن کو دو۔ یہاں کس سالی کے پاس آرہے ہو۔ جاؤ۔ خبردار، میں جان سے مار ڈالوں گا"

ایک چھوٹا سا پتھر سنناتا ہُوا آیا اور ڈاک بنگلے کے چھوکرے کے ننگے سر پر کھٹاک سے لگا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور نظام دین کو گالیاں دینے اور رونے لگا۔ رابرٹ لانگ نے دیکھا کہ نظام دین کے پیچھے ایک نوعمر لڑکی قمیص کی جھولی میں پتھر بھرے بپھری ہُوئی شیرنی کی طرح کھڑی تھی۔ بائیں ہاتھ سے اس نے جھولی تھامی ہُوئی تھی، اور دائیں ہاتھ سے وہ بڑی سرعت کے ساتھ پتھر نکال نکال کر رابرٹ لانگ کو نشانہ بنا رہی تھی، اسس کی وجہ سے اس کے گال تمتما رہے تھے اور اس کے پریشان بالوں کی ایک لٹ غصیلی ناگن کی طرح بل کھاتی ہُوئی بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی۔ رابرٹ لانگ پچھلی جنگ میں کئی محاذوں کا دورہ کر چکا تھا اور گولیوں کی بوچھاڑ میں اسے آگے بڑھنے کی کافی مشق تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی ہیٹ کو ڈھال کی طرح سامنے کر کے سر جھکا لیا اور تیز تیز قلانچیں بھرتا ہُوا نظام دین کے پاس پہنچ گیا۔ جمیلہ سفیدے کے بوٹے کی طرح کانپنے لگی۔ پتھروں کی جھولی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ ایک زخم خوردہ ہرنی کی طرح دردناک چیخیں مارتی جھونپڑے میں بھاگ گئی۔ نظام دین نے اپنی لاٹھی ہوا میں گھما کر رابرٹ لانگ پر وار کرنا چاہا۔ لیکن اس کی چھوڑے والی زخمی ٹانگ نے اُس کا ساتھ نہ دیا اور وہ تیورا کے چارپائی پر گر گیا۔ اس بے بسی کی حالت میں اس نے بھی وہی کیا جو ہر بے بس انسان کرتا ہے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگا۔

سٹینوگرافر

یہ شاید اس کا پہلا شعر تھا۔

"میرے سپنوں کے باغ میں دبے پاؤں کون آیا؟ مالی! اسے تھام لے! وہ میرے شبنم کے موتی چرا رہا ہے!"

ٹائپ کیے ہُوئے کاغذوں کے پلندے میں شاید وہ اپنا پرائیویٹ نوٹ پیپر رکھ کے بھول گئی تھی۔ مَیں نے میز کی گھنٹی بجا کر اسے بلایا۔

"دیکھو گریسی، یہ شاید تمہارا کاغذ ہے"

"یس سر!" وہ جھینپی، اور پھر اس کا گلا بھر آیا۔ جیسے مَیں نے اس کی ٹائپنگ میں ہزاروں غلطیاں پکڑ لی ہوں "سوری سر! میری بھول سے دوسرے کاغذوں میں چلا آیا ہے"

"جب تمہاری غزل پوری ہو جائے مس، تو مجھے دکھانا!" مَیں نے مذاقاً کہا۔

اس نے ٹرے کی فائلوں کو اکٹھا کیا اور جلدی سے نکل گئی۔

اس روز شاید وہ سارا دن اپنی مکمل ہونے والی غزل میں کھوئی رہی۔ صبح صبح میں نے کئی ضروری سرکلر لکھائے تھے۔ وہ شام تک ٹائپ کر کے نہ لائی۔

میں نے بلا کر پوچھا "سب کاغذ ضروری ہیں مس! ابھی ختم نہیں ہوئے؟"

"سوری سر! میں فوراً لاتی ہوں۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"اور غزل؟" میں نے طعنہ دیا۔

میرا خیال ہے، میرے اس طنز سے اس کے دل پر چرکا سا لگا۔ غالباً وہ اس اچانک چوٹ کے لیے تیار نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد چپڑاسی ساری ٹائپ شدہ فائلیں لے آیا۔

عموماً مجھے اس بھولی سی لڑکی پر ترس آتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تیر کی طرح سیدھی اور بے بل تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سکول کا نیلا فراک پہن کر دفتر آیا کرتی تھی۔ اب تک اس میں کلاس روم کی عادتوں کا پرتو تھا۔ سکول کی لڑکیوں میں جو الھڑ سی بے باکی ہوتی ہے، گریسی میں ابھی تھی۔ اس کو فائلوں کے انبار نے پامال نہیں کیا تھا۔ ایک دن لکھاتے لکھاتے میں نے گرامر کی غلطی کی۔ گریسی نے ٹوک دیا۔

"دونوں طرح ٹھیک ہے۔" میں نے اپنی پوزیشن کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھا!

"نہیں، سر نیلسن کی ہائی گرامر میں اسے غلط ٹھہرایا گیا ہے۔"

میں نے ہار مان لی۔ مجھے تلاش کے باوجود بھی اس کے ٹائپ کیے ہوئے پلندوں میں املا کی غلطی نہ ملتی تھی۔ اگر وہ سکول چھوڑنے سے پہلے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کر لیتی تو شاید دفتر میں اسے اگلا گریڈ مل جاتا۔

جب وہ کاغذوں کے ڈھیر میں ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھتی تھی تو یوں نظر آتا تھا جیسے ایک سنجیدہ سے بچے کو زبردستی بزرگوں کے کپڑے پہنا دیے ہوں۔ وہ بولتی بہت کم تھی۔ میں نے دو چار دفعہ اتفاقاً اسے ہنستے دیکھا تھا۔ ایک بار اس وقت جب کچھ لکھاتے لکھاتے میری پنسل میز سے پھسل کر نیچے جا پڑی، میں نے دونوں پاؤں جوڑ کر

کئی بار اسے اٹھانے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ پھر میں نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو بلایا۔ اس نے پنسل اٹھا دی۔ گریسی بے اختیار ہنس پڑی۔

"کیا بات ہے مس؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں سر۔ مجھے کنگ بروس اور مکڑی کا قصہ یاد آ گیا تھا۔"

چوٹ برجستہ تھی۔ لیکن مجھے زیادہ نہ بھائی۔ شاید گریسی کو بھی میرے تیور برے لگے۔ لیکن یہ میرا قیاس ہی قیاس ہے کیونکہ اس کا گول مول چہرہ اسپنج کی طرح تھا جس میں جذبات کے پرنالے بھی ہوں تو نشان چھوڑے بغیر جذب ہو جائیں۔

دوسری بار جب میں نے اُسے ہنستے دیکھا تو نازک موقعہ تھا۔ اس روز دفتر کی ایک لیڈی اسسٹنٹ مس مارگرٹ نے دو ماہ کی چھٹی کے لیے درخواست بھیجی تھی۔ کلرکوں میں کانا پھوسی ہو رہی تھی اور وہ اپنے سکیشن کی ٹائپسٹ لڑکیوں کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ لڑکیاں جھوٹ موٹ ٹائپ کی مشینوں پر انگلیاں مار کے ایک بھدا سا ترنم پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور مارگرٹ کی افسوس ناک مجبوریوں پر زیرِ لب تبصرہ ہو رہا تھا۔ گریسی نہ مسکراہٹوں میں شامل تھی۔ نہ چہ میگوئیوں میں وہ حسبِ معمول کاغذوں کا پلندہ لیے کھٹ کھٹ ٹائپ کر رہی تھی۔

"بدمعاش!" دفتر کے ہیڈ اسسٹنٹ ایلش بابو نے مارگرٹ کی درخواست پر سفارش نوٹ لکھتے ہوئے کہا "یہ اینگلو انڈین چھوکریاں آگا پیچھا تو دیکھتی نہیں اور پھر دو مہینے کی چھٹی مانگتی ہیں۔ دفتر نہ ہوا، باوا گھر ہوا۔ کس نے کہا تھا کہ سالے ٹامیوں کے ساتھ دن رات رکشا میں گھوما کرو۔" ایلش بابو نے قلم کان میں گھما کر کچھ ایسی ادا سے کہا، جیسے ٹامیوں کی بجائے اگر مارگرٹ اس کے ساتھ رکشا میں گھومتی تو گویا محفوظ رہتی۔

پھر ایلش بابو نے کھسیانی بلی کی طرح کن انکھیوں سے گریسی کی طرف دیکھا اور آواز میں لوچ پیدا کر کے بولے "مس گریسی، تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر مارگرٹ کے لیے صرف

ایک مہینہ کی چھٹی کی سفارش کردوں تو کام چل جائے گا نا؟"

گریسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھٹ کھٹ کھٹ ۔۔۔۔۔ ٹائپ مشین چل رہی تھی۔

"مغرور ہے سالی" ایلش بابو جل کر بولے۔ پھر انھوں نے ٹائپسٹ لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ "دیکھ لوں گا، جب سالی خود اپنی درخواست بھیجے گی۔"

لڑکیوں نے ایلش بابو کی خوشامد کے طور پر ہلکے ہلکے قہقہے لگائے، گریسی کا منہ تمتا گیا۔ اس نے دھکے سے ٹائپ مشین پرے دھکیل دی، اور اپنی فائلوں کا پلندا اٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ دفعتاً کمرے میں سکوت چھا گیا۔ کنفیڈنشل فائلوں کے ٹکڑے دیکھ کر سارے کلرک سہم سے گئے۔ ایلش بابو کان میں قلم گھماتے میرے کمرے میں آئے۔ میں نے گریسی کو بلا کر پوچھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "سوری سر۔ مجھے غصہ آگیا تھا۔"

غصہ! مجھے اس کی آزاد سادگی پر بہت ہنسی آئی۔ ایلش بابو کھسیانے ہوگئے۔

اگلے روز میں نے کئی کلرکوں کو دوسرے سیکشن میں تبدیل کر دیا۔

جس روز سٹینوگرافر کی آسامی کے لیے انٹرویو ہوا تھا، بہت سی لڑکیاں، امیدوار تھیں۔ قریباً سب نے اپنے چہروں کو خاص اہتمام سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ ان کی ساڑھیوں اور گاؤنوں میں سلیقے کے بل تھے۔ جن کے سہارے کمر اور سینے کے خطوط والہانہ طور پر عریاں ہو رہے تھے۔ گریسی نے فقط اپنے سکول کا نیلا فراک پہنا ہوا تھا۔ اور اس نے ابھی سینئر کیمبرج کا امتحان پاس نہ کیا تھا۔

انٹرویو کے وقت لڑکیاں زبان کی جگہ آنکھوں سے جواب دینے کی کوشش کرتی تھیں۔ ہر سوال پر ان کے ہونٹوں کی گلابی سی پتیاں ایک لطیف سی مسکراہٹ کو شگفتہ کرتیں۔ ان کی گردنوں میں ہلکے ہلکے خم اٹھتے، اور وہ اپنی زندگی کی ساری رعنائیوں کو اکٹھا کر کے بولنے کی جگہ گانے کی کوشش کرتیں۔ کسی کو پیانو میں مہارت تھی۔ کوئی مشاق

ڈانسر تھی۔ ایک نے موسیقی کے تمغے جیتے تھے۔ دوسری تیرنا بہت جانتی تھی جب گریسی کی باری آئی تو بورڈ کے صدر نے کوالی فی کیشن والا سوال دہرایا۔

"سر شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کرنا جانتی ہوں"۔ اس نے جواب دیا۔

"اور؟" بورڈ کے ایک ممبر نے کریدا۔

"سر شارٹ ہینڈ میں میری رفتار بہت تیز نہیں۔ لیکن میں مشق کر رہی ہوں"

"اور کچھ" دوسرے ممبر نے زور دیا۔

"سر آپ کو شاید سٹینوگرافر کی ضرورت ہے"، گریسی نے یاد دلایا۔

تڑاخ! ۔۔۔۔۔۔۔ انٹرویو بورڈ کے ممبر گویا ایک دھماکے کے ساتھ پیانو اور ناچ اور گانے کی محفل سے دفتر کے کمرے میں آگرے! معاً انھیں یہ محسوس ہوا، اس چھوٹی سی لڑکی نے ان سب کے کان کھینچ دیے ہیں۔ ان کی بزرگی اور عظمت کو ایک پوشیدہ سا جھٹکا لگا۔ لیکن شاید مجبور ہو کر انھوں نے گریسی کو رکھ لیا۔

جب گانے اور ناچنے اور تیرنے والی لڑکیوں نے دیکھا کہ ایک ننھی سی نیلے فراک والی چھوکری ان پر بازی لے گئی ہے تو ان کی گردنوں کے لوچ نکل گئے۔ ہونٹوں کی گلابی پتیاں بدنما طور پر بکھر گئیں اور انھوں نے ناک سکیڑ کر سوچا، آج یہ بورڈ کے ممبر کیا پہچانیں، بوڑھے کھوسٹ ۔۔۔۔۔۔۔

جب وہ پہلے روز دفتر میں آئی تو ایلش بابو سب سے اوّل چیل کی طرح اس پر جھپٹے جس طرح ہر نئی ٹائپسٹ لڑکی پر سب سے پہلے جھپٹنا وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ چالیس پینتالیس سال کی مستقل گردش میں ان کے اگلے دو دانت اور سر کے بہت سے بال گر گئے تھے۔ لیکن ان کا ایمان تھا کہ ریٹائر ہونے میں آٹھ دس برس باقی ہیں۔ جب سرکار کو خود ان کی جسمانی اور دماغی حالت پر مکمل بھروسہ ہے تو ان سالی چھوکریوں کے ناک بھوں چڑھانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہاتھ لگ جائے تو رشوت اور عورت ایک

برابر ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ اینگلو انڈین لڑکیاں تو ہاتھ کا میل ہیں، ہاتھ کا میل ۔ ۔ ۔ ۔ چلتی کا نام گاڑی ہے بھائی، روپیہ ہو تو سب حلال ہے۔ چنانچہ بابو ایلش چندر ہر مہینے اپنی بالائی آمدنی کا ایک حصہ اس ہاتھ کے مَیل کے لیے اٹھا رکھتے تھے۔ یوں بھی ان کے ہاتھ میں زنجیر کے دونوں سرے تھے۔ اگر ان کی چلتی ہوئی گاڑی کو ذرا سا ہچکولا بھی لگنے لگتا تو لڑکیوں کی ترقی کے پروانے ایلش بابو کی لوہے کی الماری سے گم ہو جاتے تھے۔ ان کی چھٹی کی درخواستیں درازوں میں پڑی پڑی گرد سے اٹ جاتی تھیں۔ اور ان کی تنخواہوں کے بل میں غیر حاضریوں کے سُرخ سُرخ نشان نظر آنے لگتے تھے۔ لیکن اب شاید عمر میں پہلی بار ایلش بابو کو محسوس ہوا کہ ان کی گاڑی کے پہیے کے سامنے ایک بڑا سا روڑا آ پڑا ہے۔ اس لیے وہ گریسی سے زیادہ خوش نہ تھے، وہ جب ان کے سامنے آتی، تو ان کے مُنہ کے بائیں گوشے سے پان کی پیک نادانستہ طور پر بہنے لگتی۔ اور ان کے مصنوعی دانتوں کا جبڑا انگوروں کی ترشی کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگتا۔

دفتر نہ ہوا، سالا راہب خانہ ہوا! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایلش بابو عموماً جھلایا کرتے تھے۔

گریسی کے آنے سے ٹاٹا ہپنگ سیکشن پر سنجیدگی کا موٹا سا لحاف گر جاتا تھا، جس طرح آدھی رات کے وقت کسی رقص گاہ میں گرجے کا پادری ہاتھ میں انجیل اٹھائے آ کھڑا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی زندگی میں ایک سادہ سی، ساکن سی یکسانیت تھی۔ جیسے کلاک کی سوئیاں ۱۲ سے ۱۲ تک ایک ہی دائرے میں گردش کرتی رہیں۔ کلاک کی سوئیاں کہنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ ان کے مدھم مدھم جھٹکوں میں تو زندگی کے پُر اسرار لمحے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ گریسی تو شاید ایک معمولی سی چادر تھی جسے ہر صبح دھوپ میں سکھانے کے لیے کھڑکی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ شام تک ٹنگی رہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دفتر میں جو اور ٹائپسٹ لڑکیاں تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی زندگی میں رنگین چور دروازوں کے کھُلے ہوتے پٹ تھے۔ خفیہ کھڑکیاں تھیں، چھپے ہوئے روزن تھے، لیکن گریسی گویا ایک تاریک قبر میں رہتی

تھی، کہ جس کے راستوں کو بڑی بڑی سلیں رکھ کر مسدود کر دیا گیا ہو۔ دن کے ایک بجے جب لنچ کے لیے گھنٹے بھر کی رخصت ہوتی تو ریفرشمنٹ روم کی بلوری میزوں کے گرد ایک ایک شمع اور کئی کئی پروانے جمع ہو جاتے۔ ایلش چندر اور ان کے ہم خیال بابو اس موقعہ پر اپنے ہاتھ کا میل شامی کبابوں، مرغ مسلّم اور بیئر کی رنگین بوتلوں کی شکل میں اتار پھینکتے تھے۔ جب ٹائپسٹ لڑکیاں اور لیڈی کلرکیں واپس لوٹتیں، تو ان کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری بھاری ہو کر گرنے لگتے اور بیئر کا خمار لوریاں بن کر انھیں تھپکنے لگتا۔

ایلش بابو کو بھی اس وقت گریسی کے ٹائپ رائٹر پر غصہ آتا تھا۔ کیونکہ اس کی ٹک ٹک اس ماحول کی خاموش موسیقی میں مانوس کڑکڑاہٹیں پیدا کرتی تھی۔ گریسی کی میز کی دراز میں ایک چھوٹا سا پیکٹ پڑا رہتا تھا جس میں اپنے لنچ کے لیے چار چھوٹے چھوٹے سینڈوچ باندھ لایا کرتی تھی۔ جب شام کے پانچ بجتے تو وہ بچی ہوئی فائلوں کا بنڈل اٹھا کر سائیکل پر جا بیٹھتی تھی۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ مَیں اسے اپنی کار میں بٹھا کر گھر چھوڑ آؤں لیکن کچھ بات تھی، کہ میری کبھی ہمّت نہ بندھی۔ جب دوسری لڑکیاں دفتر کے دروازے میں نمودار ہوتی تھیں تو مشتاقانِ دید کا غول ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ کچھ خالی وردیوں والے ہوتے تھے، کچھ کمپنیوں اور دفتروں میں کام کرنے والے اینگلو انڈین چھوکرے! کبھی کبھی ہوٹلوں کے گائیڈ اور رقص گاہوں کے دلال بھی اپنا پھندا اٹھائے پہنچ جاتے تھے۔ کسی لڑکی کو رکشا میں جگہ ملتی۔ کوئی وکٹوریہ میں سوار ہو جاتی، کسی کے لیے ٹیکسی منتظر ہوتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ان کی شام کا آغاز فرپوز میں چائے کے ساتھ ہوتا۔ لائٹ ہاؤس میں سینما، گریٹ ایسٹرن میں ڈنر، ڈانس اور وسکی کے چھلکتے ہوئے پیگ جذبات کے انگارے۔ آگ دھُواں اور رات کے پُر اسرار سائے۔ ۔ ۔ ۔ لیکن گریسی کی زندگی میں تو ایک سائیکل تھی، جس پر سوار ہو کر وہ تیز تیز چورنگی سے گزر جاتی نیو مارکیٹ سے چاکلیٹ ٹافی کا ایک پیکٹ خریدتی اور پھر گورا چند روڈ پر اپنے چھوٹے

سے فلیٹ میں چلی جاتی۔ اس کی زندگی کا سرمایہ جارج تھا۔ ایک چھوٹا بھائی، جسے قدرت کی ستم ظریفیوں نے گریسی کی امانت میں دے دیا تھا۔ جب جارج بغل میں کتابوں کا بقچہ اٹھائے سکول سے لوٹتا تو گریسی کے لیے گویا زندگی کا ایک نیا دِن طلوع ہوتا تھا۔ وہ ننھی سی لڑکی اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ جارج کے قدموں پہ نچھاور دیتی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا، تو وہ ساری کائنات سمیٹ کر جارج کی جھولی میں ڈال دیتی۔

گریسی کے ذہن میں اپنے بچپن کے دھندلے سے عکس تیرتے رہتے تھے۔ اس کا باپ کلکتہ کی ایک اسٹیمر کمپنی میں ملازم تھا۔ گریسی کو محض اتنا سا یاد تھا کہ عام طور پر آدھی رات گئے ایک بدمست اور مخمور باپ شراب کے نشے میں چور گھر میں آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ گریسی کی ماں کو بغل میں لے کر یوں جھنجھوڑنے لگتا جیسے بھُوکا کُتا ہڈیاں چچوڑ رہا ہو۔ لیکن عموماً وہ آتے ہی غصّے سے بے تاب ہو جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں شرارے سے چھوٹنے لگتے، اور وہ شوربے اور گوشت کی پلیٹوں کو اندھا دھند بچاری بیوی کے سر پر دے مارتا تھا۔ کئی دفعہ اس نے گریسی کو بھی پیٹا تھا، یونہی بلاوجہ۔ اور گریسی کو اب تک یاد تھا کہ اس کا باپ کئی بار عجیب سی لڑکیوں کو گھر میں لے آتا تھا۔ پیلی پیلی، دھنسی ہُوئی آنکھیں، زرد گالوں پہ سُرخی اور پوڈر کے بدنما دھبے بکھرے ہُوئے بال۔ بانہوں پہ اُبھری ہُوئی نیلی نیلی رگیں ...... ایک دفعہ ایک ایسی ہی سُرخ بالوں والی بدصورت لڑکی کئی روز ان کے گھر ٹھہری۔ اور جب جانے لگی۔ گریسی کے باپ نے گھر کے کپڑے، برتن اور زیور اُٹھا کے ٹیکسی میں ڈال دیے اور سُرخ بالوں والی لڑکی کے بازو میں بازو ڈال کر چلا گیا۔ پندرہ برس سے گریسی کی ماں اُمید کا چراغ جلائے بیٹھی تھی کہ شاید ٹیکسی پہ آدھی رات گئے ایک بدمست شرابی گھر میں آئے اور اس کی ہڈیاں چچوڑ کر رکھ دے اس بچاری کا سر پلیٹوں کی چوٹ سہنے کے لیے ترس گیا، لیکن جو ٹیکسی جا چکی تھی وہ واپس نہ آئی۔ جانے والا اس کی جھولی میں گریسی اور جارج دو نشانیاں

چھوڑ گیا تھا۔ وہ ایک ہسپتال میں نرس بن گئی اور پندرہ برس تک اس نے اپنی دونوں امانتوں کو سنبھالا، ایک دِن جب وہ ہسپتال سے نکلی تو ایک گزرتی ہُوئی ٹرام نے اچانک اِسے کچل دیا۔ اس کا سر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ میں ابھی تک چاکلیٹ کے دو پیکٹ تھے، جو وہ ہر شام گریسی اور جارج کے لیے خرید کر لے جایا کرتی تھی ....

خدا جانے وہ کونسا ازلی انصاف تھا، جس نے یکایک گریسی کو سکول کے کمرے سے نوچ کر دفتر کی میز پر لا بٹھایا۔ وہ ابھی بچہ تھی۔ لیکن جارج کی خاطر اس نے اپنی زندگی کی شاہراہوں کو سمیٹ کر بند کر دیا۔ دفتر سے آتے ہُوئے وہ ہر روز جارج کے لیے چاکلیٹ یا ٹافی کا بنڈل لایا کرتی تھی۔ اس کے پاس اپنے سکول کے چند فراک تھے، لیکن جارج کے لیے وہ ہر فیشن کے کپڑے سلوایا کرتی تھی۔ اتوار کے روز وہ اسے پک نک پر لے جایا کرتی تھی، ہر دوسرے تیسرے روز وہ سینما چلے جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی ملازم نہ تھا وہ اپنے ہاتھوں گھر سنبھالتی تھی۔ رات کے وقت جارج اس سے پریوں اور جنوں اور سمندری ڈاکوؤں کی کہانیاں سنتا تھا۔ اور پھر گریسی دفتر کی بچی ہُوئی فائلیں ٹائپ کرنے بیٹھ جاتی...... زندگی کی اس ان تھک گردش میں شاید ایسے لمحے بھی ہوتے تھے جو اس چھوٹی سی لڑکی کے دِل میں سپنوں کے باغ کھلا دیتے تھے اور وہ کبھی دبے پاؤں آنے والے چور سے شبنم کے موتی چھپا لیتی تھی......

گریسی اب بھی سٹینوگرافر ہے۔ لیکن اب اس کے پاس بہت سے بھڑکیلے فراک ہیں۔ شام کے وقت وہ سائیکل پر گھر نہیں جاتی۔ اسے رکشہ میں جگہ ملتی ہے یا وکٹوریہ میں یا کسی شاندار ٹیکسی میں۔ اور اب اس کی زندگی میں بھی فرپوز کی چائے ہے۔ لائٹ ہاؤس سینما، گریٹ ایسٹرن میں ڈنر، ڈانس وسکی کے چھچھاتے ہُوئے پیگ۔ جذبات کے انگارے۔ آگ، دُھواں اور رات کے پُراسرار سائے.....

جارج بھی سیانا ہوگیا ہے۔ وہ آدھی آدھی رات گئے نشے میں چور گھر آتا ہے اور غصّے سے بے تاب ہوکر شوربے اور گوشت کی پلیٹیں گریسی کے سر پہ دے مارتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ کوئی دھنسی ہوئی آنکھوں والی لڑکی بھی ہوتی ہے۔ پیلے پیلے گال، نیلی رگیں، اُلجھے ہوئے بال...... گریسی کے دِل میں پیہم ایک زہرناک خدشہ لرزتا ہے کہ شاید وہ کسی روز ایک سُرخ بالوں والی لڑکی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا جائے گا۔ وہ اپنی زندگی کی ساری لڑیاں جمع کر کے روپوں کے جال بنتی رہتی ہے، تاکہ جارج اُڑ نہ جائے۔ جارج کو روپیہ چاہیے۔ شراب کے لیے روپیہ، سُرخ بالوں والی بھدی لڑکیوں کے لیے روپیہ...... گریسی اس کا ہاتھ خالی نہیں رہنے دیتی۔ وہ روپیہ لاتی ہے۔ وہ روپیہ کماتی ہے۔ اور وہ روپیہ چرتی ہے...... دفتر کی تنخواہ سے...... صاحب کے تحفوں سے...... ایلش بابو کے ہاتھ کے میل سے...... فرپوز سے..... لائٹ ہاؤس سے..... گریٹ ایسٹرن ہوٹل سے.......

مجھے معلوم نہیں زندگی کی اس سکون پرور آبشار میں یہ جوار بھاٹا کیسے آیا۔ پرسوں سے وہاں سے میرا تبادلہ ہوچکا تھا۔ چارج دینے سے پہلے میں نے نئے صاحب کو دفتر کے عملے سے ملایا۔ جب گریسی کی باری آئی، تو انھوں نے چپکے سے میرا ہاتھ اپنی طرف بھینچا اور زیرِ لب گنگناتے ــــ "گڈ لا رڈ پٹاخہ ہے بھئی پٹاخہ۔" اس وقت میرے دِل میں دفعتاً یہ خواہش اُبھری کہ کاش دفتر کی چھت پر ایک زبردست بم کا گولا پھٹ جائے...

...... جب میں ریل گاڑی پر سوار ہُوا تو دفتر کا سارا سٹاف الوداع کہنے آیا ہُوا تھا۔ ان میں گریسی نہ تھی۔ مجھے بڑی مایوسی ہُوئی، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اس کے دِل میں ضرور میرا احترام تھا ــــ لیکن جب گاڑی اگلے سٹیشن پہ جاکر رُکی تو میں نے دیکھا کہ وہ پلیٹ فارم پہ پھُولوں کی چھوٹی سی ٹوکری اُٹھائے کھڑی ہے، جب انھوں نے پھُولوں کا گلدستہ مجھے دیا تو اس کی آواز بھرائی ہُوئی تھی۔ اس کے سینے میں ننھے ننھے خطروں کا طوفان سا

اُمڈا ہُوا تھا۔ وہ بار بار کپکپاتے ہُوئے ہاتھوں سے میرا بازو تھام لیتی تھی۔ میں نے اسے زندگی کے نشیب و فراز پر ایک چھوٹا سا لیکچر دیا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پتّیوں کی طرح تھرتھرا اُٹھے۔ جیسے آندھی کے تھپیڑوں نے انھیں اچانک جھنجھوڑ دیا ہو۔

"سر! میں کمزور نہیں ہُوں۔ لیکن میرے دِل میں ایک نامعلوم سا خوف سمایا جا رہا ہے سر، مجھے معلوم نہیں کہ میرا دِل اس قدر ڈوب کیوں رہا ہے۔ سر!..." وہ اس سہمے ہُوئے بچّے کی طرح میرے قریب کھسکتی آ رہی تھی، جسے ایک گہری اور تاریک کھائی کے سرے پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہو......

جب گاڑی چلنے لگی تو میں نے پہلی بار اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہُوئے اس کی ہمّت بندھائی۔ گریسی نے میرا دایاں ہاتھ اُٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کی پلکوں میں دو گرم گرم آنسو مچلے، اور تڑپ کر میرے ہاتھ پر گر پڑے...... دو جلتے ہُوئے انگارے جو ازل تک اپنے خاموش داغ چھوڑ گئے ہیں۔ میں سوچتا ہُوں کہ گریسی کے سپنوں کے خواب بھی اُجڑ گئے۔ اس کے شبنم کے موتی بھی لُٹ گئے۔ وہ جیتے جی مر بھی گئی...... لیکن اس کے دو غیر فانی موتیوں کو کون چھین سکتا ہے جو میرے دائیں ہاتھ کی رگ رگ میں پیوستہ ہیں؟

شلوار

"شلوار؟" رشیدہ نے میز پر مکّہ مار کے کہا۔ "کبھی دیکھا بھی ہے تم نے کسی کو شلوار پہنے؟ نہ سمجھ نہ بوجھ، بس ہلادی بالشت بھر کی زبان اور لگے افلاطون کے کان کاٹنے۔۔۔"

نسیم بے توجہی سے مُسکرایا۔ اس نے سِگرٹ کا دُھواں گھما گھما کر منہ سے نکالا۔

"وہ دیکھو بھابی، مَیں نے کیا اچھے 'رِنگ' بنائے ہیں!"

"اُلّو،" رشیدہ غصّے سے بولی "مَیں شلوار کی بات کرتی ہُوں، اور تم 'رِنگ' بنا بنا کر۔۔۔۔۔"

"اچھا، بابا، اچھا۔ بتاؤ کیا کریں شلوار کو؟"

"اپنے سر پر باندھ کر ناچو، اور کیا کریں؟ بدتمیز کہیں کے، جو منہ میں آیا بک دیتے ہو۔ نہ موقعہ، نہ لحاظ، نہ شرم، اگر وہ بُرا مان جائے تو؟"

"خُدا کی قسم!" نسیم شرارت سے مُسکرایا۔ "بڑا مزا آئے! مَیں نے اسی کو سنانے کے لیے تو کہا تھا بھابی!"

"بس یہی کرتب سیکھنا تم جُوں جُوں بڑے ہوتے جاتے ہو تُوں تُوں عقل گھٹتی جاتی ہے ......"

اور پھر یکایک نسیم کو خیال آیا کہ شاید جمیلہ نے سچ مچ بُرا مان لیا ہو! آہا، ضرور چڑ گئی ہو گی! اسی لیے تو وہ سر جھکائے سن سے باہر نکل گئی۔ اس کے گال ضرور لال ہو گئے ہوں گے، اور اس کے کانوں کے پیچھے نادم سی گرماہٹ پھیلی ہو گی جبھی تو وہ سرسراتی ہوئی نکل بھاگی۔ ورنہ وہ اسے دیکھ کر ٹھہرتی، رُکتی، جھجکتی، جاتے ہُوئے قدم قدم پہ گھومتی اور جیسے بچاری کو یک لخت ساری بھُولی ہُوئی باتیں یاد آ گئی ہوں ..... "بھابی میری اُون ضرور بھیجنا۔ ہاں بھابی دیکھیو، ہلکے عنابی رنگ کی ہو —— اُوئی اللہ بھابی نے اپنی نئی چوڑیاں تو دکھائی ہی نہیں ...." کبھی چوڑیاں دیکھنے، کبھی سلائیاں اٹھائے، کبھی جھُوٹ موٹ کی باتیں دہرانے وہ جاتی، لوٹتی، گھومتی، اور نہ جانے کیوں ایک میٹھا سا ارتعاش اس کے سینے میں کپکپانے لگتا، اس کے گالوں پہ ہلکی ہلکی سی تمتماہٹ دہک اُٹھتی اور اس کی آنکھیں .... یا اللہ، اس کی بھیگی بھیگی نظریں کس طرح صابن کے رنگ برنگ بلبلوں کی طرح ہَوا میں تیرتیں .... اور نسیم کو یُوں محسوس ہوتا کہ اس کا خون سگریٹ کے دُھوئیں کی طرح رنگ بناتا ہُوا اُبل رہا ہے۔ اور وہ چور چور سی آنکھیں اس کا ایکسرے کرنے پر تُلی ہیں ....

"جمیلہ ضرور چڑ گئی ہو گی! شبنم کی طرح حسّاس تو ہئی بھلا چڑتی کیوں نہ؟"

نسیم نے بھابی کو جھنجھوڑا۔ "مَیں کہتا ہُوں بھابی، اس نے بُرا تو مانا ہو گا!"

"چل بھٹیارہ" بھابی نے میز پر سے چائے کی پیالیاں اکٹھی کرتے ہُوئے کہا۔

"شرم تو نہیں آئی ہو گی ابھی؟"

"شرم؟ ارے واہ!" بھابی کی جھنجھلاہٹ پر نسیم ہنسنے لگا ...... اور ہنستا گیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ جب وہ ہنستا تو ہنستے ہی جاتا .... ہی ہی ہی ......

ہی ہی ہی ...... سفید سفید دانتوں کی بتیسی ہے کہ نکلتی آ رہی ہے، دونوں رُخساروں پہ یہ گہرے گول گول گڑھے مچل اُٹھتے اور جب تک بھابی جھپاک سے پنکھے کی ڈنڈی اس کے حلق تک نہ لے جاتی، وہ بند نہ ہوتا۔ جمیلہ پہ تو نظر پڑتے ہی اس کا دل گدگدانے لگتا اور وہ زور زور سے چلاتا "بھابی، بھابی، لانا ڈنڈی! یہ پڑا دورہ ...... یہ ..... ہی ہی ہی ...... ہی ہی ہی ......"

نہ جانے کیوں، بھابی کو دورے کے نام سے وحشت تھی۔ سنتے ہی بلبلا اٹھتی "اللہ نہ کرے کسی کو دورہ پڑے۔ میری توبہ نسیم، تیرے منہ میں لگام بھی تو نہیں"۔ نسیم کھل کھل کر مچلتا رہتا۔ جمیلہ بیٹھے بیٹھے سکڑ تی سی جاتی۔ اس کا رنگ خواہ مخواہ قرمزی سا ہونے لگتا اور نسیم کا جی تلملاتا کہ مَیں اس گدری سی گٹھڑی کو ربڑ کی گیند کی طرح دبا کر پچکا دوں! گیند؟ ارے معاذ اللہ ...... جمیلہ کا چھریرا بدن شہتوت کی ٹہنیوں کی طرح جھومتی ہُوئی نازک بانہیں، لمبی لمبی ناچتی ہُوئی سی ٹانگیں، چھم چھم تھرکنے والے سڈول پاؤں ...... جس دن وہ چوڑے چوڑے پائنچوں والی کاسنی شلوار، نیلے مورا کین کا پھُولدار پھنسا پھنسا کرتہ، اور گلابی ریشم کا سرسراتا ہُوا دوپٹہ پہن کر آتی، تو نسیم کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں اور جھپ جھپ پلکیں مار کر دروازے کے پردوں کے پیچھے کھِسکتا جاتا ..... "آؤ میری پھلجھڑی!" .... بھابی ہنس کر کہا کرتی .....

"اُونہوں!" جمیلہ گلابی ہونٹ بسورتی "پہلے شبرات تو آنے دو، بھابی!" نسیم پردوں کو بانہوں پر لپیٹ کر گھومتا۔ اور انجان بن کر زور زور سے پوچھتا "شبرات آ گئی بھابی؟ اور حلوہ؟"

"شبرات بھی آئے گی بھیا، ابھی تو پھلجھڑی آئی ہے!" بھابی شرارت سے کہتی۔

جمیلہ شرما کر اپنا سر بھابی کی گود میں چھپا دیتی۔

نسیم خواہ مخواہ انجان بنتا "آہا بھابی۔ پھلجھڑی کیا، ہم تو انار لیں گے انار! چھم چھم

کرتے ہُوئے انگارہ سے انار...... پٹاخے...... گلابی گلابی، کاسنی کاسنی نیلے نیلے کاغذوں میں لپٹے ہُوئے پٹاخے...... جو دِل کی دُنیا ہلا کر رکھ دیں..... اور پھر بھابی کی ناک کی طرح تیز تیز نکیلی چھچھوندریں......"

بھابی زور زور سے ہنستی، اور اس کا ایک ہاتھ اپنی ناک اور دوسرا پنکھے کی ڈنڈی پر جا پڑتا! جمیلہ سکڑتی سکڑتی بھابی کی گود میں دھنستی جاتی، اور پھر بھابی اس قوسِ قزح کے ٹکڑے کو دھکیل کر پیڑھی پہ بٹھا دیتی...... "اب ہٹ بھی جمیلہ پاگل کہیں کی!"

نسیم جُھک کر بھابی کے سامنے رکھی ہُوئی ٹوکری میں سے مٹروں کی پھلیاں اُٹھاتے ہُوئے چوری چوری جمیلہ کی طرف دیکھتا...... "دیکھا بھابی میں نہ کہتا تھا، وہ گلابی جارجٹ نہ لو...... رنگ کچا ہے!"

"اے ہے کچا نہ کچا۔" بھابی اپنے گلابی جارجٹ پر دونوں ہاتھ پھیرتی "چار دھو دُھل چکی ہے، لیکن ویسی کی ویسی تو پڑی ہے......"

"ہاں ہاں، جی دیکھ لو، کچا ہے۔ جمیلہ کے مُنہ پر کتنا لگ گیا ہے...... ہی ہی ہی... ...... ہی ہی ہی....." وہ پھُول سے دانت کھلتے۔ قہقہوں کی آندھی سی چلتی، بھابی کے پنکھے کی ڈنڈی ہوا میں بلند ہوتی...... اور جمیلہ اپنے تمتماتے ہُوئے بھبھوکا سے گالوں کو کہنیوں میں چھپائے بھاگتی، جاتی، پھر رُکتی، جھجکتی، لوٹتی، گھومتی،...... اور اس کو بہت سی بھُولی ہُوئی باتیں یاد آجاتیں، اپنی اُون، بھابی کی چوڑیاں..... اور پھر وہ ڈیوڑھی پر لگی ہُوئی موٹی سی چق اٹھا کر چلی جاتی، جیسے آسمان کی رنگیلی پتنگیں شام کے دھندلکے میں تحلیل ہو جائیں۔

نسیم کے دِل میں طرح طرح کے ہَوائی قلعے بنا کرتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا کہ جمیلہ ریشم کے پتلے پتلے دھاگوں میں بندھی ہُوئی پتنگ کی طرح آسمانوں میں اُڑتی جارہی ہے...... اُونچی اُونچی، ستاروں کے جُھرمٹ پھاندتی ہُوئی...... اور پھر وہ

چاند کی پیشانی پر ایک ست رنگے قشقے کی طرح جا بیٹھتی......! جب وہ کہکشاں کی دودھیلی کیاریوں کو دیکھتا، تو اس کے دِل میں بے باک سی، باغیانہ سی، جھلکیاں آنے لگتیں۔ جیسے جمیلہ کی کاسنی شلوار اور نیلی قمیض نے کہکشاں کے ایک بکھرے ہُوئے آوارہ سے ٹکڑے کو اپنے دامن میں چھپا رکھا ہو! بادلوں والی رات، اسے ایک بھیانک اور منحوس سا خواب نظر آتی...... وہ جھنجھلا کر اپنی انگلیاں چبانے لگتا، کہ اس کا بس چلے تو وہ بادلوں کی چادر کو نوچ کر تار تار کر ڈالے۔ جس نے کہکشاں کی لطیف سلوٹوں پر گھنے گھنے سلئے ڈال رکھے ہیں...... اور نہ جانے کیوں، اسے جمیلہ کی کاسنی شلوار اور نیلے مورا کین کی قمیض پر غصّہ آنے لگتا..... اور وہ دالان میں کھڑا ہو کر چاہتا کہ بھابی پنکھے کی ڈنڈی زور سے اس کے حلق میں ماردے.....

ایک روز وہ مچھلی کے شکار کو گیا۔ ندی کا نیلگوں پانی، ہلکی ہلکی لہروں میں چھلک رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی، اُلجھی ہُوئی سی لہریں...... سفید گلاب کا ایک بڑا سا پھُول ان کے بہاؤ میں تیز تیز جا رہا تھا...... ڈگمگاتا ہُوا۔ تھرکتا ہُوا، کبھی وہ مچلتی ہُوئی لہروں کے زیر و بم میں ڈوبتا۔ کبھی اُچھلتا، پھر ڈوبتا، پھر اُچھلتا..... اور نسیم کا جی بے اختیار اُکسا کہ وہ دھم سے پانی میں کُود مرے، اور اس تیز رفتار پھُول کو جھپٹ کر روک لے...... جو جمیلہ کی گول گول سفید ایڑی کی طرح بھاگتا ہُوا جا رہا تھا...... جمیلہ کی ایڑیاں! جب وہ اپنا تمتمایا ہُوا چہرہ کہنیوں میں چھپائے ڈیوڑھی کی چق کی طرف بھاگا کرتی تو نسیم چندھیائی ہُوئی آنکھوں سے اس کی گول مول سڈول ایڑیوں کا تعاقب کرتا، جن پر کاسنی شلوار کے آبشاری پائنچے اور گرداب بل کبھی گرتے، کبھی اُٹھتے، کبھی اُٹھتے، کبھی گرتے........

اور پھر آخر شبرات آئی! بھابی عورتوں کی مجلسوں میں گئی ہُوئی تھی۔ نسیم کمرے میں بیٹھا پٹاخے گن رہا تھا۔ اتنے میں پھلجھڑی آگئی! رنگین شراروں کی طرح چم چم کرتی اور دالان میں کھڑی ہو گئی۔

"بھابی، یہ لو چھچھوندریں!" اس نے ہلکی سی ہنسی دبا کر کہا۔

نسیم چونکا: "اوہو، پھُل جھڑی ہے ؟ ذرا پٹاخوں سے بچ کے رہنا !"
"مَیں تو بھابی کو پوچھتی ہُوں" جمیلہ نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔
"بھابی نہیں ہے" نسیم خرگوش کی طرح بھاگتا ہُوا آیا، اور مٹھی بھر پٹاخے زمین پر
مار کے بولا...... "یہ گئے پٹاخے ! اب باری ہے پھلجھڑی کی !"
جمیلہ شرما کر بھاگی، ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی........ نسیم بھاگا ٹھُس،
ٹھس، ٹھس........ پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ جھرررر...... جمیلہ کا پاؤں
شلوار کے پائنچے میں اُلجھا اور وہ دھڑام سے گری........ نسیم نے لپک
کر سنبھالا، اور بانہوں پر اُٹھا لیا........ انار، شرارے !! آگ !!! دونوں
کھو سے گئے، جس طرح آتش بازی کے شعلوں میں دُھواں کھو جاتے......
اور ایک دودھیا سی بے باک ٹانگ ہوا میں ناچنے لگی، جیسے قوس قزح کی لڑیوں
سے کہکشاں کا دھارا پھُوٹ نکلے !! اور پھر وہ جاگی، جھجکی، گھبرائی........
اور بے اختیار بھاگی۔ اس کا پھٹا ہُوا پائنچہ پیچھے پیچھے گھسٹنے لگا........ جس
طرح پھلجھڑی کے ساتھ ساتھ چھچھوندر بھاگ رہی ہو۔
دوسرے روز وہ آئی تو سفید بوسکی کا سیدھا پاجامہ پہنے ہُوئے تھی۔ بھابی
دیکھتے ہی چلائی ـــــ "اے ہے........ جمی، یہ کیا لٹھ کا سی بن گئی ہو ؟
شلوار کیا ہُوئی ؟"
جمیلہ کا پاؤں گرما گیا "کل پاؤں اُلجھا، تو پھٹ گئی۔ مَیں بھی تو دھڑام
سے گری بھابی........ اب سب کے نگوڑے پائنچے چھوٹے کروانے دے
دیئے ہیں۔"
"توبہ ! چوٹ تو نہیں آئی ؟" بھابی نے پوچھا۔
"بہت ہلکی سی !"........ جمیلہ نے ایک چھپے ہُوئے سرور کی جھرجھری

لے کر کہا۔ اور پھر وہ یکایک جھینپی۔ اور بات ٹالنے کے لیے بولی "کل کا جلسہ
کیسا رہا بھابی ؟"
"بڑے مزے کا....... بیگم غیاث نے اچھا خطبہ دیا، تم کیوں نہ آئیں ؟"
"یُونہی رہ گئی...... خطبے میں کیا کہا ؟"
"بہت سی باتیں، شبرات کی فضیلت، اور نہ جانے کیا کیا ؟ توبہ سب
کچھ یاد بھی تو نہیں رہتا....."
"بھابی ! شبِ برات میں فرشتے اُترتے ہیں ؟" نسیم نے پردے کے
پیچھے سے مُنہ نکال کر پوچھا۔
"اللہ میاں کی رحمت ہے بھیّا۔ فرشتے تو آتے ہی ہیں۔" بھابی نے ایک قسم
کی روحانی زندگی سے کہا۔
"اور حوریں........ بھابی ؟" جمیلہ نے آنکھیں جھکا کر شرارتاً
پوچھا۔
"ہاں ہاں........ ضرور !" نسیم چلّایا۔ "لیکن پھٹی ہُوئی شلواروں
والی........"
جمیلہ کے گالوں پر گلابی ڈورے آئے اور وہ پانی کے ریلے کی طرح مچل
کر بھاگ گئی۔
"توبہ ! ایسی بات بھی کوئی کہتا ہے بھلا ؟" بھابی نے چائے کی پیالی کھٹ
سے پرچ میں رکھ کر کہا۔
"مَیں نے کوئی اسے کہا تھا کچھ ؟ شلوار کی بات تھی !"
"چل چُپ رہ۔ بڈھا ہو گیا ہے اور بات کی تمیز نہیں....."
"تو مَیں کیا کروں بھابی...... ؟ یہ لباس ہی بدتمیز ہے !" نسیم

نے بات ٹالی۔

بھابی کو بھی غصّہ آگیا۔

"شلوار؟" اس نے میز پر مکّا مار کے کہا۔ کبھی دیکھا بھی ہے تم نے کسی کو شلوار پہنے........"

جگ جگ

"جگ جگ، حضور؟" سفید داڑھی والے بیرے نے کافی کی پیالی میز سے اُٹھا کر پُوچھا۔

افضل نے کہا "لے آؤ۔" کلکتہ میں آتے ہی ٹرام میں اس نے کسی کو پہلی بار جگ جگ کہتے سنا تھا۔ وہ سمجھا کہ ڈم ڈم یا بج بج کی طرح کسی جگہ کا نام ہوگا...... اب رات کے کھانے پر جب ہوٹل کے بیرے نے پوچھا "سوپ حضور؟" تو افضل نے کہا۔ "لے آؤ۔" "کٹلس حضور؟" ——— "لے آؤ" "سلطانہ پڈنگ حضور؟" ——— "لے آؤ"..... "جگ جگ حضور؟" "لے آؤ۔" افضل نے سوچا کوئی چینی مٹھائی ہوگی۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید شراب ہو۔ اس خیال سے اس کے رونگٹوں میں کپکپی سی ہوئی۔ کیوں کہ وہ ابھی شراب کو منہ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دل میں فرشتہ بننے کی خواہش بھی نہ تھی۔ لیکن ہر چیز کے لیے اس نے زندگی میں خاص خاص منزلیں بنا رکھی تھیں۔ مثلاً سگرٹ.... کالج میں کئی بار سگرٹ پینا چاہتا تھا۔ لیکن اس آرزو کی تکمیل کو اس نے ایم اے پاس

کرنے تک اُٹھا رکھا تھا۔ چنانچہ اب وہ چار مہینے سے سگرٹ بھی پیتا تھا، اور جی بھر کر پیتا تھا۔ اس کی زندگی کی شاہراہ میں اگلی منزل کا نشان قدسیہ کا نام ہی کوئی دو چار ہاتھ دُور تھا۔ کیونکہ وہ اس کی منگیتر تھی۔ اور اگلے مہینے کی دس تاریخ کو رواجاً اس کی ملکیت میں آنے والی تھی۔ انسان کی تعمیر میں کچھ پوشیدہ رگیں ایسی بھی ہیں جو آرزوئے ملکیت پر بے اختیار پھڑک اُٹھتی ہیں۔ افضل کے پاس روپیہ تھا۔ اور جب بنک کی پاس بُک پکار کر کہتی تھی کہ میاں افضل! یہ سب روپیہ تمہارا ہے، محض تمہارا . . . . . . تو اُسے ایک خفیہ تسکین ہوتی تھی۔ اور وہ لمحہ بھر کے لیے جعلی دستخط بنانے والوں کو بھی بھول جاتا تھا!

لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں جب اس نے ایک چھوٹی سی خوش نما کوٹھی بنوائی، تو اس کی پیشانی پر بڑے بڑے حرفوں میں "افضل کدہ" لکھوایا گیا۔ اوپر انگریزی میں، نیچے اُردو میں۔ جب کوئی راہگیر اچانک اس نام کو پڑھ کر گزر جاتا تھا، تو شاید افضل کی کوئی خاموش رگ مطمئن ہو جاتی تھی، کہ شکر ہے۔ گزرنے والے کو یہ دھوکا نہیں لگا کہ شاید یہ خوب صورت مکان کریم بخش کا ہو، یا طوطا رام کا . . . .

اب اگلے مہینے اس کی ملکیتی جائداد میں قدسیہ کا لچکتا ہُوا چھریرا جسم بھی شامل ہونے والا تھا۔ قدسیہ کو پالینے کے بعد افضل کے ارض و سما ایک دھندلی سی افقی لکیر میں کھو جاتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا تھا کہ وہ انارکلی میں کپڑوں کی ایک بہت بڑی دکان کھول لے گا۔ کبھی اس کا تخیل قدسیہ کو لے کر تاج محل اور اجنتا آرٹ کی سیاحت کے لیے چل نکلتا تھا۔ بسا اوقات اس کے تصوّر میں ارغوانی لہروں والے چھچھماتے ہُوئے پیگ گھوم جاتے تھے . . . . . . اصل میں قدسیہ کے بعد افضل کی تمناؤں پر زنگ سا لگ جاتا تھا۔ اور اسے خود محسوس ہوتا تھا کہ شاید اس کی زندگی اس گرم گرم دہکتے دہکتے ہُوئے کوئلے کی طرح رہ جائے گی۔ جیسے پانی میں ڈال کر چھن سے بجھا دیا گیا ہو . . . . افضل آوارہ مزاج نہیں تھا۔ وہ آسودہ مزاج تھا۔ آسودگی ساحل کے کنارے بیٹھ کر لہریں گنتی ہے۔ آوارگی اِن

لہروں کی آغوش میں کود جاتی ہے۔ چنانچہ جب افضل کو معًا یہ خیال آیا کہ شاید جگ جگ کسی شراب کا نام ہو۔ تو وہ گھبرا سا گیا۔ وہ ابھی شراب پینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لائحہ عمل میں شراب کی منزل عورت کے بعد تھی۔ عورت کا وجود قدسیہ کا وجود تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی کائنات میں عورت کا روپ یا تو ماں کا روپ ہوتا ہے، یا بہن کا یا بیوی کا . . . . . وہ عورت کو ایک ست رنگی پتنگ نہیں سمجھتا تھا۔ جو انسان کی زندگی پر قوسِ قزح کی طرح تنی ہُوئی ہے۔ جب وہ قدسیہ کو پالے گا تو سمجھے گا کہ دُنیا کے ساتھ اس کا ایک ضروری حساب بے باک ہو گیا ہے۔ یعنی سارے جہان کی عورتوں میں اس کے حصّے کا جو ٹکڑا تھا، وہ اسے مِل گیا۔ افضل نے کبھی کسی سے محبت نہ کی تھی۔ لیکن پیدا ہوتے ہی اسے حق ہو گیا تھا کہ ایک خاص عمر پر پہنچ کے وہ دُنیا سے اپنے حصّے کی عورت مانگ لے۔ چونکہ وہ اتفاق سے مُسلمان گھر میں پیدا ہُوا تھا اس لیے دو چار عورتیں بھی مانگ سکتا تھا . . . . .

ہوٹل کا ڈائننگ روم کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ تیز تیز برقی قمقمے جگمگ جگمگ جل رہے تھے۔ افضل کے سامنے والی میز پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور ایک جوان عورت بیٹھے ہُوئے آئس کریم کھا رہے تھے۔ ایک بیرا بہلانے بہانے جُھک کر میز کے نیچے نظر دوڑاتا تھا۔ ادھیڑ عمر والے آدمی کے گھٹنے جوان عورت کے گھٹنوں سے ملے ہُوئے تھے۔ اور ان کے پاؤں ایک خاموش تال پر ناچ رہے تھے . . . . . . بائیں طرف ایک بھڑکیلی سی لڑکی بناؤ سنگار کیے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک میلے کپڑوں والا لڑکا تھا۔ اس کے سامنے چائے کی پیالیاں تھیں۔ لیکن وہ نہ تو چائے پیتے تھے، نہ آپس میں بولتے تھے۔ دونوں کی نگاہیں ہال کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوم رہی تھیں۔ یکایک افضل کی نگاہیں لڑکی سے ملیں۔ وہ جھینپ گئی۔ افضل نے پھر دیکھا۔ وہ مُسکرا پڑی، اور اس کے سفید دانتوں کی لڑی سُرخ ہونٹوں کے درمیان موتیوں کی طرح جگمگا اُٹھی۔ وہ دیر تک کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مُسکراتے رہے۔ پھر وہ

مَیلے کپڑوں والا لڑکا کسی بہانے اُٹھ کر چلا گیا۔ لڑکی نے گول گول آنکھیں گھما کر خالی کرسی کو دیکھا۔ پھر اس نے چائے کی پیالی کو چمچے سے مدھم مدھم سُر میں بجانا شروع کیا۔ اس جلترنگ کی آواز افضل کو اپنی طرف بلانے لگی۔ لیکن اس نے تو گاؤں کی سنسان گلیوں میں بھی کسی اکیلی لڑکی کو کھلے طور پر گھورا نہیں تھا۔ اب اس بھرے ہوئے ہال میں وہ اس اجنبی لڑکی کے ساتھ کیسے جا بیٹھتا؟ اس کے دِل میں ایک عجیب سا اضطراب ہونے لگا۔ جس میں غصہ تھا۔ مایوسی تھی، عزم تھا، شرم تھی۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وقت کا پنچھی اور دریا کی لہر کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ یہی اصول عورت کا ہے۔ افضل اپنے عجیب سے اضطراب میں اُلجھا رہا۔ اتنے میں ہال کے دوسرے کونے سے ایک لڑکھڑاتا ہوا آدمی آیا۔ اور دھم سے لڑکی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیرے نے جلدی سے آ کر کھانے کا آرڈر لیا۔ ان دونوں کے گھٹنے میز کے نیچے مل گئے۔ ان کے پاؤں کسی خاموش تال پر ناچنے لگے اور افضل کو بیٹھے بٹھائے یوں محسوس ہوا کہ اس لڑکھڑاتے ہوئے شرابی نے چانٹا مار کر اس کے منہ کا سگریٹ چھین لیا ہے!

اتنے میں سفید داڑھی والا بیرا دروازے میں نمودار ہوا۔ افضل کو احساسِ شکست نے اداس کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دِل میں اپنی کم ہمتی پر شرمندہ ہو رہا تھا۔ اگر جگ جگ کوئی تیز اور تند شراب بھی ہوتی تو اس وقت افضل ضرور دو گھونٹ بھی پی لیتا۔ لیکن جب اچانک سفید داڑھی والے بیرے نے اس کے سامنے شراب کی جگہ ایک چھلکتی ہوئی عورت کو لا بٹھایا، تو اس کے قدم لڑکھڑائے۔ جیسے چاند کے لیے ضد کرنے والے بچے کے ہاتھ میں سورج کا دہکتا ہوا الاؤ رکھ دیا جائے! اُس نے بیٹھتے ہی میز کے نیچے اپنے گھٹنے افضل کے گھٹنوں سے ملا دیئے۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ عورت مسکرانے لگی، جیسے کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔ "مَیں تمھاری ماں نہیں ہوں، بہن نہیں ہوں، مجھ سے ڈرتے کیوں ہو؟ ۔۔۔۔۔۔"

"بوائے! میرا بل لاؤ" افضل نے زور سے چیخ کر کہا۔

آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس بدتمیزی پر ناک چڑھائے۔ وہ عورت غصے سے کانپ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے موٹے موٹے نتھنے پھول گئے اور اس نے سفید داڑھی والے بیرے کو قہر آلود نظر سے دیکھ کر کہا:

"تھو، غفور چاچا، سفید بال ہو گئے تیرے، پر آدمی کی پرکھ نہ آئی اب تک" اور پھر وہ تیرتی ہوئی مرغابی کی طرح میزوں کے گرد منڈلانے لگی۔ ایک موٹا سا آدمی وسکی کا گلاس سامنے رکھے اُونگھ رہا تھا۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے اس عورت کو دیکھا اور زیر لب بڑبڑایا۔

"جگ جگ؟" عورت نے مسکرا کر کہا۔ اور پھر وہ دونوں گھٹنے سے گھٹنا جوڑ کر بیٹھ گئے۔

ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نو دس برس کا گول مٹول سا چھوکرا اس کی طرف لپکا "گوری بی بی، جناب؟" چھوکرے نے افضل کی انگلی پکڑ کر پوچھا۔

افضل نے اُسے جھڑک دیا۔

"کالی بی بی جناب؟" چھوکرے نے دوسری پیش کش کی۔

افضل نے پھر اسے ڈانٹ دیا۔

"جگ جگ جناب؟" چھوکرے نے اصراراً کہا۔

افضل نے اُسے دھکا دے کر پرے پھینک دیا۔

افضل میں اخلاقی جرأت کے ساتھ ساتھ ظرافت کا مادہ بھی عنقا تھا۔ ورنہ وہ اس گول مٹول چھوکرے کو دھکیل کر پرے نہ ہٹاتا۔ وہ ننھا سا لڑکا راگیروں پر لپک لپک کر ان کے معیار کا سودا کیا کرتا تھا۔ اس کے بیوپار میں کئی قسم کی جنس تھی۔ کالی بی بی اور گوری بی بی کی رنگت میں امتیاز تھا، نسل میں فرق تھا، بازار الگ الگ تھے۔ قیمت

جُدا جُدا تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن جگ جگ ایک بین الاقوامی چیز تھی۔ وہ بنی نوع انسان کی مشترکہ جائداد ہے۔ اس میں کالے گورے، پیلے، بھورے کی تمیز نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے اور ہر کسی کے لیے ہے۔ ٹوکری میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح، جس کی ایک پھانک کاٹ کر اسے خفیہ طور پر ننگا کر دیا ہو۔ افضل جس طرف جاتا تھا۔ اس کے سامنے جگ جگ آجاتی تھی۔ کلکتے کی ساری شاہراہیں ایک ہی منزل پر مل رہی تھیں۔ ٹیکسیوں میں جگ جگ تھی۔ رکشاؤں میں جگ جگ تھی۔ گھوڑا گاڑیوں میں جگ جگ تھی۔ وہ سرسراتی ہوئی خوبصورت ساڑھیوں میں تھی۔ اس نے رنگ برنگ فراق پہنے ہوئے تھے۔ وہ عظیم الشان کمروں میں تھی۔ وہ خوشنما پردوں کے پیچھے تھی، وہ جہاں کہیں بھی تھی، جو کچھ تھی ٹوکری میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح تھی جس کی ایک پھانک تراش کر اسے خفیہ طور پر ننگا کر دیا ہو!

وہ ایک لدی ہوئی ٹرام میں پھنس کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک نازک سی لڑکی تھی جس کے تراشے ہوئے بال پھولوں کی طرح مہک رہے تھے۔ جب ٹرام رُکتی تھی، تو ہر ہچکولے کے ساتھ اس لڑکی کا سارا بوجھ افضل کے کندھوں پر آگرتا تھا، اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے عطروں میں بسا ہوا ریشم کا تھان اس پر ڈال دیا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دِل ہی دِل میں دُعا کرنے لگتا کہ ٹرام قدم قدم پر رُکے، اسے گام گام پر ٹھوکریں لگیں اور پھر وہ کسی دوسرے ٹرام سے ٹکرا کر ٹوٹ جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے تارے ٹوٹتے ہیں۔ لیکن دعا منوانے کے لیے بھی ہمت درکار ہے۔ ٹرام گڑگڑاتی بھاگی جا رہی تھی۔ ایک تندخُو نوجوان کھسکتا ہوا آگے بڑھا اور ان دونوں کے درمیان گھس کر کھڑا ہو گیا۔ اب افضل کو شاید پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ ہچکولے لگنے کے لیے ضروری نہیں کہ ٹرام کو جگہ جگہ رُکنا پڑے۔

"نان سنس!" اس لڑکی نے غصّے سے نوجوان کو ڈانٹا۔

"جگ جگ!" نوجوان نے اس کے کندھے پر ٹھوڑی رگڑ کے کہا۔

"جگ جگ!" وہ مُسکرا پڑی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عین اس وقت افضل کو سفید داڑھی والا بیرا یاد آگیا۔ اور پھر وہ بھڑکیلی لڑکی جو چائے کی پیالی پر چمچہ مار کے جلترنگ بجا رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن پھر اچانک اسے قدسیہ یاد آگئی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک زبردست گالی دی۔ وہ کلکتے میں شادی کا سامان خریدنے آیا تھا۔ اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ وہ ہر راہ چلتی عورت کے قدموں میں پامال ہو جائے۔ اس نے جیب سے چیزوں کی فہرست نکالی اور ایک بہت بڑی دو منزلہ دکان میں چلا گیا۔

یہ دکان کلکتہ کی بڑی دکانوں میں سے تھی۔ اس میں مختلف چیزوں کے لیے الگ الگ سیکشن تھے۔ ہر سیکشن میں گاہکوں کی مدد کے لیے آدمی یا عورتیں مامور تھیں۔ سٹیشنری والے حصّے میں ایک خریدار کاؤنٹر پر جھکا ہوا تھا۔ ایک درمیانی عمر کی عورت جس کے چہرے پر جھُریوں کی پہلی لہر اُٹھنے والی تھی، بڑی مستعدی سے چیزیں نکال کر لا رہی تھی۔ رائٹنگ پیڈ، لفافے، سیاہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر خریدار نے اِدھر اُدھر دیکھ کر زیرِ لب کہا "جگ جگ!" عورت کے سنجیدہ چہرے میں کچھ تبدیلی ہوئی۔ اُس نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر مُسکرا پڑی۔

ایک خوبصورت اور نوجوان جوڑا سنگار کی الماریوں کے پاس گھوم رہا تھا۔ وہ دھیمی دھیمی آواز میں سرگوشیاں کر رہے تھے، اور ان کی بے تاب آنکھیں ایک دوسرے کو اپنی اتھاہ گہرائیوں میں ڈبو رہی تھیں۔ تین بے باک چھوکرے سگرٹ پیتے ان کے پاس سے گزرے۔ اُنھوں نے بنی ٹھنی ہوئی دُلہن کو گھُور کر دیکھا۔ پھر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مُسکرائے اور سگریٹ کا دُھواں زرد زرد سے موم کے ان رنگین مجسّموں پر چھوڑنے لگے۔ جو نمائشی ساڑھیاں، گاؤن اور

فراک پہنے کھڑے تھے۔

ان مجسموں کے اعضاء اقلیدس کی شکلوں کی طرح متناسب تھے۔ ان کے انداز میں دُنیا بھر کی رعنائیوں کو منجمد کر دیا گیا تھا۔ اگر کوئی آرٹسٹ ان کے بدن میں تھوڑا سا لوچ، تھوڑی سی حرارت ڈال سکتا تو یقیناً گاؤنوں، فراکوں اور ساڑھیوں کے ساتھ وہ بھی مہنگے داموں بِک جاتے۔

افضل ایک مجسّمے کے سامنے کھڑا ہو گیا جس نے سلمے ستارے والی آسمانی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ اس کے رنگین رخساروں کو دیکھتا رہا۔ اور پھر ساڑھی دیکھنے کے بہانے اس نے مجسّمے کی ٹھوس کمر کو زور سے دبا دیا۔ اس کے دل میں ایک زبردست خواہش اُبھری کہ وہ لپک کر اس موم کی مورت سے لپٹ جائے اور اس کے کانوں میں چیخ چیخ کر کہے "جگ جگ، جگ جگ، جگ جگ، جگ جگ......"

"کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟" عقب سے ایک نوجوان چھوکری نے پوچھا۔

افضل اچک کر ایک طرف ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی فراک والے مجسمے میں یکایک جان پڑ گئی ہے۔

"جی ہاں، مجھے کچھ ساڑھیاں چاہئیں، کچھ فراک......" اس نے جلدی جلدی جواب دیا۔ گھبراہٹ میں وہ اور کوئی بات نہ بنا سکا۔

وہ لڑکی اسے ایک تکونے کمرے میں لے گئی۔ اور الماریاں کھول کر قسم قسم کی ساڑھیاں نکالنے لگی۔ افضل کا دل زور زور سے پسلیوں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ وہ ساڑھیوں کی جگہ فراک والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لڑکی نے شرارت سے منہ پھلا لیا۔ اور پھر ایک ملائم سی ریشمی ساڑھی کے نیچے ان کی انگلیاں اچانک مل گئیں۔ وقت کی رفتار لمحہ بھر کے لیے تھم گئی۔ افضل کے دل کی گہرائیوں سے جگ جگ کا لفظ ایک

مستانہ ترنم کے ساتھ اُبھرا، لیکن گلے تک آ کر اٹک گیا، جیسے ناچتی ہوئی رقاصہ کا پاؤں دھم سے اگالدان میں پھنس جائے........ اس نے جلدی جلدی ساڑھیوں کا پلندا سنبھالا اور باہر نکل آیا۔ سڑک کے کنارے ایک خالی رکشا والا پہیے سے لگا اُونگھ رہا تھا۔ افضل اُچک کر اس میں سوار ہو گیا۔ رکشا والا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور نیم خوابی کی حالت میں بولا "کہاں چلیں گے حضور؟ دھرم تلے؟"

"حرامزادہ" افضل کڑک کر بولا "دھرم تلے میں تیری ماں ہے سالے؟" رکشا والے نے ایک زور کی جمائی لی۔ وہ ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح رکشا میں جُت گیا۔ اب اس کی نیند بھی دُور ہو گئی تھی۔

"جگ جگ، حضور؟" اس نے رکشا کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں سالے ہاں؟" افضل دوبارہ کڑکا۔ جگ جگ ماں نہیں ہے، جگ جگ بہن نہیں ہے، جگ جگ بیوی نہیں ہے...... تو کیا جگ جگ سانپ ہے؟ وہ اپنے ڈرپوک ضمیر سے لڑتا جا رہا تھا!

آیا

وہ تھی توسانولی سی، سادہ سی، معمولی سی، لیکن اس کے جسم میں جوانی کا تناؤ تھا۔ سول لائن کے حلقوں میں مسٹر رام لال کی آیا کا چرچا تھا۔ سرِشام جب وہ پریمبولیٹر میں رام لال کے بچے کو بٹھا کے نکلتی تھی تو سول لائن کے اُفق پر گویا چاندنی سی چھا جاتی تھی۔ وہ بھی اپنے بدن کی مقناطیسی قوت سے بے خبر نہ تھی۔ وہ اپنے بالوں میں بنگال کیمیکلز کا مشک بو کوکونٹ ہیئر آئیل ڈال کے کنگھی چوٹی سے آراستہ ہو کر نکلتی تھی۔ ماتھے پر بندی، ہونٹوں پر مسز رام کی سنگار میز سے چرائے ہوئے لپ اسٹک کی دھڑی، ناخنوں پر عنابی پالش، گردن میں خم، چھاتی میں ابھار، گالوں پر پاؤڈر، آنکھوں پر لگاوٹ۔ کوٹھیوں کے خانساماں باورچی خانے چھوڑ کر اس سے راز کی ایک بات کہنے سڑک پر آجاتے تھے۔ مہتر کموڈ کے پاٹ جھاڑیوں کے پیچھے چھپا کر اس سے نیاز حاصل کرنے کی تلاش میں منڈلاتے رہتے تھے۔ سفید براق وردیوں میں ملبوس بیرے جیبوں میں بسکٹ اور دل میں ارمان دبائے اپنی دیوی کا انتظار کرتے تھے۔ چمکیلی کاروں میں فراٹے بھرتے ہوئے دیدہ زیب،

خوش لباس، دِل پھینک بوڑھے اور جوان بھی اسے گھُورے بغیر آگے نہ بڑھتے تھے۔ سول لائن کی کالی اور گوری میمیں اس سے جلتی تھیں۔ کالے اور گورے صاحب اس پر مرتے تھے اور ایک سانولی سی، سادہ سی، معمولی سی آپا نے آراستہ بنگلوں اور پیراستہ کوٹھیوں کی اس دُنیا پر رومان کی قوسِ قزح بُن دی تھی۔

۴ نمبر کی کوٹھی میں مسٹر رام لال رہتے تھے۔ ۸ نمبر میں مسٹر رام ناتھن۔ ۱۲ نمبر میں خان بہادر یوسف، ۱۴ میں مسٹر چٹرجی، ۱۸ میں مسٹر نواب۔ باقی کوٹھیوں میں بھی انسان ہی آباد تھے۔ لیکن ان کی بیویاں بدصورت تھیں یا پردے میں۔ ان کی بیٹیاں شاید ابھی جوان نہ ہُوئی تھیں۔ ان کے خاندان روزے رکھتے تھے یا مندر جاتے تھے۔ ان کے مرد شراب پینے سے ہچکچاتے تھے۔ ان کی عورتیں غیر مرد کے سائے سے بھی ڈرتی تھیں۔ سول لائن میں ان کا وجود یُوں تھا، جیسے زعفران کے کھیت میں سرسوں، یا شراب کے پیالے میں جوشاندہ یا سیخ کے خستہ کبابوں میں ہڈی کے ٹکڑے۔ یہ کوٹھیاں سول لائن میں گم گشتہ مزاروں کی طرح آباد تھیں۔ جن پر نہ کوئی پھُول چڑھاتا ہے، نہ چراغ جلاتا ہے۔ نہ دل تھام کے دو کلمے دُعا ہی کے ادا کرتا ہے۔ ان کوٹھیوں میں خانساماؤں کو باورچی کہتے ہیں۔ بیروں کو خدمتگار اور بیویوں کے ساتھ شادی کرنے کا رواج تھا۔ راج کے وقت یہاں بھی رومان کے فرشتے اترتے تھے لیکن ان کے نغموں کی صدائے بازگشت عموماً ایک نئے ننھے کی ریں ریں روں روں میں منتقل ہوجاتی تھی۔ ان خاندانوں میں خدا کی ذات پر ایک معصوم سا ایمان تھا کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنی روزی بھی ساتھ لاتا ہے۔ لیکن وہ یہ فراموش کر دیتے تھے کہ خُدا کی سلطنت میں بھی ڈاکو آباد ہیں۔ جو رنگ بھی چُراتے ہیں، بھنگ بھی چُراتے ہیں، اور گندم کے سنہری خوشے بھی! جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ فرق تو سفید اور کالے تلوں کی قیمت میں بھی ہے، پھر انسان کی رنگت میں امتیاز کیوں نہ ہو، کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا۔ جس کی رنگت سفید ہو وہ کوئلے کی کان میں جائے ہی کیوں؟

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا! کوئلہ جب حد سے کالا ہوتا ہے، تو ہیرا بن جاتا ہے۔ کشش تو ہیرے کی ہے، کوئلے کی نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئلے کی کانوں میں زہریلی گیسیں بھی ہوتی ہیں۔ ان میں حادثے بھی ہوتے ہیں۔ وہ پھٹ بھی جاتے ہیں اور جب وہ پھٹتی ہیں تو زمین کی تہہ میں سوئے ہُوئے کیڑے بھی ایک بار کروٹ لیتے ہیں!

مسٹر رام لال کی آپا، آپا بھی تو کیا ہُوا؟ عورت تو تھی۔ جوان تو تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خوبصورت تو تھی۔ یُوں کہنے کو عورت تو رام لال کی بیوی تھی۔ جوان تو خان بہادر کی لڑکی بھی تھی خوبصورت تو چیٹرجی کی بیوہ بہو بھی تھی، لیکن خالی عورت ہونے اور جوان ہونے اور حُسین ہونے سے تو کائنات کی کُنجی ہاتھ میں نہیں آجاتی!

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

یہ ایک تھام لینے کا گُر تھا جو آپا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پگھلے ہُوئے جذبات کی بدرویں بہتے ہُوئے پانی کی طرح بہہ جانے نہ دیتی تھی۔ وہ ایک آرٹسٹ تھی۔ فن کار کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے عکس کو زندگی سے بھی خوش نما اور رنگین بنا کے دکھائے۔ آپا کا کمال یہ تھا کہ وہ عورت ہوتے ہُوئے بھی عورت سے زیادہ پُرکشش تھی، خانساماؤں، بیروں، مہتروں کی بات دوسری تھی۔ وہ اپنی چڑچڑی، تھکن آلود اور زرد رُو بیویوں سے اُکتا کر ایک ایسی دُنیا میں پناہ لیتے تھے، جہاں تصور ہی تصور میں وہ بنگلوں میں بسنے والی دودھ کی طرح گوری، بالائی کی طرح نرم اور ریشم کی طرح نازک، عورتوں کو اپنی باہوں کے درمیان جھنجھوڑ دیتے تھے۔ مسٹر چیٹرجی کا خانساماں رمضان دل ہی دل میں اپنے مالک کی بیوی سے عشق لڑاتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ مسز چیٹرجی کے چمچوں، پیالوں اور گلاسوں کو اپنی زبان سے چاٹ کر تر کر دیتا تھا۔ جب مسز چیٹرجی اپنے چمچوں سے پڈنگ کھاتی تھی۔ یا پیالوں سے چائے پیتی تھی، یا بلور کے رنگین گلاس سے شیری کا پیگ نوش کرتی تھی۔

تو رمضان خانساماں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ مسز چیٹرجی کے عنابی ہونٹوں کو چٹاخ چٹاخ چوم رہا ہے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا! رام پرتاب مہتر نے ایک دوسری طرح اپنی تنگی داماں کا علاج تلاش کر لیا تھا۔ وہ خان بہادر یوسف کے گھر کا بھنگی تھا۔ سولہ روپلے ماہوار میں اسے تین غسل خانوں کا کام سمیٹنا پڑتا تھا۔ خان بہادر اور بیگم کے غسل خانوں میں جاتے ہوئے اُسے گھن آتی تھی۔ بیئر اور وسکی کے پس خوردہ بخارات، ذیابیطس کے ایلبیومن کی بدبو۔ کرسچن سالٹ کے قبض کا ردِ عمل...... وہ اس غیر طبعی ماحول کی عفونت سے گھبرا اُٹھتا تھا۔ لیکن نعمت آرا کے غسل خانے میں جاتے ہی اس کے دِل کی دُنیا مہک اُٹھتی تھی۔ نعمت آرا خان بہادر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پکتے ہُوئے آڑو کی طرح جوان۔ رام پرتاب کو نعمت آرا کے غسل خانے کی فضا میں گلاب اور چمپا اور موتیے کی سوندھی سوندھی خوشبو کا لطف آتا تھا۔ وہ بار بار دوڑ کر صابن کی گیلی ٹکیہ کو چھوتا تھا اور شرماتا تھا، کیوں کہ وہ نعمت آرا کے مُشک بُو تن بدن کی آشنائے راز تھی۔ تولیے کی نرم نرم، تازہ تازہ نم آلودگی، اُتارے ہُوئے کپڑوں میں سلگتی سی آنچ کا احساس، نہانے کے ٹب میں پانی کے بلبلوں کی آنکھ میں سرودِ رفتہ کا خمار۔ رام پرتاب مہتر غسل خانے کی چٹخنیاں اندر سے بند کر کے نعمت آرا کے ٹب میں بیٹھ جاتا تھا۔ نعمت آرا کا گیلا صابن اس کی کالی کالی کھردری جلد کو اپنی ریشمی اور مشکبار جھاگ کے غبار میں چھپا لیتا تھا اور جس طرح مقناطیس کی رگڑ لوہے کے ٹکڑے میں بھی کشش پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح نعمت آرا کے تولیے کی رگڑ بھی رام پرتاب کے نحیف اور خمیدہ بدن میں پکتے ہُوئے آڑوؤں کا رس بھر دیتی تھی۔ غسل خانے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے وہ تصوّر ہی تصوّر میں اپنے روئیں روئیں کو نعمت آرا کے مرمریں وجود سے آباد کر لیتا تھا۔ ایسے وقت اس میں اتنی ہمّت بھی نہ ہوتی تھی کہ وہ مُونچھوں پر تاؤ دے کر روز محمد ڈرائیور کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے

اور اپنی چھاتی کی ایک ٹکر سے اُسے پچھاڑ کے رکھ دے!

روز محمد بڑا چابک دست ڈرائیور تھا۔ وہ بہت سی نازک اندام حسیناؤں کو پہلو میں بٹھا کر موٹر چلانا سکھا چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر اچھی سے اچھی کار کے کل پُرزے بھی جھنجھنا اُٹھتے تھے۔ انجن کی رفتار خوفناک طور پر تیز ہو جاتی تھی اور خوف و ہراس، بیم و رجا اور بے بسی کے اس عالم میں روز محمد کے مضبوط بازو سہمے ہُوئے حسن کا سہارا بن جاتے تھے۔

عورتوں کے جسم پر بھی روز محمد ایک ہوشیار ڈرائیور کی طرح جچی تلی نظر ڈالتا تھا۔ چنانچہ اس نے دیکھی سنی، جان پہچان کی عورتوں کے نام بھی کاروں کے موڈل اور ان کی ساخت پر موزوں کیے ہُوئے تھے۔

بیگم یوسف فورڈ ۱۹۲۸ء تھی۔ مسز رام لال ہاشٹر ہوک۔ مسٹر چیٹرجی کی بیوہ بہو سیکنڈ ہینڈ ٹویٹا۔ رائے صاحب کی لحیم و شحیم بیوی، ہمبر کا کشادہ سیلون۔ کسی کو وہ ٹو میٹر کہتا تھا۔ کسی کو ریس کار۔ کسی کو بے بی آسٹن۔ اور آپا کا نام اس نے ٹیکسی رکھا ہُوا تھا۔ سیٹی بجائی اور حاضر۔ میٹر کے حساب سے آٹھ آنہ فی میل کرایہ ہالٹ کا سوا روپیہ گھنٹہ۔ کبھی کبھار روپیہ آٹھ آنہ کی بخشیش۔ دُنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں۔ جن کے پاس بیش قیمت گراں بہا کاریں ہیں لیکن وقت بے وقت ان کو بھی ٹیکسی پر چڑھنا ہی پڑتا ہے۔ خیر روز محمد کا فلسفہ تھا کہ دُنیا میں صرف موٹر ہی نہیں چلائی جاتی، عورت بھی چلائی جاتی ہے فقط چلانے کا سلیقہ چاہیے اور چلنے کا بھی۔

رات کے گیارہ بجے جب سول لائن کی دُنیا پر گناہ و ثواب کے چتکبرے سائے چھا جاتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے دو جلسے بلا ناغہ منعقد ہوتے تھے۔ مردوں کی مجلس روز محمد کی کوٹھڑی میں جمتی تھی! اس میں خانساماؤں اور بیروں، مسالچیوں، مہتروں اور ڈرائیوروں کی برادری کے ارکان شریک ہوتے تھے۔ وہ خیال کی آنکھوں

دیکھی اور دل کے کانوں کی سنی کہانیاں بیان کر کے روز محمد کی کوٹھڑی میں رومان کا ماحول کھڑا کر دیتے تھے۔ ایک خانساماں سناتا تھا کہ اس کے بناتے ہوئے شامی کبابوں پر عنابی ہونٹوں کا ایک جوڑا بے طرح جھپٹا۔ ایک بیرا کہتا تھا کہ کاک ٹیل کا جام بڑھاتے بڑھاتے اس کے ہاتھوں نے کسی کی مخروطی انگلیوں کو چوم کے رکھ دیا۔ ایک مسالچی کہتا تھا کہ مصالحہ پیستے ہوئے اس نے پانی کی بجائے اپنے دہن کا لعاب ملا دیا۔ دزدیدہ محبت اور رومان کے یہ قصے روز محمد کے کمرے کی فضا کو معطر کر دیتے تھے۔ لیکن پھر رام پرتاب مہتر اس رنگین ماحول میں گندے انڈے کی طرح آٹپکتا تھا۔ عنابی ہونٹوں، مخروطی انگلیوں اور لذیذ گالوں کے ذکر میں وہ نعمت آرا کے کموڈ کا قصہ لے بیٹھتا تھا۔ لیکن اس قصے میں بھی رس ہوتا تھا۔ اور خانساماؤں، بیروں، مہتروں، مسالچیوں کی یہ برادری باورچی خانوں سے لے کر پائخانوں تک کی چار دیواری میں اپنی جنتِ گم گشتہ کا سراغ پا لیتی تھی۔

آیاؤں کی محفل میں رومانی قصے چلتے تھے۔ وہ سر سے سر جوڑ کر رموزِ خودی اور اسرارِ بے خودی کی تفسیر گردانتی تھیں۔ وہ تو اپنی کوٹھیوں کے خلوت اور جلوت خانوں کی آشنائے راز تھیں۔ پرورشِ انسانی میں ان کا درجہ گویا ماں کا درجہ تھا۔ ان کے پاس جسم اور روح کی بالیدگی کے انوکھے گُر تھے۔ سنسار مالا کی طرح ان کی آغوش سب کے لیے وا تھی۔ بچے تو سکون پا کر ان کی چھاتی پر سو جاتے تھے۔ لیکن جوان اور بوڑھے اپنی ماؤں کو پہچاننے سے قاصر تھے۔ آیائیں مسکراتی تھیں کہ چلو بیٹے خوش تو ہیں! چنیں ہوا تو کیا، چناں ہوا تو کیا!

یوں بھی زندگی عزیز کی خاطر انھیں سو طرح کے ڈھنگ رچانے پڑتے تھے۔ زبان کے چٹخارے کے لیے خانساماؤں کی خوشامد۔ نئے کپڑوں کے لیے دھوبیوں کی منت۔ ٹکے دو ٹکے کی ضرورت کے لیے مہتروں، مسالچیوں اور بیروں کی حمایت،

نوکروں کے لیے تو خیران کا وجود من و سلویٰ سے کم نہ تھا۔ لیکن اپنے مالکوں کے لیے بھی وہ نعمت خانے کا ضروری جزو تھیں، جنھیں وہ وقت بے وقت ذائقہ بدلنے کے لیے نوش فرمایا کرتے تھے۔ اس پر بھی یہ شکوہ تھا کہ آیائیں آوارہ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

ایک دن روز محمد کار دھونے تالاب پر گیا تو اس کی نظر آیا پر پڑی۔ وہ نیلے کنارے والی سفید دھوتی بے پروائی سے بدن پر لپیٹے بیٹھی بال سکھا رہی تھی۔ آیا کو دیکھ کر روز محمد ہارن بجا بجا کر "ساون کے نظارے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔" گانے لگا۔ آیا نے اپنے ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر اسے غصے سے گھورا۔

روز محمد اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ہائے ہائے میری لاڈو، تیرے فیشن پر اللہ کی مار۔ میں کہتا ہوں گوری، نمونیہ سے مر جائے گی تو جب دیکھو۔ تالاب پر نہا رہی ہے۔ مجھے بتاؤ تو سہی کیا ارادہ ہے تیرا؟"

"چل، روحِم!" آیا روز محمد کو روحِم کہا کرتی تھی۔ "تو نے تو مذاق بنا رکھا ہے۔ مجھے تو کسی فیشن کی لت نہیں، اپنی ضرورت سے سر دھوتی ہوں۔ تم کیا جانو۔"

روز محمد نے ایک مشتاق نظر آیا کے تن بدن پر دوڑائی۔ جیسے وہ موٹر کا ٹائر جانچ رہا ہو کہ ہوا پوری ہے یا کم۔ آیا نے شرما کر دھوتی کا پلو کمر پر اچھی طرح لپیٹ لیا۔ روز محمد آنکھوں کے گوشے سمیٹ کر مسکرایا۔

"آخر آگئی نا ریوڑی کے پھیر میں، کتنی بار کہا تھا کہ سنبھل کے چل۔ لیکن تجھ پر تو جوانی کا بھوت چڑھا ہوا تھا۔ اب بول کس سالے کو باپ بتائے گی؟"

"باپ بتائے گی میری جوتی!" آیا نے تنک کر کہا۔ "میں تو اس کی ماں ہوں گی۔ اسے باپ کی کیا پروا؟"

"اری چپ رہ۔ تو نہیں جانتی سالے کوٹھیوں والوں کو، تجھے کان سے پکڑ کے نکال دیں گے۔ سؤر نے جنے گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز۔ چل تجھے لیڈی ڈاکٹر

کے پاس لے چلوں گا۔ جو سو پچاس خرچ آئیں گے مَیں دوں گا۔ تیری نوکری تو رہے گی میری لاڈو۔" روز محمد بھی یاروں کا یار تھا۔ ڈرائیوروں کی منڈی میں اسے سخی لٹیرا کہا کرتے تھے۔

دم بھر میں آپا نے ساری کائنات کا جائزہ لے لیا۔ اس نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز پر نظر ڈالی۔ اپنی نوکری کا آگا پیچھا سوچا اور دُنیا بھر کے بچّے پالنے والی ماں کو خود اپنے بچّے سے فرار کی ہُوئی دوسری راہ نظر نہ آئی۔ اگلی صبح جب روز محمد کار دھونے کے لیے گیا۔ تو تالاب میں آپا کی لاش تیر رہی تھی۔ اب اسے ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر۔

تلاش

مایوس، غمدیدہ، بیزار...... گوراں فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جا رہی ہے، جانے دو۔ اس کا جسم، اس کا اپنا جسم ہے۔ جس طرح میرا کوٹ اپنا کوٹ ہے مَیں اس کوٹ کو سنبھال کے رکھوں یا پھاڑ ڈالوں۔ خود پہنوں، یا بیچ دوں، یا کسی راہگیر کی جھولی میں ڈال دُوں........ مجھے کون روک سکتا ہے۔ مَیں اپنے کوٹ کا مالک ہُوں۔ گوراں اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گزرتا ہُوا راہرو اسے خرید لے گا۔ خریدنے دو۔ مجھے پشیمانی کا احساس بھی کیوں ہو؟ دُنیا کا نظام کاروباری لین دین پر تو قائم ہے اور پھر گوراں کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے، اور جس قیمت پر چاہے اُسے بیچ دے۔ اپنی چیز ہے۔ اپنی چیز پہ سب قادر ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس میں ٹانگ کیوں اڑائے خواہ مخواہ!

سڑک پر بجلی کے کھمبوں کے نیچے روشنی کے بڑے بڑے دھبے ہیں۔ کھمبوں کے درمیان سنسان اندھیرا ہے۔ گوراں کی زندگی میں بھی تاریک اور اُجلے سایے ہیں۔ وہ

سڑک کے کالے اور سفید دھبّوں کی طرح ساکن اور منجمد نہیں ۔ زندگی کے سلیے چلتے پھرتے نشان ہیں ۔ تمتماتے ہوئے سُورج کے سامنے آوارہ بدلیاں آجاتیں تو زمین پر ایک محدود سا سایہ چھا جاتا ہے ۔ تھکا ہُوا مسافر بے قراری سے اس کی طرف لپکتا ہے ۔ بے وقوف آدمی ! جوں جوں وہ سایہ اس کے قریب آتا جائے گا ، چھاؤں بکھیرنے والے ابر پارے اس سے دُور ہوتے جائیں گے ۔ مجھے اس کا تجربہ ہے ۔ مَیں نے کہا "گوراں تم میری منزل ہو ۔ مجھے اپنی منزل تک آنے دو ۔"

گوراں نے کہا "آجاؤ ! مَیں بھی اپنی منزل کے لیے بھٹک رہی ہوں"

جُوں جُوں مَیں گوراں کی طرف بڑھتا گیا ۔ میری منزل مجھ سے دُور ہوتی گئی ۔ جیسے سراب کی طرف بھاگنے والا پیاسا مسافر بھاگتا جائے ، بھاگتا جائے اور انجام کار پانی کی ٹھنڈی لہروں کی جگہ ریت کے گرم گرم تودوں میں اٹک کے رہ جاتے ۔ مَیں گوراں کی طرف بڑھتا گیا ، بڑھتا گیا ۔ اور جب مَیں نے گوراں کو قریب قریب پالیا تو وہ گوراں نہ تھی ۔ وہ اس کا جسم تھا ۔ خوبصورت ، مرمریں ۔ ستار کے تاروں کی طرح کسا ہُوا ، جھنجھناتا ہُوا جسم ۔ عورت کی کائنات اس کا جسم ہی تو ہے ۔ شاید گوراں کا مرمریں بدن سڑک کے اگلے موڑ پر بک گیا ہو ۔ بکنے دو مجھے ہمدردی کا احساس بھی کیوں ہو ؟ وہ اپنے خوبصورت جسم کی مالک ہے ۔ بالکل مختار جیسے مجھے اپنے کوٹ پر اختیار ہے ۔

ظہیر میری باتوں پر ہنستا ہے ۔ وہ میرا پرانا یار ہے ۔ ہم برسوں ہم جماعت رہے تھے ۔ اب قسمت کی ستم ظریفی نے ہم دونوں کو ایک ہی دفتر میں اکٹھا کر دیا ہے ۔ مَیں ساڑھے بارہ سو پاتا ہُوں ۔ ظہیر کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار ہے ۔ جب ہم کہیں اکیلے ہوتے ہیں ۔ تو وہ بے تکلفی سے میرے سر پر چانٹا مار کر گرجنے لگتا ہے :

" ابے او صاحب کے بچے ! تم روز بروز سڑی ہوتے جا رہے ہو ۔ تلاس ، فرار ،

فلسفہ .... مَیں کہتا ہُوں سب بکواس ہے ۔ تم کیا جانو عورت کس چیز کا نام ہے ؟ میری طرف دیکھو ، جب میری جیب میں ساڑھے پانچ آنے کے پیسے ہوتے ہیں ، تو مَیں صبح سویرے سیدھا علم دین سبزی والے کی دکان پر پہنچتا ہُوں ۔ آدھ سیر پالک لیتا ہُوں ، ڈیڑھ پاؤ آلو ، دو پیسے کے ٹماٹر ——— اور کسی کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ مجھے سبزی خریدنے کا ڈھنگ نہیں آتا ! لیکن اگر کسی روز کوئی حرامزادہ ضرورت سے زیادہ مٹھی گرم کر دے ، اور میری جیب میں دو ایک روپے کھنکتے ہوں ، تو مَیں سبزی منڈی میں جا کے لٹک جاتا ہُوں اور دل ہی دل میں سوچتا ہُوں کہ علم دین کی دکان بھی کوئی دکان ہے بھلا ؟ باسی مال ، سڑے ہُوئے پتے ، گندی ٹوکریاں ۔ مَیں پربھدیال کی دکان میں جھانکتا ہُوں ۔ کرتار سنگھ کے خوب صورت سٹال کا جائزہ لیتا ہُوں اور دل ہی دل میں گوبھی ، مٹر ، چقندر ، سلاد اور اناناس کے وٹامنز اے ، بی ، سی کا تجزیہ کرتا ہُوں ۔ لیکن حساب ٹھیک نہیں جمتا ۔ کبھی وٹامنز کے اجزا میرے دو روپوں سے آگے نکل جاتے ہیں ۔ اسی ادھیڑ بن میں ساڑھے دس بج جاتے ہیں ۔ مَیں جلدی جلدی کسی چھابڑی والے سے گلی سڑی سبزی تلوا کر بھاگم بھاگ واپس آتا ہُوں ۔ بیوی ناک بھنوں چڑھاتی ہے ۔ خالی پیٹ دفتر جاتا ہُوں ۔ اور وہ حرامزادہ آفس سپرنٹنڈنٹ میرے لیٹ آنے پر آنکھیں نکالتا ہے ——— کیا سمجھے بیٹا ؟ .... میرے چالیس روپوں پر دو لڑکیوں کے باپ رتے تھے ۔ مَیں نے ایک کو پھانس لیا ...... تمھارے ساڑھے بارہ سو پر بہت سی لڑکیاں اور ان کی مائیں بھنبھنا رہی ہیں ۔ دو ایک کو پھانسو اور عیش کرو ...... ورنہ لٹکتے رہو گے بچہ ! جس طرح میں کرتار سنگھ کے سٹال پر لٹک جاتا ہُوں ...... "

ظہیر کی زبان پر عورت کا نام ایک لذیذ چٹخارے کی صورت میں آتا ہے ۔ کالج کے دنوں میں اُسے چاٹ کا شوق تھا ۔ جب کبھی املی کے پانی سے بھرے ہُوئے گول گپے منہ میں ڈالتا تھا ، اس کے ہونٹوں سے چار چار انگل لمبی لال ٹپک پڑتی تھی ۔

اور وہ کسی خاموش لذت سے بلبلا اٹھتا تھا۔

"ہائے ہائے، کیا خستہ گول گپا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے مس کلیانی کے لال لال ہونٹ پگھل رہے ہوں!"

چاٹ کے ہر تازہ لقمے کے ساتھ وہ اپنے کالج کی لڑکیوں کا کوئی نہ کوئی حسین حصّہ نگل جاتا تھا۔ مس کلیانی کے ہونٹ، خالدہ کے دہکتے ہوئے گال، زرینہ کی حنائی انگلیاں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ظہیر کہتا ہے "عورت شہد کی مکھی ہے۔ وہ زندگی کے خشک اور بے کار چھتے میں رس بھرتی ہے۔ اس کے زہریلے ڈنگ پہ نہ جاؤ، اس کی رسیلی مٹھاس دیکھو۔ تم نے نیلما کو دیکھا ہے؟ اندرسین ڈسپیچر کی خوبصورت بیوی۔ وہ پاجی اسی دفتر میں گمنام سا اُمیدوار تھا لیکن نیلما کی رعنائیوں نے دفتر کی شاہراہ پر رنگین جال بچھا دیے۔ آفس کا ایک دل پھینک ناخدا زیرِ دام آ گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اندر چوبیس امیدواروں کے اُوپر سے پھلانگتا ہوا ڈسپیچر کی کرسی سنبھال بیٹھا ـــــ ہائے عورت کی نگاہ! میرے بھائی! اس کی نگاہ سے زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔ تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ نگاہِ مردِ مومن کی تلاش کون کرے۔ ذوقِ یقین کا سودائی کون ہے ـــــ دُنیا ہے تو عورت کی گود میں۔ عقبیٰ ہے تو اس کی مسکراہٹ میں۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ اب اندرسین ہیڈ کلرکی کے خواب دیکھ رہا ہے، نیلما کی بلوری گردن میں اب پھر لطیف خم پیدا ہو رہے ہیں۔ خدا کی قسم تم اس سنہری گرداب میں بے تکلف کود جاؤ۔ ایک بچاری ہیڈ کلرکی کیا چیز ہے، تم میری مانو تو اس مرمریں گردن کے ایک حلقے پر دفتر کی ساری کائنات اندرسین کو سونپ دو ـــــ ہائے کیا لوچ ہے ظالم کی گردن میں۔ جیسے عمر خیام کی رباعی تھرک تھرک کر ناچ رہی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ظہیر میں ایک یہی بڑا عیب ہے۔ وہ عورت میں عورت کو نہیں دیکھتا وہ

عورت میں اس کا جسم ٹٹولتا ہے اور پھر جسم میں بلوری گردنوں، ناچتی ہوئی آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے سینوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اسی پر بس نہیں وہ جسم کی ہر رعنائی، حسن کے ہر پیچ، سینے کے ہر نشیب و فراز کو بیوپاری کی نظر سے ناپ تول کے ان پر قیمتوں کے لیبل لگا دیتا ہے۔ نیلما کی گردن کے خم کی قیمت میرے دفتر کی ہیڈ کلرکی ہے۔ صادقہ اس کی بیوی ہے۔ لیکن ظہیر کہتا ہے کہ صادقہ کی گھنی اور گھنگھریالی زلفوں کی قیمت چالیس روپے ماہوار ہے۔ چنانچہ پہلی تاریخ کو وہ اپنی ساری تنخواہ صادقہ کی جھولی میں ڈال دیتا ہے جب کبھی دفتر میں اس کی سٹی معمول سے زیادہ گرم ہو جائے تو وہ اپنا غبار ہلکا کرنے کے لیے چھمی جان یا گلزار بیگم یا رتنا بائی کے کوٹھے میں پناہ لیتا ہے، چھمی جان تین روپے۔ ۔ ۔ ۔ گلزار بیگم پانچ روپے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رتنا بائی دس روپے، کیونکہ اس کے گال پر ایک ننھا سا تل ہے۔ اور اس کے عنابی ہونٹوں میں پکتے ہوئے انگوروں کا رس چھلکتا ہے۔ ایک دن وہ گوراں کے چوبارے میں گیا۔ اس کی جیب آسودہ تھی۔ اس نے ایک ایک روپے کے بیس نوٹ گوراں کے سامنے بچھا دیے۔

گوراں نے کہا "آپ یہ نوٹ اپنے ہی پاس رکھیں۔ آپ میری قیمت نہیں دے سکتے۔"

ظہیر نے سوچا، وہ بن رہی ہے۔ اس نے گوراں کو اسی قیمت پر چکایا تھا۔ اس نے اپنا بٹوہ نکال کر ہوا میں اچھالا اور فخر سے بولا "مانگو کیا مانگتی ہو جانِ تمنّا! آج تمہارا ظہیر خوشحال ہے۔"

گوراں نے ایک تھکی ہوئی انگڑائی لی "ظہیر صاحب، مَیں روز روپیہ کماتی ہوں۔ آپ روز روپیہ لٹاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ آج ایک لمحہ کے لیے آپ مجھے گوراں نہ سمجھیں۔ ایک عورت سمجھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک لمحہ کے لیے آپ گاہک نہ بنیں، ایک مرد بن جائیں۔ بس ایک دو بے لوث لمحے میری حیات کو جاوید کر دیں گے۔"

ظہیر ہنسنے لگا۔ وہ اُلّو کا پٹھا کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ گوراں کے کھوئے کھوئے اضطراب کو سراہتا تھا۔ اس نے زبردستی اسے بیس روپے دے دیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ازل سے گوراں کی تعمیر میرے لیے ہوئی تھی۔ کائنات میں اس کا وجود میرے وجود کا عکس تھا۔ لیکن جب ہم ملے، تو ہمارے درمیان ایک وسیع اور بھیانک خلا منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ وہ اپنے چھبیسویں سال میں ہے پچھلے تیرہ برس سے وہ ہر روز بکری کے گوشت کی طرح ترازو میں تُل تُل کر بکتی رہی ہے۔ سینکڑوں، ہزاروں انسان اپنی پشت ہا پشت کی کیچڑ اس پر اچھال چکے ہیں۔ بنی نوع انسان کی صدیوں کا سیاہ کار زہر گوراں کی رگ رگ میں سمویا ہوا ہے۔ ایک قاتل بیماری کے انگارے اس کے خون میں چھلک رہے ہیں۔ اس کی گلاب کی پتیوں جیسی ملائم اور مشک بار جلد کے نیچے بڑے بڑے گھاؤ ہیں۔ لیکن وہ کہتی ہے کہ محبت کے بے لوث لمحے، اس کی حیات کو جاوید کر دیں گے!

میں نے کہا "گوراں! اگر تو کائنات کے آخری کنارے پر بھی ہوتی، تو میں ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر تیرے پاس پہنچ جاتا۔"

اس کا جسم بے داغ جسم نہیں۔ اس کا جسم پامال جسم ہے۔ پھول کی طرح پامال نہیں جو پاؤں کے ایک ہی دباؤ سے لُٹ کر مر جاتا ہے . . . . . بلکہ سڑک کی طرح، جس کی چھاتی پر بھک بھک کرتا ہوا اسٹیم رولر اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ریلتا جائے . . . . . پیدل چلنے والے جوتیاں چٹخاتے گزرتے جائیں ٹم ٹم اور ٹانگے چیخ چیخ کرتے نکلتے جائیں۔ موٹریں گرد اڑاتی بھاگتی جائیں۔ سڑک گھستی جائے۔ پتھر ٹوٹتے جائیں، لیکن گزرنے والے گزرتے رہیں۔ چلنے والے چلتے رہیں اور پھر میونسپلٹی کا اسٹیم رولر بھک بھک کرتا ہوا آئے . . . . گوراں میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے خوبصورت جسم کو میونسپل کمیٹی کی پختہ سڑک کی طرح بچھا کر آپ ایک طرف کھڑی ہو جاتی تھی۔

پیدل چلنے والوں کی طرح تھکے ہوئے کلرک، موٹر کی طرح سبک رفتار چھوکرے، سٹیم رولر کی طرح بھبھکتے ہوئے موٹے موٹے سیٹھ . . . . یہ آئے، وہ گئے، یہ گرے وہ پھسلے، یہ بیٹھے وہ بھاگے . . . . اور گوراں کنارے کھڑی مسکراتی رہتی تھی، گوراں اور گوراں کے جسم کے درمیان ایک زبردست دیوارِ چین حائل تھی۔ اس دیوار کی بنیاد ایک ننھی سی آرزو پر قائم تھی۔ وہ آرزو دنیا کے خزانوں سے موتی یا ہیرے یا ریشم کے انبار نہیں مانگتی۔ وہ زندگی کے دو بے لوث لمحوں کی خیرات چاہتی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے دھڑکتے ہوئے لمحے جو اس کی کھڑ کھڑ چلتی ہوئی پن چکی کو جاودانی سکون دے سکتے تھے۔

ظہیر کہتا ہے "عورت شہد کی مکھی ہے۔ وہ زندگی کے خشک اور بیکار چھتے میں رس ٹپکاتی ہے۔" ظہیر بکتا ہے۔ وہ رتنا بائی کے ہونٹوں کی مٹھاس پر اپنا فلسفہ جماتا ہے۔ صادقہ کی موسیقار آنکھوں سے اپنے مقولے چراتا ہے سؤر کہیں کا۔ ان دو سوتیلی بہنوں کے سستے ایثار نے اس کو اندھا کر دیا ہے۔ اور وہ ایسی مکھیوں کے چھتے نہیں دیکھ سکتا جو رس دیتی نہیں، رس لیتی ہیں۔ رس چوستی ہیں۔ رس چراتی ہیں . . . . بیگم ستار کی طرح، جو بھری محفل میں اپنی جوان چھوکری کو ننگا کر کے بٹھا دیتی ہے . . . . "آہا، بیٹا۔ میری ثروت سے ملو۔ ثروت بڑی شرمیلی لڑکی ہے" اور پھر وہ قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان اشاروں ہی اشاروں میں شرمیلی ثروت کی ریشمی ساڑھی اور پتلا بلاؤز اتار کر رکھ دیتی ہے۔ یہ ثروت کی صراحی دار گردن ہے۔ یہ رہے ثروت کے مرمریں کہنتان یہ ثروت کی لچکیلی کمر . . . . کوئی دل ہی دل میں بول دیتا ہے۔ شرمیلی ثروت ایک شرمیلی ثروت دو، شرمیلی ثروت تین . . . . . . قیمت ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار! . . . . . . گوراں بھی یوں ہی بکتی آئی ہے۔ لیکن گوراں کا نام سنتے ہی بیگم ستار کو غش آ جائے حاجی عثمان کی بھنویں تن جائیں گی۔ ڈاکٹر رحیم کے ہونٹ بھی بھنچ جائیں گے اور رتنا بائی انھیں

وہ اُمید افزا لمحے بھی یاد نہ رہیں گے۔ جب وہ انشورنس پالیسی بیچنے والوں کی طرح شادی کا بیمہ کر کے اپنی لاڈلی بیٹیوں کو مکلف شبستانوں کے اندر دھکیل دیتے ہیں۔ ثروت، مجیدہ، زہرہ، خورشید، نجمی، عفت . . . . . . سب خوشگوار لڑکیاں ہیں۔ حسین، بیحد حسین، ستاروں کے جھرمٹ کی طرح، جو نیلے نیلے آسمان کے درمیان جگمگا رہے ہوں۔ ان کے مہکتے ہوئے لچکیلے جسم . . . . . . او میرے خدایا! ان کے مہکتے ہوئے لچکیلے جسموں میں چاند اور سورج اور کہکشاں نے اپنا سرمایہ لٹا کے رکھ دیا ہے۔ ان کی نشیلی اور بلیغ آنکھوں میں بڑے بڑے خوش آیند پیام جھلکتے ہیں۔ لیکن ان کی تمناؤں کی معراج مستقبل کے سہانے سپنوں میں ہے۔ وہ آنے والی کل کا انتظار کر رہی ہیں کیونکہ اُنھیں اپنے ہوشربا حسن کا خراج وصول کرنا ہے۔ آراستہ بنگلے، چمکیلی گاڑیاں، بھڑکیلے لباس . . . میں ڈرتا ہوں کہ شاید وہ اپنے مصروف لمحوں میں سے ایک بے لوث لمحے کی زکوٰۃ دے سکیں گی۔

میں نے ظہیر کی خوشامد کی، کہ دوست! تم گوراں کی زندگی کو جاوید نہیں کر سکتے۔ خدا کے لیے اسے میرے پاس لے آؤ۔ دُنیا کی ساری آبادی میں ایک وہ میری مقدس امانت ہے۔ "مقدس؟ ارے توبہ توبہ!" ظہیر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے . . . . . "تم نہیں جانتے گوراں کو، اس کے جسم میں اِتنے اِتنے لمبے جراثیم ہیں۔ گلتے ہوئے، زہریلے، مہلک کیڑے . . . . . تم مقدس کہتے ہو، اس سڑتی ہوئی لاش کو؟"

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ظہیر کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ اس کے نچلے جبڑے کا ایک دانت کٹاک سے ٹوٹ کر قالین پر جا گرا۔ ظہیر نے گرم گرم، سُرخ سُرخ خون کی ایک کلی غٹ سے نگل لی . . . . . . اور اگلے روز گوراں کو لے کر آیا۔ وہ آئی۔ جھجکتی ہوئی، ہچکچاتی ہوئی، لجائی لجائی سی۔ جیسے زندگی کے طوفان میں کہیں دُور اُفقی لکیر پہ ایک روشنی کا مینار آہستہ آہستہ اُبھر رہا ہو۔

ایک دن میں نے کہا، "گوراں، تمھارا چوبارہ تمھیں زیب نہیں دیتا۔ تم اپنے بالاخانے کے پٹ مقفل کر دو۔"

گوراں حیران سی ہو گئی۔ اس کے خوشنما ہونٹ تعجب سے کھل گئے۔ "کیوں؟"

وہ بولی:

میں نے کہا، "گوراں، تمھارا وجود معمولی سطحوں سے بہت بلند ہے۔ تم بالاخانے کی کھڑکی میں بیٹھنے والی گوراں نہیں ہو۔ تم کسی کے خوابوں میں بسنے والی عروسانہ تجمیل ہو۔ اگلے مہینے ہم دونوں نیلگری کی شاداب پہاڑیوں پر جانے والے ہیں۔ میں تم کو کوہ نور کے سینے ٹوریم میں داخل کرا دوں گا۔ سینیٹوریم کا بڈھا سپرنٹنڈنٹ میرا دوست ہے۔ وہ تمھارے خون کے قطرے قطرے کو زہریلی چنگاریوں سے پاک کر دے گا۔ تمھاری نس نس میں جو دہکتے ہوئے گھاؤ ہیں وہ بھر جائیں گے۔ تمھارے جیون کو جو گھن کھا رہا ہے، وہ مٹ جائے گا . . . . ."

"تم سچ کہتے ہو۔" گوراں نے کہا، "لیکن میں تمھارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میرے بالاخانے کے پٹ میری روزی کا راستہ ہیں۔ میں انھیں کیسے بند کر سکتی ہوں بھلا؟"

مجھے گوراں کی جہالت پر غصہ آ گیا۔ میں نے اس کی گھنی زلفوں کا گچھا بنا کر اس کے منہ پر بہت سے کوڑے مارے۔ "تم اپنے بالاخانے سے اپنی روزی کا سہارا لو، گوراں، کیا سچ مچ تم سمجھتی ہو کہ میں ساڑھے بارہ سو ماہینہ صرف اپنے لیے کما رہا ہوں؟

گوراں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں تیز تیز شعاعیں پھیلیں اور بکھر گئیں۔ اس کا اُوپر والا ایک دانت کھچ سے نچلے ہونٹ میں دھنس گیا اور پھر یکایک دو چار وحشی جھٹکوں کے ساتھ اس نے اپنی احمری ساڑھی کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ پلک جھپکنے میں میرے سامنے گوراں نہ تھی، اس کا جسم تھا۔ خوبصورت مرمریں ستار

کے تاروں کی طرح کسا ہُوا۔ جھنجھلاتا ہُوا جسم۔

"تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔" وہ میرے ساتھ لپٹ کر مجھے دونوں ہاتھوں سے نوچنے لگی۔ گوران کی قیمت بیس ٹکے رات تھی۔ تم اسے ساڑھے بارہ سو مہینہ پر چکار رہے ہو۔ تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔ مجھے اپنا شکریہ ادا کرنے دو۔" اس کے لانبے لانبے سُرخ ناخن کئی جگہ میرے جسم میں کُھب گئے۔ ایک خون آشام نظر اس نے چاروں طرف دوڑائی۔ میز کے اُگالدان کو اُٹھا کر زور سے پٹخ دیا۔ اپنی ساڑھی کے اُلجھے ہُوئے ٹکڑوں کو سمیٹا۔ اور آہستہ آہستہ چلی گئی۔ جیسے دُور سے جھلکنے والا روشنی کا مینار سمندر کی لہروں میں تحلیل ہو جائے۔ گوراں کی سِسکیوں میں لپٹی ہُوئی ایک آواز دور رہی تھی۔ ...... "تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ نہ دے سکے۔ تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لَوث لمحہ نہ دے سکے۔"

مایوس، غمدیدہ، بیزار گوراں فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جا رہی ہے۔ جانے دو۔ وہ اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گزرتا ہُوا راہرو اسے خرید لے گا...... خریدنے دو۔ مجھے اس پر کوئی اختیار بھی تو نہیں......"

دو رنگا

نام ضمیر، پیشہ انجینئری۔ لیکن عرفاً اسے دو رنگا کہتے تھے۔ اس نام سے اس کو چڑ تھی۔ لیکن یہ اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کے منہ پر برص کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ گالوں پر، ماتھے پر، ہونٹوں پر، کانوں کے پاس، ٹھوڑی کے نیچے، گردن کے ارد گرد، آنکھوں کے پپوٹوں پر۔ ہر جگہ سفیدی کے بڑے بڑے چوڑے چوڑے داغ تھے جن کے درمیان جا بجا اصلی جلد کے کالے کالے نشان بے ترتیبی سے بکھرے ہُوئے تھے۔ جیسے سمندر کے جھاگ پر کوئلوں کے ذرّے تیر رہے ہوں۔

کچھ لوگ اسے دُھوپ چھاؤں کہتے تھے۔ لیکن یہ نام اس کے دفتر کے کلرکوں اور چپراسیوں تک ہی محدود تھا۔ کیونکہ وہ اس کے مزاج میں دھوپ کی تیزی اور دسمبر کی کپکپا دینے والی چھاؤں سے کافی واقف تھے۔

دو رنگی جلد، دو رنگا مزاج، قسمت بھی اس کی زندگی کو ہر پہلو دو غلا بنانے میں مدد دے رہی تھی۔ چنانچہ جب وہ لندن سے انجینئری کا امتحان پاس کر کے لوٹا، تو اپنے

ساتھ ایک سفید فام بھورے بالوں والی چھوکری بھی لیتا آیا۔ بار برا ایسٹ اینڈ کے ایک چھوٹے سے قہوہ خانے میں برتن دھونے پر ملازم تھی۔ اس قہوہ خانے میں برتن دھونے والیوں کی تعداد برتنوں سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ تاہم لوگ وہاں جوق در جوق قہوہ پینے جاتے تھے۔ کچھ من چلے ہندوستانیوں نے اس جگہ کا نام قحبہ خانہ رکھ دیا تھا۔ لیکن انگریزی زبان کی بے ریا سادگی میں ہائے ہوز اور ہائے حطّی کا امتیاز ممکن نہیں ہے۔ اس لیے جو قہوہ پینا چاہتے تھے، وہ قہوہ پیتے رہے۔ اور جو قہوے کی جگہ قہوے کے برتنوں سے دل چسپی لیتے تھے، وہ برتنوں سے دل چسپی لیتے رہے۔ دو رنگا بھی دل چسپیوں کا عادی تھا۔ لیکن ایک دن یکایک اس کے برتن لبالب بھر کے چھلک اُٹھے، اور برص کے سفید داغوں کی طرح باربرا بھی اس کی زندگی کے ساتھ چپک کے لگ گئی۔ حادثات ہی تو ہیں!

جب وہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ اسے اپنی سیاہ جلد کی یک رنگی اور پختگی پر ایک عجیب قسم کی کمتری کا احساس ہوتا تھا۔ نیو ہوسٹل میں ایک لطیفہ تھا کہ دُنیا کے مکمل ترین چاند گرہن کا حساب لگانا ہو تو کالج کے رجسٹر سے ضمیر کی تاریخ پیدائش نکال کے اس میں سے نو مہینے کے دن تفریق کر دو........! مذاق ہی مذاق میں لڑکے اسے اپنے بستر کی سفید چادروں سے اٹھا دیتے تھے۔ پختہ رنگ ہے بھئی۔ پسینے کا ایک قطرہ بھی ٹپک گیا، تو داغ پڑ جائے گا! وہ دل ہی دل میں اپنی کلاس کی زیب النسا سے محبت کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا، کہ اس کی محبت کی انتہا یہ ہے کہ وہ ایک بار زیب النسا کے عنابی ہونٹوں کو چوم لے۔ وہ سادگی پسند اور قناعت شعار عاشق تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ محبت کو سرمایہ دارانہ لالچ کے زہر سے بے لوث رکھنا چاہیے۔ خوبصورت عورت چلتا پھرتا نور ہے۔ وہ سب کی مشترکہ امانت ہے۔ اس کی ایک جھلملاتی ہوئی کرن زندگی کو سرشار کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ زیب النسا سے کہا کرتا تھا، کہ تو دُنیا بھر کے عاشقوں کی مساوی پونجی ہے۔ اس میں میری محبت کا حصّہ صرف اتنا ہے، کہ میں تیرے نازک اور خون آشام

ہونٹوں سے ایک چھوٹا سا لمس چرا لوں!

زیب النسا نے کہا یہ بہت خوب، مجھے منظور ہے۔ لیکن کیا آپ مجھے یہ گارنٹی دیتے ہیں کہ آپ کے ہونٹوں کا رنگ کچا نہیں ہے؟......"

لندن پہنچ کر ضمیر کے ساتھ دو حادثے پیش آئے۔ ایک تو یہ کہ اس کی زندگی میں دو رنگی علامات کا ظہور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے بڑے شوق سے ویسٹ اینڈ کی ایک دکان سے مڈنائٹ بلو کا بانکا سا ڈنر سوٹ بنوایا۔ یہ دوسری بات ہے، کہ اس سوٹ کی نمائش کے وقت اس سے ایک فاش، لیکن معصوم غلطی سرزد ہوئی۔ یعنی جب اس نے پہلی بار اپنا سیاہ ڈنر سوٹ پہنا اس وقت دن کے ایک بجے لنچ کا ٹائم تھا!.... ......شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ ضمیر کی جلد کی سیاہی اس کی اجلی خواہشات کے راستے میں حائل نہ ہو۔ اس لیے ایک دن بیٹھے بٹھائے اس کے بدن پر برص کے بڑے بڑے سفید داغ نمودار ہونے لگے۔ قدرت فیاض بھی ہے اور بخیل بھی۔ بدقسمتی سے وہ ضمیر کے حق میں بخیل ثابت ہوئی۔ کالی جلد پر سفیدی کا جو عمل جاری ہوا تھا، وہ ادھورا ہی رہا۔ ضمیر کا اُوپر والا ہونٹ اپنی اصلی حالت میں تھا لیکن نچلے ہونٹ پر دہی کی پھٹکیاں سی بکھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ جیسے وہ برفاتی ہوئی نمکین لسی کا گلاس پی کر ہونٹوں پر زبان پھیرنا بھول گیا ہو! اگر زیب النسا لندن میں ہوتی، تو وہ شوخ اور شریر لڑکی ضرور چلاتی۔ ...."میں نے پہلے ہی کہا تھا، تمھارا رنگ کچا ہے۔ جو لندن کے ایک ہی چھینٹے سے دُھل گیا۔"

دوسرا حادثہ ایسٹ اینڈ کے قہوہ خانے میں پیش آیا۔ یعنی باربرا برص کے سفید داغوں کی طرح اس کی زندگی کے ساتھ چپک گئی...... اس نے دونوں مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے بہت سی جدوجہد کی۔ بہت سا روپیہ لٹایا۔ لیکن کوئی دوا، کوئی اپریشن اسے نجات دلانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ شکست کے

شکست ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ تاریکی میں روشنی تلاش کرتا تھا۔ میری جلد؟ میری جلد زخم خوردہ ہے۔ ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں پٹرول ٹینک کو آگ لگ گئی لپکتے ہوئے شعلوں نے چار انجن کی اس نایاب مشین کو دیکھتے ہی دیکھتے خاک کر دیا۔ فرض کی انجام دہی ہر عالم میں لازمی ہے۔ پائلٹ کو بچاتے بچاتے میرا اپنا جسم جھلس کے دھوّاں ہوگیا۔ لیکن فرض آخر فرض ہے...... میری بیوی؟ میری بیوی لنکاشائر کے سر ولیم میکفرسن کی اکلوتی بھتیجی ہے۔ ان کے کارخانوں کی ململ دنیا بھر کی منڈیوں میں کھپتی ہے۔ باربرا بڑی خود دار لڑکی ہے۔ ہماری پہلی ملاقات پرائم منسٹر کی گارڈن پارٹی میں ہوئی...... کوئی حرامزادہ کہتا ہے وہ ایسٹ اینڈ کے قہوہ خانے میں برتن دھویا کرتی تھی؟......

جب وہ جہاز سے اترے تو بمبئی کے تاج محل میں ان کی ملاقات راجکمار دلاور سنگھ سے ہوئی۔ دورنگا کار آزمودہ شکاری تھا۔ لندن میں اس نے بہت سے نرالے گر سیکھے تھے۔ ایسٹ اینڈ والے کافی ہاؤس کا مالک قہوے کے ساتھ بسکٹوں کی جگہ جوان چھوکریاں بیچتا تھا۔ ویسٹ اینڈ کی لینڈ لیڈی مالدار مہمان پھانسنے کے لیے اشتہار کی جگہ اپنی خوبصورت لڑکیاں دیا کرتی تھی۔ دورنگے نے آتے ہی بنسلی کے ساتھ باربرا کا کھلتا ہوا بدن چپکا کر کنڈی دریا میں ڈال دی۔ دلاور سنگھ لالچی مچھلی کی طرح لپکا، اور پھنس کے اٹک گیا۔ شمپین، وسکی، کاک ٹیل اور تاج محل ہوٹل کی بھڑکیلی رقص گاہ آدھی رات تک باربرا سفید ریشم کے لچھوں کی طرح دلاور سنگھ کی بانہوں سے لپٹی ہوئی ناچتی رہی۔ اگلی صبح یکایک راجکمار کو یاد آیا کہ اس کی ریاست کے لیے ایک قابل انجینئر کی فوری ضرورت ہے۔ دورنگے نے تجاہل عارفانہ برتا۔ "ناچیز ملازمت کے قابل کہاں ہے۔ کمار صاحب! اپنی طبیعت تو سیلانی ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ اور پھر یہ انجینئری تو وقت کاٹنے کا بہانہ ہے......

باربرا کے چچا سر ولیم میکفرسن کے کارخانوں میں...... راجکمار دلاور سنگھ نے لنکاشائر کے سر ولیم میکفرسن کے کارخانوں کی تفصیل بڑے انہماک سے سنی اور پھر سوز گداز کے ساتھ اپنی زبوں حالی کا نقشہ بیان کیا...... رعایا کی غربت پر لمبی لمبی آہیں بھریں۔ تجارت اور صنعت کی پستی کا رونا رویا۔ اپنے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کی نااہلیت پر لعنت بھیجی۔ اور پھر ریاست کی ترقی کے امکانات پہ بھی روشنی ڈالی۔ گھنے اور وسیع جنگل، تیز رو پہاڑی ندیاں، نیلم اور سونے کی چھپی ہوئی کانیں...... ہزاروں سال سے زمین کی چھاتی خزانوں کے انبار سنبھالے بیٹھی ہے۔ اگر مسٹر ضمیر چاہیں تو آسانی سے اس نایاب دولت کو بے نقاب کر کے ریاست کے لاکھوں بھوکے ننگے انسانوں کو مالا مال کر سکتے ہیں...... باربرا نے بھی کہا کہ اپنا وطن چھوڑنے کے بعد اب یہی میرا وطن ہے۔ یہاں کی غلاظت اور پستی کو دور کرنا ہمارا انسانی فرض ہے...... اور اس وقت تاج محل ہوٹل کی بالکنی پہ کھڑے ہو کر دس شلنگ ہفتہ پہ جھوٹے برتن دھونے والی اور ساڑھے چار شلنگ رات پہ بکنے والی چھوکری نے اپنا اخلاقی اور انسانی فرض بے باق کر کے رکھ دیا۔ اس نے راس کماری سے لے کر ہمالیہ پربت تک جتنے گندگی کے ڈھیر ہیں، اور گندگی کے ڈھیروں میں جتنے رینگنے والے انسانی کیڑے ہیں۔ ان سب کی نجات کا بیڑا اٹھایا، اور مسٹر ضمیر الدین جلالی، احساس فرض سے مجبور ہو کر سر ولیم میکفرسن کے کارخانوں کی جگہ سورج نگر کی ریاست میں انجینئر بن گئے۔

"بے شرم ہے سالا!" رمضان علی اوورسیئر کہتا تھا۔ "اس سے تو اچھا تھا کوٹھے میں بٹھا دیتا اپنی ماں کو۔"

"بھئی عورت کیا ہے، نری ٹیکسی ہے ٹیکسی!" تیرتھ رام اکاؤنٹنٹ چٹخارے لیا کرتا تھا۔ "جہاں دیکھو چل رہی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں رفتار کا زمانہ!"

"سالے لنگور کی شکل تو دیکھو" خزان چند ڈرافٹس مین اپنے نئے انجینئر سے بیزار تھا۔ "نقشوں کی الف سے ب تک نہیں آتی اور مصیبت میں ڈال رکھا ہے ہم کو ماں کے خصم نے۔"

"جب دیکھو نشے میں گٹ ہوتا ہے، بہن کا یار۔ جہاں جاتا ہے۔ پہلے چھوکری مانگتا ہے.......میں نے کہا سنبھال کے رکھا ہوتا سالی ٹیکسی کو......."

پنڈت بالک رام کو طیش آتا تھا۔

"ارے میاں، ہٹاؤ قضیہ" مولوی تمیز الدین کا خیال تھا۔ "جو چھوکری دیتا ہے، وہ چھوکری لے گا بھی۔ لاحول ولاقوۃ۔ لیکن یار، پاجی کا جسم یوں مہکتا ہے، جیسے........ تھو تھو۔"

سارے دفتر نے کسی خیالی بدبو سے گھن کھا کر اپنی ناکوں پر رومال رکھ لیے۔ اصل میں دورنگے کے تن بدن میں ایک عجیب قسم کی تیز سی سٹراند بسی ہوئی تھی۔ لندن جانے کے بعد اس نے کھانے کے بعد کلی کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اور کموڈ کے بعد پانی کی جگہ ٹائلٹ پیپر کا استعمال جاری کر دیا تھا۔ ایک تو ہندوستانی موسم۔ دوسرے ہندوستانی معدہ۔ یہ روگ ٹائلٹ پیپر کے بس کا نہ تھا۔ چنانچہ دورنگے کا منہ اور پتلون ہمیشہ بڑے زور سے مہکا کرتے تھے۔

دورنگا ریاست کی وزارت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس لیے بار برا کے لطیف لوچ میں اور بھی زیادہ لطافت بھرنے کی ضرورت تھی۔ اُسے ساڑھے سات سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ لیکن اس حقیر سی رقم کے پس منظر میں سُورج نگر کی کھلی ہوئی تجوریاں تھیں۔ باربرا کے میک اپ کی قیمت تنخواہ سے پوری ہوتی تھی۔ اس کے لباس کا خرچ کمار کے تحفوں سے چلتا تھا اور دورنگا؟........ دورنگے کا گزارہ رشوت پر تھا۔ وہ رشوت میں روپیہ بھی لیتا تھا، اور عورت بھی۔ اس کے دستخط آٹھ آنے

سے لے کر پانچ ہزار تک بکتے تھے۔ اس کی رات سڑک کوٹنے والی پہاڑن سے لے کر کسی معتوب اوورسیئر کی سہمی ہوئی دلہن کے ساتھ گزر جاتی تھی۔ اگر عتاب کے نزول سے عورت یا روپیہ ملنے کی اُمید ہو، تو عتاب نازل کرنا بذاتِ خود ایک خوشگوار عمل ہے۔ ایک ہزار؟ وہ اپنے عملے سے مطالبہ کرتا تھا۔ ایک ہزار ممکن نہیں۔ بیوی؟ بیوی نہ سہی، بہو؟ ماں؟ بیٹی؟........ دورنگے کی نظر میں سؤر کے گوشت سے لے کر چیل کے انڈے تک سب حلال تھا۔ اور ایک روز جب نام بخش چپڑاسی کے سامنے زندگی، موت اور روزی کا مسئلہ درپیش تھا تو اس نے آنکھیں بند کر کے اپنی نو برس کی محمودہ کو انجینئر صاحب کے کمرے میں دھکیل دیا۔ محمودہ دیر تک انجینئر کے منہ پہ کالے اور سفید داغوں پہ انگلی پھیر کے ہنستی رہی اور پھر تالیاں بجا بجا کر کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگنے لگی۔ "آہا جی، تم ننگے ہو گئے میں ابا کو بتاؤں گی۔ آہا جی تم ننگے ہو گئے......"

دورنگے کے محکمے میں روپوں کی بھری ہوئی تھیلی اور چھوکری کے بھرے ہوئے جسم کے درمیان ترقی کے دروازوں کا کھل جا سم سم پوشیدہ تھا۔ ترقی کے دروازے ہی نہیں، رُوح اور جسم کا رشتہ قائم رکھنے والے دو نوالوں کا دارومدار بھی ایک چھوکری کے کالے پیلے یا بھورے جسم پر قائم تھا۔ اگر کسی روز اس کی جیب یا گود خالی رہ جاتی تھی تو آسمان سے آنے والی روزی کا ایک سُورج بند ہو جاتا تھا۔ ایک روز جب دورنگے....... بدبو سے مہکے ہوئے دورنگے...... کی نوکِ قلم نے قاضی عبدالقدوس، روڈ محرّر کے رزق پر بندش کی مہر لگا دی، تو بیچارے قاضی کو اپنی نمازیں اور اپنے روزے بے کار نظر آنے لگے۔ ان کی اُمیدوں کا آسرا خدائی مسند کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی دال روٹی فرشتوں کے دوش پر آسمان سے اُترتی ہے......اور اب جو انھوں نے دیکھا کہ ایک بدصورت، گھناؤنا

دوزنگا انسان کے آب و دانے پر مطلق طور پر قادر ہے ...... تو انھوں نے مُنہ پھاڑ کر اپنے خدا کو ایک فحش گالی دی۔

ایک روز دوزنگا باغیچے میں بیٹھا ہُوا اُونگھ رہا تھا، یکایک کوٹھی کے صحن سے پہلے گالیاں اور پھر چیخیں سنائی دیں۔ وہ بھاگ کر اندر گیا۔ اس کا خانساماں جہاں خاں کچن کے پاس پڑا چیخ رہا تھا۔ اس کی چھاتی پر کوٹھی کا مہتر چیتے کی طرح سوار بیٹھا تھا۔ اس کے اکڑے ہُوئے پنجے جہاں خاں کی گردن کو نوچ رہے تھے .....
سالا حرامی۔ ہماری مہریا کو تاکتا ہے؟ خون پی لیں گے سالے حرامی کا ......"
صحن کے کونے میں ایک کالی کلوٹی، بھینگی سی عورت سہمی ہُوئی کھڑی تھی۔ دوزنگا ہنسنے لگا، کہ یہ اُلّو کا پٹھہ مہتر آخر کس نعمت کے لیے یوں اکڑ رہا ہے۔ چڑیل ایسی صورت ہے حرامزادی کی۔ اس نے بڑھ کر مہتر کی پیٹھ پر کس کے ایک لات جمائی۔
—— شاید ایسے ہی کچھ شدید جھٹکے ہوتے تھے، جو کبھی کبھی دورنگے کی چھاتی میں سوئے ہُوئے ضمیر کو بیدار کر دیتے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے اسے اپنی باربرا یاد آئی۔ وہ شاید اس وقت کمار بہادر کے ڈریسنگ روم میں نیم برہنہ اپنا میک اَپ کر رہی ہوگی۔ کمار لچکیلے دیوان پر لیٹا ہُوا اُسے ہر پہلو اور ہر زاویے سے جھانک رہا ہوگا خیال ہی خیال میں ضمیر غصّے سے بیتاب ہو کر کمار کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ اس نے اپنی تیز ناخنوں والی انگلیاں کمار کی پھُولی ہُوئی گردن میں گاڑ دیں۔ وہ زبان نکال کر جھکا کہ کمار کا گرم گرم خون چاٹ جائے ...... اور عین اس وقت کسی نے اس کی پیٹھ پر زور سے لات جما دی۔ یہ دوزنگا تھا۔ دوزنگا زور زور سے ہنسنے لگا ......
ڈیم نان سنس! اس نے جہاں خاں کے سینے پر چڑھے ہُوئے مہتر پر دو چار لاتیں اور کس کس کے ماردیں۔ شکل تو دیکھو چڑیل کی جس کے لیے اکڑ رہا ہے سالا، اگر مہتر میں کچھ ہمت ہوتی، تو وہ ضرور جواب دیتا، کہ یہ سالا تو چڑیل کے لیے اکڑ رہا ہے لیکن

تم اپنی پھُول جیسی باربرا کے لیے کیوں نہیں اکڑ جاتے ؟

آخر ایک دن دوزنگا سچ مچ اکڑ گیا .... باربرا کے لیے نہیں اپنی ملازمت کے لیے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ چند روز سے ایک گنٹھیا کا مارا ہُوا ساٹھ سالہ پارسی بڈھا اس کے دفتر میں دخل در معقولات دینے لگا ہے۔ یہ مسٹر باٹلی والا بمبئی کی کسی سیمنٹ کمپنی کا ہیڈ اکاؤنٹنٹ رہا تھا۔ اب وہ کمار کی درخواست پر ریاست سُورج نگر میں سیمنٹ کے کارخانے قائم کرنے آیا تھا۔ ریاست میں لائم سٹون کی کوئی پہاڑی تو نہ تھی، لیکن مسٹر باٹلی والا کے ساتھ اس کی جوان بیٹی ضرور تھی۔ مس باٹلی والا کے سینے پر برفیلی چوٹیوں والے اُونچے اونچے کہسار تھے۔ ان مرمریں چٹانوں سے اوّل درجے کا سیمنٹ کرید نا کوئی پیچیدہ عمل نہ تھا۔ دوزنگا ریاست کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لیے اپنے ساتھ ایک خوشنما ریشم کا کیڑا لیتا آیا تھا۔ مسٹر باٹلی والا نئے کارخانوں کے لیے سیمنٹ کی پہاڑیاں اٹھا لایا تھا۔ رفتہ رفتہ شہتوت کی ٹہنیوں کے سامنے مرمر کی چٹانیں سر اٹھا کے جم گئیں، اور ایک روز مسٹر ضمیر الدّین جلالی خرابی صحت کی بنا پر استعفےٰ دے کر لنکا شائر کے سر ولیم میکفرسن کے کارخانوں کی تلاش میں بھٹکتے ہُوئے دہلی آ گئے۔

دہلی میں اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ باربرا کو بجلی، پانی، بھاپ کے ایک خُفیہ ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ وہ دیکھتے تھے کہ راس کماری سے لے کر ہمالیہ پربت تک ہزاروں غلاظت کے ڈھیر ہیں۔ اور ان ڈھیروں میں لاکھوں کیڑے رینگتے اور مرتے ہیں۔ وطنِ عزیز چھوڑنے کے بعد باربرا نے ایسے ہی کثافت کے گہواروں کی نجات کا بیڑا اٹھایا تھا۔ کیا فطرت کی مہربان طاقتیں بجلی، پانی، بھاپ کے اثر سے اس کا ہاتھ نہ بٹائیں گی ؟

جلترنگ

صبح سے اس کے دوبار نکسیر پھوٹ چکی تھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے نتھنوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے جھلس دیا گیا ہو۔ سانس کی ہوا بھڑکتی ہوئی لالٹین کے دھوئیں کی طرح کثیف اور گھٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ تنگ آ کر ناک کو رومال سے بند کر لیتا تھا۔ اور منہ کھول کر سانس لینے لگتا تھا۔ لیکن چند ہی لمحوں میں اس کا گلا خشک ہو کر سوکھے ہوئے پتّے کی طرح چرمرانے لگتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ زور زور سے رو دینا چاہتا تھا، لیکن رو نہ سکتا تھا۔ اب وہ سیانا ہو گیا تھا۔ اگلے سال میٹریکولیشن کے امتحان میں بیٹھنے والا تھا۔ محلّے کی لڑکیاں جن کے ساتھ وہ مٹی کے گھروندے بنا کر کھیلا کرتا تھا۔ اب اس کے سامنے جسم چرا کر سمٹ جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ جمّا نانبائی بھی اس کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا کر روزنامہ انقلاب زور زور سے پڑھ کر سنانے کو کہا کرتا تھا۔

جمّا پہلوان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھنے کا اعزاز محلّے میں بہت کم لوگوں کے

حصے میں آتا تھا۔ گلی کے نکڑ پہ اس کا تنور تھا، جس کے ماتھے پر "خوش لذیذ ہوٹل از طرف جمال دین پہلوان خادم قوم" کا سائن بورڈ لٹکا رہتا تھا۔ ہوٹل میں ایک باورچی تھا۔ اس کا نام تاج تھا، موقعہ و محل کے لحاظ سے جمّا پہلوان اسے خانساماں، بٹلر، بوائے، تاجو اور اُلّو کی دم فاختہ کے مناسب القاب سے بلایا کرتا تھا۔ خوش لذیذ ہوٹل کے عقب میں ایک بوسیدہ چھجا تھا۔ جس کے نیچے بہت سی ٹیڑھی ترچھی چارپائیاں بچھی رہتی تھیں۔ شہر میں آئے ہوئے مقدمہ باز دیہاتیوں میں یہ جگہ بہت دلعزیز تھی۔ کیونکہ جمّوں پہلوان صرف ۱۲ر آنے نقد کے عوض انھیں کھانے بھر کے لیے گوشت اور چپاتی، سونے کے لیے ایک چیں بجیں چارپائی اور مقدمہ کے لیے مشورہ مفت دیا کرتا تھا۔ ہاری ہوئی آسامی کے لیے پہلوان بڑی بدستی سے اپیل دائر کرنے کے ٹوٹکے، گرمیوں میں دہی کی لسی اور سردیوں میں چائے کے ساتھ پراٹھے تیار رکھتا تھا۔ جیتنے والوں کے لیے تاج دین خانساماں مُرغ ذبح کر لیتا تھا یا پلاؤ اور قورمے کے ساتھ شامی کباب بنا لیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے موقعوں پر خوش لذیذ ہوٹل کے نرخ ذرا بے لذّت حد تک اُونچے چڑھ جاتے تھے، لیکن اگر ڈوبتی ہوئی اُمیدوں کو تنکے کا سہارا مل رہا ہو، اور بلّیوں۔ اُچھلتے ہوئے دل کے سامنے عین موقعہ پر بھنا ہوا مُرغ اور کرارے کرارے شامی کباب رکھ دیے جائیں، تو وکیلوں، مختاروں، پیش کاروں اور کلرکوں کی زد سے بچے ہوئے چند حقیر ٹکے یاروں کے یار جمّوں پہلوان کے ہوٹل میں خرچ کرنے میں بھلا کس کو اعتراض ہو سکتا تھا؟

ہوٹل کے سامنے سڑک پر ایک مضبوط سی چارپائی پڑی رہتی تھی۔ اس پر جمّوں پہلوان تکیہ لگائے میر مجلس کی حیثیت سے بیٹھتا تھا۔ گاہکوں، ملاقاتیوں اور مسافروں کے لیے آس پاس لکڑی کے بنچ اور لوہے کی کرسیاں پڑی رہتی تھیں بیٹھے بٹھائے دل میں کئی بار پہلوان کو شک ہوتا تھا کہ شاید گوشت ٹھیک طرح بھونا نہیں گیا، شاید کبابوں میں

مرچ زیادہ ہو، شاید قیمے میں نمک کم ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لیے وہ ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد اپنے خانساماں، بٹلر، یا بوائے کو آواز دے کر گوشت کا بھرا ہوا پیالہ یا کبابوں کی پلیٹ منگوا کر چکھ لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تاج دین صدائے احتجاج بلند کرتا تھا کہ "پہلوان جی ایک ہی دفعہ اطمینان سے کیوں نہیں کھا لیتے؟ اب ہوٹل کی بکری کے لیے خاک چیز بچے گی؟"

"ابے چل کہیں کا، اُلّو کی دم فاختہ نہ ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" پہلوان اپنے چوڑے سینے پہ ہاتھ مارتا تھا۔ "جان ہے تو جہان ہے پیارے، تیرے باپ کی کمائی کھاتا ہوں سالے؟ آیا بڑا ہوٹل کا مالک!"

مالک تو جو ہو سو ہو، لیکن خوش لذیذ ہوٹل کو لذیذ رکھنا تاج دین کا فرض تھا چنانچہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے وہ بھی عمومًا دروازے کی اوٹ میں چھُپ کر سالن اور کبابوں کا نمک چکھ لیا کرتا تھا۔ خادم قوم اور خادمِ ہوٹل اور نوکر کی فرض شناسی کا سارا نزلہ بیچارے مسافروں پر گرتا تھا۔ لیکن جمّوں پہلوان کا مربیانہ برتاؤ اور حکیمانہ چرب زبانی کبھی کسی کو یہ محسوس کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی کہ سالن میں بوٹیوں کی جگہ پیاز کی بڑی بڑی گنٹھیاں تیر رہی ہیں اور کبابوں میں قیمے سے زیادہ بیسن کی ملاوٹ ہے!

شام کے وقت جب خالد سکول کے کھیلوں سے لوٹتا تو جمّوں پہلوان اُسے آواز دے کر اپنی چارپائی پر بٹھا لیتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "آؤ بیٹا خالد بابو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے او تاج دین ایک پلیٹ میں مصالحہ دار بھُنی ہوئی بوٹیاں تو لاؤ ذرا۔ دیکھتے نہیں بیٹا خالد بابو آیا ہوا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور جب پہلوان اور خالد دونوں مل کر بوٹیوں کا چٹخارہ ختم کر لیتے تھے تو روزنامہ انقلاب کا دور شروع ہوتا تھا۔ خالد فر فر اخبار سناتا، اور جمّوں پہلوان لیٹے ہی لیٹے خبروں پر تبصرہ جاری رکھتا۔ وہ شہیدانِ طرابلس کے نام پر چندہ اکٹھا کرنے کے لیے رضاکاروں کی ایک ٹولی کے ساتھ بمبئی، کلکتہ اور حیدرآباد کی طرف

گھوم آیا تھا۔ اس لیے وہ بین الاقوامی معاملات پر رائے زنی کرنا اپنا علمی حق سمجھتا تھا۔ آگرہ کے پچھم میں چین کا بادشاہ بمبئی کے پاس ہانگ کانگ کا ملک، انگریزی ولایت کے عقب میں طرابلس کا میدان جنگ۔ جمّوں پہلوان کے تبصرے میں تین چار چیزیں خاص طور پر نمایاں ہوتی تھیں۔ خالد کو کبھی کبھی اس بے تکی لاف زنی پر ہنسی آتی تھی۔ لیکن وہ پہلوان کو ٹوکنا خلافِ مصلحت سمجھتا تھا۔ ایسا کرنے سے نہ صرف جمّوں پہلوان کی چارپائی پر بیٹھ کر مصالحہ دار بوٹیاں اڑانے کا مزا کرکرا ہو جانے کا ڈر تھا۔ بلکہ پہلوان کی نظر میں اس کا علمی درجہ گر جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ چنانچہ خالد مناسب طور سے پہلوان کی باتوں میں لُقمہ ہی دیا کرتا تھا۔ پہلوان خوش ہو کر اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتا۔ . . . . .
"شاباش، بیٹا خالد بابو۔ خوب علم کما رہے ہو، جلدی جلدی کالج کر لو، بیٹا! ڈپٹی کمشنر بن کے رہو گے۔ . . . . . . ہاں، جمّوں پہلوان کی بات پتھر پر لکیر ہے۔ . . . . ہاں!"
ڈپٹی کمشنر کا نام سن کر مقدمہ باز مسافروں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ دم بھر کے لیے حقّے کی نے چھوڑ کر خالد کو ایک عجیب سی عقیدت مندی کے ساتھ دیکھنے لگتے تھے۔ اس وقت ان کے دل میں خفیہ سے ارمان اُٹھتے تھے، کہ وہ کسی روز اپنے بیٹوں کو شہر لا کر خالد سے ملا دیں۔ قسمت تو سب کی اپنے اپنے ساتھ ہے۔ لیکن کون جانتا ہے کہ یہ مُلاقات کسی وقت ان کے بیٹوں یا پوتوں کی مقدمہ بازی میں کام آ جائے! "پتا پر پُوت، گھوڑے پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا۔" جمّوں پہلوان کہا کرتا تھا۔ کیوں نہ ہو اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ شاباش میرے شیر! جلدی جلدی کالج کر لو بیٹا خالد بابو . . . . "

جمّوں پہلوان کے منہ سے اپنے باپ کا ذکر سُن کر خالد کو یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی آگرے کے پچھم میں چین کے بادشاہ کی طرح کوئی فرضی ہستی ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تک نہ تھا۔ وہ ابھی ڈیڑھ برس کا تھا۔ جب اس کے

والدین ریل کے حادثے میں کٹ کر مر گئے تھے۔ خالد کو اس کے ماموں نے اپنے زیرِ سایہ لے لیا تھا۔ ماموں تو تجارت کے لیے زیادہ عرصہ باہر رہتے تھے۔ لیکن ممانی نے خاصی توجہ سے اس کو پالا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ بھی کرتی تھی۔ البتہ جہاں معاملہ خالد اور عزیزہ کے درمیان ہو، وہاں ممانی کا انصاف کُھلم کُھلا عزیزہ کا ساتھ دیتا تھا۔ عزیزہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ عمر میں خالد سے تین برس بڑی تھی۔ لیکن خالد مجبوراً اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر بازار لے جایا کرتا تھا۔ عزیزہ غصّے میں آ کر اس کا منہ نوچ لیتی تھی، قلم توڑ دیتی تھی، کتاب پھاڑ دیتی تھی۔ . . . . اور اگر ممانی سے پِٹتا، تو غریب خالد۔ . . . . . .

ایک روز وہ دونوں رضائی میں لیٹے ہُوئے بیس تک گنتی یاد کر رہے تھے۔ کسی بات پر اُلجھ گئے۔ عزیزہ نے کھٹ سے اسے گردن پر کاٹ کھایا۔ خالد کی قمیض خون سے لتھڑ گئی، اور وہ شاید پہلا موقعہ تھا، جب ممانی نے خالد کے لیے عزیزہ کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا۔ خالد کی گردن پر بائیں طرف دانتوں کا ایک گہرا سا نشان اب تک نئے چاند کی طرح نمایاں تھا۔

شاید بچپن کے دبے ہُوئے نقوش تھے، جن کی وجہ سے خالد کے دل میں اب تک عزیزہ کے لیے ایک مبہم سی بے اعتنائی ڈر اور شاید نفرت کا مِلا جُلا جذبہ باقی تھا۔ وہ عزیزہ کے ساتھ نہایت عمیق سرد مہری کا برتاؤ کرتا تھا۔ لیکن عزیزہ ایسی نہ تھی وہ خالد کے آرام کا ہر ممکن خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ ہر طرح سے اس کے ساتھ خوبصورت باتیں کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن خالد رکھائی سے ٹال دیتا تھا۔ عزیزہ اس کے کپڑوں پر استری کر دیتی تھی، کمرے کی چیزیں قرینے سے سجا دیتی تھی۔ اگر اس کے سر میں درد ہوتا تھا تو سر دبا دیتی تھی۔ اگر فٹ بال کھیلتے ہُوئے اس کے پاؤں میں موچ آ جاتی تھی، تو اس کی رضائی میں بیٹھ کر گھنٹوں پاؤں دباتی رہتی تھی۔

ایک دن ممانی پڑوس کی شادی میں گئی ہُوئی تھی۔ خالد انفلوئنزا کے شدید بخار میں مبتلا پڑا تھا۔ اس کے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ عزیزہ نے اس کا سر دبایا، بازو دبائے، کمر دبائی، گھٹنے دبائے، لیکن خالد کراہتا رہا۔ عزیزہ بولی۔

"میں ایک ترکیب کرتی ہُوں خالد، تم سیدھے لیٹ جاؤ، میں تمھارے سارے جسم پر ایک ساتھ دباؤ ڈالتی ہُوں"۔

عزیزہ نے اپنے بھرپور جسم کے سارے گداز کو خالد پر مسل ڈالا، لیکن اس کے درد میں کمی نہ ہُوئی۔ عزیزہ لاکھ کہتی رہی کہ ذرا ٹھہرو، ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ لیکن وہ جھنجلا کر اٹھا، اور کمبل اوڑھ کر دوسرے پلنگ پر جا لیٹا۔ . . . . . .

اگلے سال وہ میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ سکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئی تھیں۔ وہ صبح سویرے کتابیں لے کر کمپنی باغ چلا جاتا تھا۔ اور دوپہر تک آم کے پیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر پڑھتا رہتا تھا۔ اب کئی روز سے کمپنی باغ نہ جا سکا تھا۔ کیونکہ دوپہر کے وقت اُسے نکسیر آجاتی تھی۔ ممانی کا خیال تھا، کہ گرمی کا غبار ہے، تھوڑا بہت نکل جائے تو اچھا ہے۔ تاہم احتیاط کے لیے اس نے خالد کو گاجر کی کلونجی بنا دیتی تھی، اور صبح شام تازہ مکھن میں کالی مرچ، اور کدو کے مغز ملا کر اُسے چٹا دیتی تھی۔ لیکن آج صبح سے اس کی دو بار نکسیر پھُوٹ چکی تھی۔ خالد کو یُوں محسوس ہوتا تھا، جیسے اس کے نتھنوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے جھلس دیا ہو۔ . . . .

اس نے بیزار ہو کر تولیہ کندھے پر ڈالا۔ اور غسل خانے کی طرف چل دیا۔ شاید ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں سر ڈبو کر اسے تسکین ہو۔ لیکن غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے غصّہ آیا۔ یہ بھی کوئی نہانے کا ٹائم ہے بھلا۔ وہ غصّے سے بڑبڑاتا ہُوا گھُوما، اور گھومتے ہی یونہی نادانستہ طور پر اس نے کھڑکی کی ایک درز سے اندر کی طرف جھانکا۔ . .
. . . . . جھانکتے ہی اس نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا، اور بجلی کی طرح تڑپ کر پیچھے ہٹ

گیا۔ پھر وہ لمحہ بھر کے لیے رُکا، ٹھٹکا، جھجکا اور چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک بار پھر جھانکا۔ گھُوما، پھرا، ہچکچایا۔ لیکن پھر جھانکا۔ اس بار اس کی آنکھیں درز کے ساتھ جم کے رہ گئیں، جیسے مقناطیس کے ساتھ لوہے کے ٹکڑے چمٹ جاتے ہیں!

یہ عزیزہ تھی۔ وہ جگمگاتے ہُوئے موتی کی طرح صدف سے باہر نکلی کھڑی تھی۔ یا شاید وہ بجلی کی ایک آوارہ لڑی تھی جو کالی گھٹاؤں کے دبیز پردوں سے باہر نکل آئی ہو۔ . . . . . اس نے اپنے گھنے بادل کی لٹوں کو کھولا، اور ہاتھی دانت کی چھوٹی سی کنگھی کو ان کے پیچ و خم میں الجھا کر دیر تک کھیلتی رہی۔ پھر اُس نے زلفوں کے انبار چھوڑ، بازو اٹھا کر دونوں ہاتھ جوڑے اور کمان کی طرح تن کر انگڑائی لی۔ خالد ڈرا، کہ شاید زلزلہ آجائے گا۔ . . . . اور سنگِ مرمر کے دو تاج محل گر کر ٹوٹ جائیں گے! آگرے میں محبت کا ایک مرمریں خواب سویا ہُوا ہے۔ آگرے کے پچھم میں چین کا بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ . . . . لیکن آگرے کے اس طرف بھی تاج محل ہیں۔ برفیلی چوٹیوں کی طرح دمکتے ہُوئے کوہستان۔ ہمالیہ کی چھاتی پہ بلتے ہُوئے بلوری مینار ے۔ . . . . . . عزیزہ نے دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر بالٹی میں ڈال دیئے۔ پھر اس نے سر اُٹھا کر گردن کو زور سے جھٹکا۔ برسات کی کالی گھٹائیں بکھر کر پھیل گئیں۔ بارش کی پھوار فضا میں جھلملانے لگی۔ ایک گستاخ قطرہ صبح کے ستارے کی طرح تاج محل کے کلس میں لٹک گیا۔ عزیزہ شرارت سے اس پر پھُونکیں مارنے لگی۔ وہ جھولتا رہا۔ جیسے سفید گلاب پر جڑے ہُوئے شبنم کے موتی کو نسیم صبح تھپیڑے مار رہی ہو۔ اور جب وہ مجبور ہو کر ایک مچلتے ہُوئے آنسو کی طرح گرنے لگا، تو عزیزہ نے جھک کر اسے ہونٹوں کے درمیان دبوچ لیا۔ وہ نہا رہی تھی۔ پانی کی لہریں پہاڑی چشموں کی طرح اپنا جلترنگ بجانے لگیں۔ تاج محلوں کے دامن میں جمنا کے سیمابی دھارے بہنے لگے۔ . . . . . کوہساروں پہ کہکشاں کا غبار سا چھا گیا۔ میدانوں پر قوسِ قزح کے فوّارے سے چھوٹنے لگے۔ یہ مچلتا ہُوا سیلاب کہاں جا رہا ہے؟ اس بے پناہ

طوفان کو کس سمندر کی گود سنبھالے گی؟ ...... خالد کی باہیں سانپ کی طرح بل کھا کر کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ لپٹ گئیں۔ پتھر کی دیوار میں ریشم جیسا لوچ آ گیا۔ وہ دم بدم دیوار کے سینے میں سمایا جا رہا تھا۔ شاید اگلے لمحے وہ چھپاک سے اندر جا گرے گا.... گرتے گرتے اُس کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی آنکھیں دم بھر کے لیے بند ہو گئیں۔ اسے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ برفانی چوٹیوں کے ساتھ لپٹا ہُوا لٹو کی طرح گھوم رہا ہے.... وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا دے کر آنکھیں کھول دیں، اور جلدی سے تولیہ اُٹھا کر اپنی خشک ناک پر رگڑنے لگا۔ اسے شک ہُوا کہ شاید نکسیر پھر بہہ رہی ہے!!

لے دے

لینے دینے کے بیوپار میں یا تو بنیے کو مہارت ہے یا مُلّا اور پنڈت کو۔ دونوں کے خون میں اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے کی رمق ہے، اگرچہ ان کا لینے والا ہاتھ ان کے دینے والے ہاتھ سے عموماً درازی مائل ہوتا ہے۔ لیکن یہ جو ایک معلق قسم کی لے دے انسانی سرشت میں گویا ازل سے موجزن ہے، اُسے نہ لینے سے سروکار ہے نہ دینے سے، البتہ تُو تُو مَیں مَیں والی گردان میں جتنی با محاورہ شگفتیاں نکل سکتی ہیں، وہ بے شک اسی ایک جذبے کی محتاج ہیں۔

غالباً ہماری پہلی لے دے کا آغاز اس وقت ہُوا جب اماں حوّا اور بابا آدمؑ بیک بینی و دوگوش جنت کے باغیچوں سے گول کیے گئے۔ میاں ابلیس کے ہونٹوں پر ضرور مسکراہٹ پھیل گئی ہوگی۔ جب اس کے ٹھکرائے ہُوئے خاکی مسجود کی زبان پہلی بار لذتِ ممنوعہ سے آشنا ہُوئی۔ اس کے بعد، گرجا گھر کی زبان میں، جب آسمانی رحمتوں کے دروازے دوبارہ کھل گئے، اور بابا آدمؑ کے بیٹوں

اور اماں حوّا کی بیٹیوں نے جوق در جوق اس دُنیائے فانی کو نوازنا شروع کیا تو گویا طوفانِ نوحؑ کے نام "ضرورت ہے" کا پہلا اشتہار تیار ہونے لگا۔ اب تو اللہ دے اور بندہ لے۔ یا تخت یا تختہ۔ سر سے کفن باندھ کے .... وغیرہ وغیرہ قسم کی نازک خیالیاں عملی جامہ پانے لگیں۔ زن، زر، زمین کی آغوش میں جو روایتی لے دے کا چرچا ہے، اس نے ابال کھا کر ایک طرف تو ملک گیری کی ہوس کو بھڑکایا، اور دوسری طرف ذہنی بغاوت کے بیج بوتے۔ پہلی صورت میں سکندرِ اعظم اور ہٹلر کی جماعت کے بزرگ پیدا ہوئے۔ دوسری صورت میں خیر، آج کل کے افسانہ نویس ہی سہی۔ لیکن یہ طے ہے کہ روزمرہ کی عامیانہ زندگی میں لے دے کی نشو و نما میں جو ترقی ہوئی اس کے عملی پہلو کا سہرا بلا شرکتِ غیرے دکاندار کے سر ہے۔ خواہ وہ اناج کی منڈی میں ہو، یا کوٹھوں کے بازار میں .... اور اس کے علمی پہلو کی ترتیب میں بی بھٹیارن کا جو ہاتھ ہے، اُسے تسلیم نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ دروغ بر گردنِ راوی حکایت ہے کہ سرائے میں مسافروں کی بانٹ چھانٹ میں جب کبھی ہمسایہ بھٹیارنوں میں ذرا شدید قسم کا تبادلۂ خیالات ہونے لگتا تھا۔ تو انھوں نے تُو تُو میں میں کی فرسودہ ترکیبوں سے اُکتا کر ایک تازہ سلیقۂ دشنام یہ ایجاد کیا کہ میرا مسافر تیرے مسافر کو ....

طویلے کی بلا بندر کے سر! لیکن کھُلی ڈھلی گالی گلوچ کے مقابلہ میں یہ بلاواسطہ طرزِ بیان زیادہ مقبول ہُوا۔ چنانچہ اب بہ نفسِ نفیس لڑنے کی بجائے نواب صاحب بٹیر، اور شاعر حضرات شعر لڑانے لگے۔ خُدا جنت نصیب کرے، جن دِنوں مشاعروں کی دھوم دھام تھی، ادب کا معیار اپنے جوبن پر تھا۔ نو عروس کی طرح سج دھج کر محفل جمی ہُوئی ہے۔ متانت، سنجیدگی۔ وقار کا غلبہ ہے۔ لوگ ہمہ تن گوش دو زانو بیٹھتے ہیں۔ چہروں پر سکوت ہے۔ لیکن آنکھوں میں صبر شکن

بے تابیاں تڑپ رہی ہیں، کہ نکلو تو میدان میں، ہم بھی دیکھیں کتنے پانی میں ہو..... بارے شمع کو گردش ہُوئی ایک طلاطم سا اٹھا، اور کسی نے گرج کر مطلع داغا۔ اب کیا تھا، مصرع سے مصرع ٹکرانے لگا۔ ردیف سے ردیف اُلجھی، قافیے سے قافیہ بھڑا۔ مضمون لڑنے لگا۔ اور پلک جھپکنے میں گویا پانی پت کا تاریخی میدان سمٹ کر اس ننھی سی مجلس میں اُمڈ آیا۔ نظروں کے تیر تان تان چھوڑے گئے۔ پلکوں کی شمشیر نے برق کی طرح کُوند کر دادِ شجاعت دی۔ کالی زلفیں، زہرناک ناگنیں بن کر لہرائیں۔ گھنگھریالے بال زنجیریں بن کر پھیلے۔ کچھ بچارے قید ہُوئے۔ کوئی بسمل ہُوا۔ کسی نے آہ کی۔ کوئی واہ واہ کا نعرہ لگا کر تڑپنے لگا۔ اور جب مؤذّن نے اللہ اکبر کی بانگ دی، تو شمع گل ہُوئی۔ سب نے اُٹھ کر دامن جھاڑے اور خراماں خراماں حاصلِ مشاعرہ گنگناتے ہُوئے اپنی راہ لگے۔

لیکن ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں۔ رفتہ رفتہ ہَوا کا رُخ بدلنے لگا۔ بزرگوں کو شکایت ہے کہ جُوں جُوں شاعری کا جوہر کمیاب ہوتا گیا، شاعروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ مشاعروں کی جگہ قوالوں کا رنگ جما۔ میرزا سوداؔ کے غنچہ اور قلمدان کی جگہ رسالوں نے سنبھالی، اور غالبؔ و ذوقؔ کی تیکھی تیکھی نوک جھونک نے تنقیدی مقالوں کا بہروپ لیا۔ تنقید کو ذرا ثقیل قسم کی لے دے ہی سمجھیے۔ لیکن جب وہ پھٹے ہُوئے لفافوں یا کھُلی چِٹھیوں کی صورت میں تقسیم ہونے لگے، تو یُوں نظر آتا ہے، جیسے وہ صیغۂ تذکیر و تانیث کی رو سے لے دے کا اسم مخنّث ہو!

مثلاً دو شاعر دست و گریباں ہو گئے۔

ایک نے ہانک لگائی "ہونہہ، ذرا اپنا الف مقصورہ تو دیکھو! کمر ہے کہ ٹیڑھی، سینہ پچکا ہُوا۔ جیسے دمے کا مریض کھانس رہا ہو"

دوسرے صاحب بھنبھنائے "اخاہ مینڈکی کو بھی زکام ہُوا؟ ذرا اپنی حائے حُطّی کا پیٹ تو سنبھالو، جیسے اپھارے کا مارا ہُوا بنیا ڈکاریں لے رہا ہو"

تیسرے صاحب نے اس معرکہ آرائی کو دیکھا تو ان کی رگِ تنقید بھی پھڑکی۔ اور وہ اللہ کا نام لے کر دھم سے دونوں کے درمیان کود پڑے " اجی صاحب! کہاں کا الف مقصورہ اور کہاں کی حائے حُطّی۔ ذرا اس خاکسار کا 'ق' تو ملاحظہ فرمائیے۔ واللہ کس بلا کا سڈول ہے۔ اور نقطوں کی گولائی۔ خدا کی قسم قشقے ہیں قشقے......"

اس بحثا بحثی میں ادب جی کا اپریشن ہوتے ہوتے وہ تو بچارے لد گئے۔ لیکن اب تینوں طرف سے ہونے لگا کہ میرا شعر تیرے شعر کو........ میری نظم تیری نظم کو........

بات میں سے بات نکلتی ہے۔ لیکن فی زمانہ اس ادبی دھینگا مشتی کا سب سے بڑا اکھاڑہ وہ ادب ہے، جسے سہواً یا اتفاقاً ترقی پسند کہا جاتا ہے۔ تخیّل اور بیان کی اس نئی روش نے زندگی کے تاریک اور گمنام پہلوؤں کو اجاگر کیا، اور مستقبل کے لیے نئی نئی شاہراہوں کا نشان دکھایا۔ اس رہنمائی میں ماضی کے جمود اور حال کے اضطراب میں ایک بے پناہ ٹکر لازم تھی۔ چنانچہ نئے ادب کے دوش بدوش نئے ادیب پر بھی بے اختیار کیچڑ اُچھلا........ اجی صاحب روسی پراپیگنڈا ہے، روسی! لٹریچر نہ ہُوا ہسپتال ہُوا، کہ جدھر دیکھو کھانسی، بخار، دمہ، سل، دردِ گردہ! عشق ہے تو نرسوں کے ساتھ، راز و نیاز ہوتا ہے تو اپریشن کے وارڈ میں۔ واللہ دہلی کے دواخانے بھی شرما جائیں! گویا دُنیا بھر میں مزدور کی ٹوکری، سڑک کوٹنے والا انجن، اور اُونچی اُونچی چمنیوں کے سوا کچھ رہا ہی نہیں۔ چھوکری ہے تو اس کے سینے پر کچھ ناشپاتیاں پک رہی ہیں عورت ہے تو پامال۔ بہن ہے تو کسی بھوکے ننگے آرٹسٹ کے ساتھ بھاگنے پر تُلی ہُوئی۔ جوان بیٹی باغ کے مالی کو دیکھ کر فِٹ کھا جاتی ہے۔ گیارہ بچّوں کی ماں بارہویں ننھّے کی فکر میں ہے۔ اور پھر ہسٹریا کا دورہ۔ بیویوں کو ہسٹریا، بھابیوں کو ہسٹریا..... شاید بچارا ادیب بھی اسی دورے میں مبتلا ہے! اس کی بات بات میں جنسی بھوک کے انگارے

تڑپتے ہیں۔ اگر وہ آرٹسٹ ہے، تو اس کا ماڈل ننگا ہوتا ہے۔ اگر وہ شاعر ہے تو اس کا عریاں تخیّل جسمانی آزادی کے ساتھ ساتھ قافیہ ردیف کی قید سے بھی آزادی چاہتا ہے۔ اگر وہ افسانے لکھتا ہے، تو اس کے جوان چھوکرے گرسنہ بھیڑیوں کی طرح منہ پھاڑے جوان لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور جنسی بندشوں سے گھبرائی ہُوئی عورتیں فِٹ پر فِٹ کھاتی ہیں....... پیاسے ہونٹ، ڈھیلی شلواریں، پوشیدہ امراض، روسی پراپیگنڈا ہے، روسی!

جواب مِلتا ہے کہ حضرت آپ نے وہ شلوار کیوں پہنی جو آسانی سے ڈھلک جاتے۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ تہذیب کی کینچلی بدل گئی۔ اخلاق کا معیار از سرِ نو تعمیر ہُوا۔ باغیچوں کی جگہ کارخانے بن گئے۔ کوئل کی جگہ ریڈیو نغمہ سرائی کرنے لگے۔ تخیّل کی جگہ ہوائی جہاز پرواز کرنے لگے۔ بالاخانوں کی جگہ کلب گھر نے سنبھال لی۔ حرم سرا کا رتبہ ہوٹلوں نے ہتھیا لیا۔ اور آپ ہیں کہ "بلبل کی انکھڑیوں میں رگِ گل کی پھانس" تلاش فرما رہے ہیں! قبلہ، دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر؟ برتھ کنٹرول کا زمانہ، عورت کو یُوں باادب باملاحظہ ہاتھ لگانا جیسے نماز کی تسبیح ہو!........ اور پھر اس جنسی بھوک کی لت کس کو نہیں؟ آپ کی ادبی کائنات میں عورت کی ذات کے سوا اور رہتی کیا ہے؟ آپ کے چمن میں پھُول اس لیے کھلتے ہیں کہ وہ کسی معشوق رعنا کی سیج پر بچھائے جائیں۔ بلبل کی نغمہ سرائی میں آپ کی چہیتی مغنیہ کا سرود چھلکتا ہے۔ اور پھر یہ وصل اور فراق کا جھگڑا کیا ہے؟ محبوب کے کوچہ میں یہ ہائے وائے کیسی؟ آپ وہاں سر کے بل جاتے ہیں۔ آنکھوں کا فرش بچھاتے ہیں۔ دیوار سے سر پھوڑتے ہیں۔ دربان کی خوشامد ہوتی ہے۔ وصل کا شربت چھنتا ہے۔ اور آپ خالی بوتلیں اُٹھائے مارے مارے پھرتے ہیں........ اگر سچ مچ آپ کے دِل اور دماغ پر اس عورت کو پالینے کا بھُوت سوار نہیں ہے۔ جو بالاخانے کی کھڑکی میں بن ٹھن کر بیٹھتی ہے، یا جو حرم

سرا کی چار دیواری میں ازل سے قید ہے، تو آپ کے طلسمی رنگ محل بے معنی نظر آتے ہیں۔ اور ادب کے میدان میں (بقول آپ کے) آپ کی شہسواری بے کار سی تفریح معلوم ہوتی ہے۔ عورت! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ آپ کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ آپ کی غزلوں میں اس کا قصیدہ ہے، آپ کی نظموں پر وہ سوار ہے، وہ آپ کے تخیّل میں تیرتی ہے۔ اور جب معاشرت کے اصولوں سے مجبور ہو کر وہ کُھلم کُھلا آپ کی توجہ ساقی، گلفام کی طرف مائل ہونے لگتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوخیز ساقی، جس کی مسیں مشکل سے بھیگی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس کے چہرے پر سبزے کا ہلکا سا آغاز ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قبلہ، کیا لینا کیا دینا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ادب ترقی پسند ہو یا غیر ترقی پسند رومان کا گہوارہ ہوتا ہے۔ آپ اپنے رومان کو زندگی سے نوچ کر ایک دماغی خلا میں لے جاتے ہیں۔ نئے ادیب کا رومان گلیوں کے نکڑ پر ہوتا ہے، مزدوروں کی بارکوں میں، پہاڑی چشموں کے پاس، میونسپل کمیٹی کے نل پر، ریل کے ڈبے میں، گھر کی چار دیواری کے اندر ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ اس کے آگے اور پیچھے زندگی کی انتھک مشین چلتی رہتی ہے۔ بنائی ہوئی، بگاڑتی ہوئی، کچلتی ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے عاشق اور معشوق جنّوں اور پریوں کی بستی سے اُترتے ہیں یا محلوں کی سیج پر اُگتے ہیں یا خوابوں کی ٹھنڈی دُنیا میں بستے ہیں۔ اس کا عاشق دن بھر دفتر میں کام کرتا ہے یا کارخانے کی چمنیاں صاف کرتا ہے یا ہوٹل میں جا کر شراب پیتا ہے۔ اس کی محبوبہ ایک شریف زادی ہوتی ہے، کہ جس کے تخیّل کو دبی ہوئی خواہشوں نے آوارہ کر دیا ہو۔ یا ایک مایوس جوانی کہ جس کی قسمت ایک بہت بوڑھے یا بہت موٹے یا اَن جوڑ سے مرد کے ساتھ ٹانک دی ہو ـــــ یا پھر وہ ایک سستی سی، بجھتی ہوئی شمع ہوتی ہے۔ جسے خود آپ کے اصول ہر روز نئی محفل میں بھڑکنے کے لیے مجبور کرتے ہوں۔ آپ اپنے ہیرو اور ہیروئن کی شادی رچا کر انھیں حجلۂ عروسی میں دھکیل دیتے ہیں، اور واپس آ کر نو مہینے

کے بعد بچّے کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب حجلۂ عروسی کے پردے گرا کر واپس نہیں آجاتا۔ وہ خلوت خانوں کے چور دروازے تلاش کرتا ہے اور دبے پاؤں پسِ پردہ کے رموز ٹٹولتا ہے۔ بارہا اُس نے دیکھا کہ نودمیدہ غنچے بے دردی کے ساتھ کسی پھٹی پُرانی، بوسیدہ جھولی میں پھینک دیے گئے ہیں۔ ایک ہلدی اور نمک کا سوداگر کسی روشن دماغ حسّاس لڑکی کو گود میں لیے بازار کے بھاؤ سُنا رہا ہے۔ کوئی آرٹسٹ نوجوان ایک بچّے پیدا کرنے والی مشین کا بوجھ اُٹھانے پر مجبور ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ زندگی کی ستم ظریفیاں ہیں۔ آپ اُنھیں نظر انداز کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب ان کا پیچھا کرتا ہے۔

لیکن چھوڑیئے جناب، کہاں کی بات کہاں جا پڑی؟ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔

یہ مضمون ایک برٹش فوجی افسر کی ڈائری کے چند اقتباسات کا ترجمہ ہے۔ یہ افسر ۱۸۳۹ء میں کراچی آیا تھا اور ۱۸۵۱ء میں اس کی ڈائری لندن کے اشاعتی ادارے جیمس میڈن نے شائع کی تھی۔ مصنف نے اپنا نام صیغۂ راز میں رکھا تھا۔

کراچی

۳ رفروری ۱۸۳۹ء کی صبح کو جنگی جہاز "ویلزلی" اور باربرداری کے جہاز "حنا" نے قلعہ منوڑا کے مقابل لنگر ڈال دیے۔ ہمارے کمانڈر نے قلعہ کے حاکم کو للکارا کہ فوراً ہتھیار ڈال دو۔

"مَیں بلوچی بچہ ہُوں" قلعہ کے حاکم نے جواب دیا "ہم قلعہ خالی کرنے سے پہلے مرجانے کو ترجیح دیں گے۔"

چلو اچھا ہُوا۔ موت کے آرزومندوں کو موت ضرور ملنی چاہیے۔ یُوں بھی ان مغرور بلوچیوں کو تمیز اور تہذیب سکھانا ہمارا فرض ہے۔ یہی تو وہ فرض ہے جس کو ادا کرنے کے لیے ہم نے اپنا عزیز وطن چھوڑا۔ اور اب ان کالے پانیوں میں دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔

ہمارے فوجی دستے جہاز سے اُتر آئے اور منوڑا کی چٹان کی طرف بڑھے چٹان کے دامن میں کچھ دیر سستا کر ہم نے اپنی اپنی رائفلیں بھر لیں اور ان پر تیز دھار

خون کی پیاسی کرچوں کو چڑھالیا۔ منوڑا کی چٹان پر موت کا سایہ واضح طور پر منڈلا رہا تھا لیکن موت کے فرشتے کس کا انتظار کر رہے تھے؟ ہماری رجمنٹ کے دل کچھ بیٹھ سے گئے لیکن کمانڈر نے کڑک کر للکارا۔

"برطانیہ عظیم کے بہادر سپوتو۔ تاج اور ملک کے نام پر ——"

تاج اور ملک کے نام پر ہم نے بے دریغ حملہ کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے منوڑا کا قلعہ سر ہو گیا۔ قلعہ میں ایک ضعیف العمر سردار تھا۔ ایک جوان عورت تھی۔ اور ایک ننھا سا بچہ تھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ گورنر جنرل نے کلکتہ سے ایک پیغام میں ہماری بہادری کو سراہا اور ہمارے کمانڈر کی عالی ہمتی۔ ہوشمندی کی بہت تعریف کی۔

منوڑا کا قلعہ سر ہوتے ہی کراچی کا شہر بھی ہمارے قبضہ میں آگیا۔ دوپہر کے قریب ہم نے بندرگاہ پر اترنا شروع کیا۔ سمندر میں زبردست تلاطم تھا۔ لہروں کے زیروبم میں ہمارے کمانڈر کی محبوب بکری پانی میں گر گئی جو اس نے بمبئی میں خرید کر بڑے شوق سے پالی تھی۔ تین کالے سپاہی بکری کو بچانے کے لیے اسلحہ سمیت ایک ساتھ سمندر میں کود گئے۔ دو سپاہیوں نے بکری کو کندھوں پر اٹھا لیا۔ تیسرا سپاہی اپنے اسلحہ کے بوجھ سے بے دم ہو گیا اور آن کی آن ڈوب گیا۔ رام جی نائک فرض کا پابند انسان تھا۔ ڈوبتے وقت بھی اس نے اپنی رائفل کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا افسوس کہ یہ ہتھیار سمندر کی تہ میں کسی کے کام نہ آسکے گا۔ ہماری رجمنٹ میں پہلے ہی رائفلوں کی بہت کمی ہے۔

کراچی کی پورٹ کو بندرگاہ کہنا ستم ظریفی ہے۔ پھر بھی یہ مقام سارے ساحل پر بہترین جگہ ہے۔ اسے اچھی طرح ترقی دی جائے تو، کراچی کلکتہ کا مقابلہ کر سکتی ہے ہم اس بندرگاہ کو پختہ تعمیر کر دیں گے۔ تجارتی درآمد برآمد کے لیے یہ جگہ بہت موزوں ہے۔ یوں بھی وسطی ایشیا میں جنگی ذخیرے جمع کرنے کے لیے یہ مقام بے حد اہم ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کراچی کا قدیمی نام کروکالی ہے۔ جس کا ذکر یونانی دیومالا میں آتا

ہے۔ یہ تاریخی رشتہ کراچی کے لیے باعث فخر ہے۔ لیکن ایک چھوٹی سی دقت یہ ہے کہ کراچی کا شہر فقط ڈیڑھ سو سال پہلے آباد ہوا تھا۔

کراچی میں داخل ہوتے ہی انسان کے کان، ناک اور آنکھیں بڑی شدت سے متاثر ہوتی ہیں۔ سماعت کے لیے چاروں طرف ایک مرثیہ نما موسیقی پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں بازار والوں کی چیخ پکار، عورتوں کی گالی گلوچ۔ کتوں کی لمبی تانیں اور گدھوں کی مسلسل ڈھینچوں ڈھینچوں خاص طور پر نمایاں ہے جا بجا گلی سڑی مچھلیوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں ان کا تعفن قوت شامہ کو مدد دیتا ہے۔ شہر میں نالیوں کا رواج نہیں۔ گندے پانی کا نکاس عمل تبخیر سے انجام پاتا ہے۔ جو کوڑا کرکٹ گھروں کے اندر کام نہیں آتا وہ گھروں کے باہر رکھ دیا جاتا ہے۔ صفائی کا زیادہ تر کام کوؤں چیلوں اور کتوں کے سپرد ہے چھوٹی چھوٹی تاریک دکانوں سے ہلدی۔ کڑوے تیل کی تیز لپٹیں آتی رہتی ہیں۔ ان نوع بنوع خوشبوؤں کو سونگھ کر یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے تازہ تازہ لاشوں کو حنوط کیا جا رہا ہو۔

مکان مٹی کے بنے ہوئے ہیں کھڑکیاں ناپید ہیں۔ البتہ چھوٹے چھوٹے روشندانوں میں سوکھی ہوئی مچھلیاں گرد میں اٹی پڑی ہیں۔

مرد لمبے اور تن آور ہیں۔ عورتوں کے لباس شوخ اور رنگین ہیں۔ مسلمانوں کی پہچان ان کی لمبی لمبی گھنی اور گھنگھریالی داڑھیاں ہیں۔ ہندوؤں کا رنگ زردی مائل ہے۔ کالے کالے سرخ ہونٹوں والے حبشی نژاد سقے پانی کی مشکیں اٹھائے پھرتے ہیں۔ موٹے موٹے بنیے دبلے پتلے ٹٹوؤں پر اینٹھ کر بیٹھتے ہیں۔ مسلمانوں کے عہد سے انھیں گھوڑوں اور خچروں پر بیٹھنے کی اجازت نہیں۔

گھروں اور دکانوں کے سامنے بیٹھ کر بر سر عام ٹائلٹ کیا جاتا ہے۔ مسلمان کیکر یا نیم کی ٹہنیاں گلے میں مار مار کر منہ کی صفائی کرتے ہیں۔ ہندو سفید مٹی میں سرسوں

کا تیل ملا کر صابن کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ نہانے کے لیے دریائے لیاری ہے اس میں پانی نہیں ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی جمع کر کے اس میں مچھلیاں دھوتے ہیں غسل کرتے ہیں اور پھر یہی پانی مشکوں میں بھر کے پیا جاتا ہے۔

آج "مگر پیر" کا میلہ ہے۔ یہ جگہ کراچی سے کوئی نو میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ میلہ "حاجی مگر" کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ کسی وقت حاجی پیر اور اس کے تین بھائی یہاں آ کر رہے تھے۔ آتے ہی انھوں نے اس مقام پر کرامات کے انبار لگا دیے۔ ایک بھائی نے ایک انگلی سے گرم پانی کا چشمہ کھود ڈالا۔ اس پانی کا درجہ حرارت ۹۰ درجہ ہوتا ہے۔ دوسرے بھائی نے غالباً دوسری انگلی سے ایک اور چشمہ نکالا جس کا پانی ۱۲۰ درجہ گرم ہے۔ تیسرے بھائی نے چند پھولوں کو مگرمچھ میں تبدیل کر دیا۔ چوتھے بھائی نے اپنی مسواک کو زمین میں گاڑ کر کھجور کا درخت پیدا کر دیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب سب سے بڑا بھائی مر گیا تو اس کے مزار پر "حاجی مگر پیر" کا مقبرہ تعمیر ہو گیا۔ ایک چھوٹے سے تالاب میں اسّی یا نوے کے قریب مگرمچھ ہر وقت موجود رہتے ہیں اگرچہ یہ مگرمچھ پھولوں کی اولاد ہیں لیکن ان کے جسم بے حد غلیظ اور بدبودار ہیں۔ سب سے بڑے مگرمچھ کا نام مور صاحب ہے۔ درگاہ کا متولی ایک ننگ دھڑنگ لمبا سا فقیر ہے "آؤ آؤ" کا نعرہ لگا کر مگرمچھوں کو اکٹھا کرتا ہے اور عقیدت مند بکریاں اور دنبے ذبح کر کے چڑھاوا چڑھاتے رہتے ہیں کچھ گوشت اور چھیچھڑے مگرمچھ کھا لیتے ہیں اچھا اچھا مال فقیر لے جاتا ہے۔

"واہ واہ سبحان اللہ" مگرمچھوں کو گوشت کھاتا دیکھ کر عقیدت مند تحسین و آفرین کے نعرے لگاتے ہیں۔

"مبارک باد۔ مبارک باد" فقیر گوشت سنبھال کر جواب دیتا ہے "تمھاری نذر قبول ہوئی۔ اب دنیا اور آخرت میں تم سرخرو رہو گے۔"

میلے میں کراچی سے ناچنے والی لڑکیوں کا ایک گروہ بھی آیا ہوا ہے۔ ان کی آنکھیں کالی اور بال لمبے ہیں۔ عقیدت مندوں کے دل روحانیت میں رچے ہوئے ہیں لیکن ان کے جسم ان لڑکیوں کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ "مگر تالاب" کا کیچڑ تبرک کے طور پر فروخت بھی ہوتا ہے۔ جوان عورتیں ایک طرف بیٹھ کر اس کیچڑ کو برکت کے طور پر اپنے جسم پر ملتی ہیں۔ اس عمل میں زائرین کو چند خوبصورت اجسام کی زیارت بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

میلہ ختم ہونے سے پہلے شیدی ناچ ہوتا ہے۔ ایک دائرے میں سرخ سبز اور نیلے رنگ کے بہت سے جھنڈے گاڑ دیے جاتے ہیں۔ انگیٹھیوں میں عود اور لوبان سلگایا جاتا ہے۔ ڈھول بجتے ہیں اور بہت سے ملے جلے مرد اور عورتیں نیم بیضوی دائروں میں ناچنا شروع کرتے ہیں۔ حاضرین قُل قُل قُل کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں۔ ناچنے والے مرد جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔ عورتیں مست ہو کر اپنی کمر لچکاتی ہیں کولہے مٹکاتی ہیں اور والہانہ طور پر بانہیں پھیلا کر کبھی گرتی ہیں کبھی بیٹھتی ہیں اور کبھی گھٹنے ٹیک کر زمین کے ساتھ سر مارتی ہیں۔ ان کے چمکیلے اور آبنوسی بدن پر پسینے کے قطرے عجب بہار دیتے ہیں۔ ......

دن بھر کی گرمی۔ گرد اور غبار کے بعد کراچی کی رات بڑی سہانی ہوتی ہے۔ صاف شفاف آسمان پر تارے ٹمٹماتے ہیں۔ چاروں طرف صحرا کی پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ فضا میں سمندر کی ہلکی ہلکی سی نمی رچی ہوئی ہے۔ کراچی کے پیچھے صرف ڈیڑھ سو سال کا غریبانہ ورثہ ہے۔ لیکن اس کے سامنے مستقبل کی لامحدود صدیاں ہیں۔ شاید ایک وقت ایسا بھی آئے جب اس کی بندرگاہ پکی بن جائے اور تاج کے نام پر آنے

والے فوجیوں کی بکریاں سمندر میں نہ گرنے پائیں۔ شاید یہاں کی سڑکیں پکی بن جائیں اور ان پر کہیں کہیں سایہ دار درخت بھی لگا دیے جائیں۔ یہاں کے کوڑے کرکٹ کے متعفن انبار صاف ہو جائیں۔ اور پینے کا پانی لیاری ندی کے خشک کناروں پر غلیظ اور کثیف گڑھوں میں جمع نہ کیا جائے۔شاید..........

پٹیالہ پیگ

شام کی سیاہی پھیلتے ہی دور ساحل پر روشنی کے ننھے ننھے سے نشان اُبھرنے لگے۔ایس۔ایس۔سیٹرتھ مور جو اٹھارہ دنوں سے برابر ایک قوی ہیکل دیو کی طرح سمندر کا سینہ چیرتا آرہا تھا، اب منزل کو قریب پاکر آسودہ خرامی پر اُتر آیا۔ موجوں کے طوفانی تھپیڑے جو سمندر کی وسیع بیکرانی میں جہاز کو ایک تنکے کی طرح مارے مارے پھرتے تھے، رفتہ رفتہ مدھم پڑنے لگے۔ اور ان کی تندی، تیزی اور ابھار پر ایک ایسا بےجان سکون چھانے لگا جو منزل کو پاکر ہر آرزو پر چھا جاتا ہے۔

وہ روشنی جو سب سے نمایاں ہے، شاید مالا بار ہل پہ ہوگی۔نہیں، مالا بار ہل پر اتنی تیز روشنی کہاں سے آئی۔ یہ تو تاج محل ہوٹل ہے۔ ہاں، ممکن ہے۔لیکن شاید یہ میجسٹک ہو؟ نان سنس! یہ گورنمنٹ ہاؤس کا بلب ہے۔کیا عجب کہ یہ کانگرس بھون ہو؟ یا محمد علی جناح ہال ہو؟ یا کمیونسٹ پارٹی کا دفتر؟ اور وہ نورانی لکیر جو دائیں طرف کہکشاں کی طرح کھنچی چلی گئی ہے، ضرور میرین ڈرائیو پر قمقموں کی جگمگاہٹ ہے۔

رات کے اندھیرے میں وہ یُوں نظر آتی ہے، جیسے سلمیٰ کے کالے اور گھنے بالوں کی مانگ میں افشاں بھری ہُوتی ہو۔ جیسے پاربتی بائی طلے دار کالی ساڑھی پہنے چھما ستاروں کا ہجوم نورانی لہروں کی طرح جھلملا رہا ہو۔ جیسے ہلڈا بیدنگ کا سچوم پہنے بیچ پر لیٹی ہُوئی ہو، اور اپنے مرمریں شانوں اور سینے کو کمان کی مانند تان کر قوس قزح سی انگڑائی لے رہی ہو۔ . . . . . ڈیک پر مسافروں کا ہجوم گردنیں اُٹھا اٹھا کر، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر، ساحل کے اُبھرتے ہُوئے نشانوں کا عید کے چاند کی طرح انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دُور بینیں لگائے کھڑے تھے۔ کچھ دل کی آنکھیں وا کیے ہُوئے تھے۔ اور بڑھتی ہُوئی تاریکی میں روشنی کا ہر نشان اور ساحل کی جانب زندگی کا ہر آثار ان کے رگ وپے میں برقی جھٹکوں کی طرح اثر انداز ہوتا تھا۔ پورٹس ماؤتھ سے لنگر اٹھانے کے بعد اٹھارہ دن سے برابر یہ ساڑھے بارہ سو کالے، گورے، پیلے، بھورے مرد، عورتیں اور بچّے ایک خوشحال قبیلے کی طرح ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ ڈائننگ روم میں وہ اکٹھے کھانے پر بیٹھتے تھے۔ بار روم میں سیاسیات، فلسفہ، ادب، جنسیات پر دلچسپ مباحثے ہوتے تھے۔ کبھی سوئمنگ پول میں تیرنے کے مقابلے۔ کبھی ڈیک ٹینس کے میچ۔ فینسی ڈریس بال۔ بچّوں کی دوڑیں۔ برج فلیش۔ کانسرٹ۔ اور کبھی کبھی کیبنوں کے آس پاس یا ڈیکوں کے خاموش کونوں میں یا چمنیوں کی اوٹ میں دزدیدہ رومانوں کے مختصر لمحات۔ اتنے مختلف لوگوں کو اتنے دن ایک دوسرے سے اس قدر قریب رہنے کا موقع بہت کم نصیب ہُوا تھا۔ اور اس احساس میں بھی ایک عجیب یگانگت کا جذبہ تھا، کہ اگر وہ ڈوبیں گے تو بھی ایک ساتھ، اور منزل تک پہنچیں گے، تو بھی ایک ساتھ۔ اگرچہ ایس ایس سیٹرتھ مور میں ڈوبنے کا امکان پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن سفر میں دلچسپی اور **ADVENTURE** چاشنی بھرنے کے لیے، بہت سی عورتیں اور بہت سے مرد دل ہی دل میں اس خطرناک امکان کو زندہ رکھنے پر مصر تھے۔ اور

لائن پلیٹ کی پریکٹس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ منصوبے بھی گانٹھ رکھے تھے، کہ اگر کسی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر جہاز پاش پاش ہو جائے، تو وہ کس کس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ڈوبنا پسند کریں گے۔

جیسے جیسے بمبئی کی منزل قریب آتی گئی، سمندر کی بے پناہ لہروں کے طوفان دھیمے پڑتے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسافروں کی برادری میں بھی کہیں کہیں انانیت، کہیں انفرادیت، کہیں رنگ، کہیں نسل، کہیں مذہب کے امتیازات سر اُٹھانے لگے۔ جان میکفرسن جو طویل رخصت سے واپس آنے کے بعد صوبہ بہار میں بھاگلپور کی کمشنری کا چارج لینے والا تھا اب کچھ دنوں سے باقیوں سے الگ تھلگ رہنے لگا تھا۔ اور صرف اب اس نے بار میں سیاسی مباحثوں، سوئمنگ پول میں ڈکنگ اور فینسی بال میں پوسٹ مین بننے کے مشاغل ترک کر دیے تھے۔ اور کھلے کالر کا قمیص اور خاکی نکر چھوڑ کر اب باقاعدہ سوٹ پہننا شروع کر دیا تھا۔ مسز جیکسن نے کیبن بوائے کو پلیز اور بٹلر کو تھینک یو کہنا بند کر دیا۔ کیونکہ اب اس کی مملکت قریب آ رہی تھی جس میں اس کا خاوند پورے ضلع کا حاکمِ اعلیٰ تھا۔ اس ضلع کی آبادی ناروے کی آبادی کے برابر اور رقبہ ڈنمارک کے مُلک سے زیادہ تھا۔ یہ اعداد و شمار مسز جیکسن کے نوکِ زبان تھے اور وہ انھیں برمنگھم اور لنکا شائر کے کارخانوں میں کام کرنے والی چچیوں، خالاؤں اور بہنوں کو سُنا سُنا کر حیران و پریشان کر دیا کرتی تھی۔ کل شام سے سردار جسونت سنگھ بھی نہ بار آیا تھا، نہ فلیش میں اور نہ ہی اس نے ڈنر کے بعد ماہیا کے دردناک دوہے گا گا کر ہندوستانی میموں کو رلانے اور گوری میموں کو ہنسانے کی کوشش کی تھی۔ یگانگت اور انسانیت کا خول جو سمندر کی وسعتوں نے جہاز کے مسافروں پر چڑھا دیا تھا، اب ان وسعتوں کو عبور کرنے کے بعد برف کے تودے کی طرح پگھلتا جا رہا تھا اور جب سرِ شام دور ساحل پر روشنی کے

نشان اُبھرنے لگے، تو ہر مسافر کا دائرہ انسانیت محدود ہو کر اجنبیت اور مغائرت کے اسی نکتے پر آگیا، جس پر وہ پورٹس ماؤتھ سے روانہ ہوئے تھے۔ بیچ سمندر کے راز سمندر رہی میں ڈوب گئے اور ساحل کی آنکھ کبھی ان سے آشنا نہ ہو سکیں گی۔

ڈیک پر ایک نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ہر شخص کی خواہش تھی، کہ ساحل پر جو نئی روشنی جھلملائے اس پر سب سے پہلے اسی کی نظر پڑے۔ اور ہر روشنی کے ساتھ دلوں میں تصورات کی ایک نئی دُنیا آباد ہو جاتی تھی۔ کسی کو اس میں مالا بار ہل نظر آتا تھا۔ کسی کو تاج محل ہوٹل یا میجسٹک۔ یا گورنمنٹ ہاؤس۔ یا کانگرس بھون۔ یا محمد علی جناح ہال۔ یا کمیونسٹ پارٹی کا دفتر۔ یا نجمہ کی مانگ میں افشاں۔ یا دِل افروز بائی کے سینے پر جھلملاتے ہُوئے سلمے ستارے۔ یا ہلڈا کے جسم کے کہکشانی عکوس......

جان میکفرسن سوچ رہا تھا۔ کہ اگر بھاگلپور کی کمشنری کا ناظر اور ہیڈ اردلی اس کی پیشوائی کے لیے بمبئی نہ پہنچے ہُوئے، تو آئی۔ سی۔ ایس کی بائیس سالہ ملازمت میں یہ اس کے دل پر تیسرا چرکا ہوگا۔ پہلا چرکا اس کے دیرینہ خادم افضل کے ہاتھوں لگا تھا۔ افضل کوئی سولہ برس سے اس کا بیرا تھا۔ جس طرح جان میکفرسن کو آئی۔ سی۔ ایس کی ملازمت میں ایک بے تاج قسم کی بادشاہی کا چسکا پڑ گیا تھا۔ اسی طرح افضل کو بھی سفید آقاؤں کی خدمت کی چاٹ تھی۔ یہ شوق اسے سینہ بہ سینہ اپنے دادا سے وراثت میں ملا تھا۔ اور کمپنی بہادر کے زمانے سے اس خاندان کے کسی فرد نے انگریزوں کے سوا کسی ہندوستانی گھرانے میں خدمت گذاری کی ذلت برداشت نہیں کی تھی۔ اسی وجہ سے افضل کے ضمیر میں ایک ایسی دوغلی سرشت کی آمیزش تھی، جو اُسے بیروں اور خانساماؤں کی عام برادری سے کچھ درجہ ممتاز اور ہندوستانی عیسائیوں کے نچلے طبقہ کے ساتھ کسی حد تک ہمدوش کرتی تھی۔ چنانچہ وہ لباس میں قمیص، پتلون اور نیلے کمربند والی سفید اچکن کا نہایت شدت سے پابند تھا اور زبان میں چرچ مشنری سوسائٹی

کے پادریوں ایسی انگریزی نما اُردو استعمال کرتا تھا۔ یہ سلیقہ اس نے ابتدا میں محض فیشن کے طور پر اختیار کیا تھا۔ لیکن امتدادِ زمانہ نے اسے اس کی فطرت کا ایک جزو بنا دیا۔ یہاں تک جُوں جُوں اس کے آقا جان میکفرسن کی اُردو منجھتی اور سنورتی گئی، افضل کی زبان اپنے مرکز سے پھسل کر عجیب و غریب تراکیب، بندشوں، اور اسالیب کی دلدل میں پھنستی گئی۔ یوں تو جان میکفرسن ہر چوتھے پانچویں سال باقاعدگی سے طویل رخصت پر انگلستان جایا کرتا تھا۔ لیکن اس بار جب وہ روانہ ہونے لگا، تو بہت کچھ ہچکچاہٹ اور تشویش کے بعد افضل نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا "صاحب، اگر آپ گسہ نہیں کھاتا، تو ہم کچھ بولنا مانگتا۔"

"ہاں، افضل، تم بولنے سکتا۔ مگر یاد رکھو ہم بلایت سے تم کے واسطے اوورکوٹ نہیں لانا سکتا۔ ادھر یہ جنس باہوت کمتی اور باہوت مہنگا ملتا۔"

"اوورکوٹ کا بات نہیں، صاب۔"

"ہم سمجھتا ہے کہ جنگ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تک بلایت میں شاید سگرٹ لائٹر آسانی سے ملنے نہیں مانگتا۔ ورنہ ہم تمھارا یہ پورانا خواہش پُورا کرتا تھا۔"

"پروا نہیں صاب۔ ہم اپنا ڈیمانڈ نہیں بولنا مانگتا۔"

جان میکفرسن نے کن انکھیوں سے افضل کی طرف دیکھا۔ ہر بار ولایت جاتے وقت افضل اُسے اپنی فرمائشوں کی فہرست دیا کرتا تھا۔ جس میں مختلف النوع کی چیزیں شامل ہوتی تھیں۔ رسٹ واچ۔ سگرٹ کیس۔ اوورکوٹ۔ پرانے سوٹ۔ فونٹن پین۔ سیفٹی ریزر — اور ایک بار اس نے دبے لفظوں میں یہ خواہش بھی بیان کی تھی، کہ اگر ولایت میں تیس اور چالیس سال کی عمر والی کوئی میم صاحب خالی ہو، تو افضل برضا و رغبت اُسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ کیونکہ صاب، آپ جانتا ہے، کہ ہمارا کلچر اس کنٹری کے نیٹو لوگ سے بہت ہائی ہے۔ نیٹو عورت سے

ہمارا گند ہونا نہیں مانگتا۔ وہ ہمارا لینگویج نہیں سمجھتا۔ کانٹا چھری نہیں جانتا۔ کموڈ نہیں کرتا ــــ ہم ان کے ساتھ سک ہوتا، صاب، ہم ان کے ساتھ مرجائے گا۔"

اس فرمائش پہ جان میکفرسن نے اُسے ذرا سختی سے ڈانٹ دیا تھا اور بڑی بے رحمی سے اس پر انکشاف کیا تھا، کہ ولایت کی میم صاحب افضل جیسے جاہل، غیر مہذب اور کمینے انسان پر لمبے سے لمبا پائپ لگا کر تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گی ــ آج افضل کی گفتگو سے اُسے شک ہُوا کہ کہیں اس کی یہ پرانی خواہش تو عود کر نہیں آئی؟ چنانچہ حفظ ما تقدم کے طور پر جان میکفرسن کی پیشانی پر تیوریوں کی بہت سے جھریاں نمودار ہو گئیں۔ افضل اپنے آقا کی رگ رگ کو خوب پہچانتا تھا۔ اس لیے وہ اس کے دِل میں سر اٹھانے والے شبہات کو بھانپ گیا۔

"نہیں صاب۔ فکر نہیں۔ وہ بات بھی نہیں ہے۔"

"کون بات؟"

"میم صاب والا بات، صاب۔ ہم اپنا پوزیشن خوب جانتا ہے، صاب۔ ہم وہ خیال ڈسمس کر دیا۔"

جان میکفرسن کے ماتھے کی جھریاں مدھم پڑ گئیں۔ اور اس نے رومال نکال کر اس میں بڑے زور سے ناک صاف کی۔

"صاب، ہم یہ معلوم کرنا مانگتا کہ کیا اب صاب اس کنٹری میں واپس آئے گا؟"

جان میکفرسن کے تن بدن میں ایک زبردست جھٹکا لگا۔ جیسے اس نے اچانک برقی رَو کو چھو لیا ہو۔ اس نے رومال نکال اس میں اور بھی زور سے دوبارہ ناک صاف کی۔

"صاب، آج مارننگ جب ہم بازار کرنے گیا، تو وہ وہ راشکل رام پرشاد فروٹ والا بولتا کہ مسٹر افضل، اب تمہارا صاب واپس آنے نہیں سکتا۔ ہم سب انگریز لوگ کو خلاص کرنا مانگتا۔"

جان میکفرسن نے تیسری بار رومال نکال کر اپنے دماغ میں سرسراتے ہُوئے بوجھ کو ہلکا کیا۔ اگر رونا خلافِ شان نہ ہوتا، تو یقیناً اس کی آنکھیں بھی اسی شدّت سے اس کی ناک کا ساتھ دیتیں۔

"صاب، علی بخش بوچڑ بھی یہی ڈرٹی بات بولتا۔ اور نرائن دھوبی بھی مسخری کرتا کہ مسٹر افضل اب برٹش راج ایک دم خلاص ہونا مانگتا۔ صاب، اگر بریک فاسٹ لیٹ نہیں ہوتا تھا۔ تو ہم ان سب ڈیم سوائن کو باری باری سے مزا چکھاتا تھا۔ لیکن صاب صرف اپنا انفرمیشن کے واسطے ہم پوچھنا مانگتا، کہ کیا اب صاب اس کنٹری میں واپس آئے گا؟"

جان میکفرسن کے دِل پر دوسرا چرکا لندن میں اس وقت لگا۔ جب وہ برکلے اسٹریٹ میں ٹامس کک کے ہاں ایس۔ ایس سیٹرتھ مور میں اپنا برتھ ریزرو کروانے گیا تھا۔

"جان میکفرسن، اسکوائر۔ او۔ بی۔ ای۔ سی۔ آئی۔ ای۔ آئی سی۔ ایس۔ کمشنر بھاگلپور۔ بہار۔ انڈیا۔" رجسٹریشن سیکشن والی لڑکی اس کا پتہ لکھتے لکھتے اچانک رک گئی۔ اس نے رجسٹر پر جھکا ہُوا سر اُٹھا کر اپنے موٹے شیشے والی عینک کے پیچھے سے جان میکفرسن کی طرف یُوں دیکھا، جیسے وہ اس کے پاس چاند کی طرف سفر کرنے کا ٹکٹ خریدنے آیا ہو پھر لڑکی کے لمبوترے سے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ اور اس نے ایک سرد آہ بھر کر جان میکفرسن پہ دُکھ اور رحم سے بھرپُور نگاہ ڈالی۔

GOING TO COLLECT YOUR THINGS SIR لڑکی نے ازراہ ہمدردی گفتگو کا آغاز کیا ــــ اور جان میکفرسن کو کاؤنٹر کے سامنے کھڑے کھڑے یُوں محسوس ہُوا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی چور چور ہو کر پتلون میں گر گئی ہو۔

اب اگر بھاگلپور کی کمشنری کا ناظر اور ہیڈ اردلی اس کے استقبال کے لیے بمبئی نہ پہنچے ہُوئے، تو یہ اس کے ضعیف دِل پر تیسری جدید ضرب ہوگی۔ اگر وہ نہ

آئے ہو۔ . . . . . اگر وہ نہ آئے . . . . . . نہ آئیں۔ اپنی بلا سے۔ جان میکفرسن نے صرف دو ہی روز تو بمبئی میں ٹھہرنا تھا۔ اور گورنمنٹ ہاؤس کا دعوتی رقعہ اس کو لندن ہی میں مل گیا تھا۔

ادھر بھی اگر وہ نہ آتے؟ یہ بھیانک خیال رہ رہ کر اس کے سینے پر سمندر کی تند لہروں کی طرح ٹکراتا تھا۔ اور دور بمبئی کے ساحل پر یکے بعد دیگرے اُبھرنے والے روشنی کے نشان تاریک دھبوں میں بدل جاتے تھے۔ اگر جان میکفرسن کو یہ یقین ہوتا کہ بمبئی کے ساحل پر اُترتے کوئی اس کی ٹوپی اچھال کر سمندر میں پھینک دے گا، یا زبردستی اس کی پتلون اتار کر بھاگ جائے گا، تو بھی غالباً اس کے دل میں اس سے زیادہ پریشانی کا احساس نہ پیدا ہوتا جتنا کہ اب ناظر اور ہیڈ ار دلی کے آنے یا نہ آنے کی بیم و رجا سے پیدا ہو رہا تھا۔ وہ پچھلے بائیس برس سے ایک عظیم الشان سلطنت کو اپنے شانوں پر اُٹھائے کھڑا تھا، تاکہ اس پر کبھی آفتاب غروب نہ ہو۔ اس فرض کی انجام دہی میں اس نے دن اور رات، خون اور پسینہ ایک کر دیے تھے۔ اس نے مچھروں کی پروا کی تھی نہ ملیریا کی۔ سانپوں کا خیال کیا تھا نہ بچھوؤں کا۔ سن سٹروک سے ڈرا تھا نہ ہیضے یا طاعون یا کالا آزار سے۔ اس نے اپنی جوانی کا رس، اپنے دماغ کا جوہر، اپنے قلب کا سکون بے دریغ قربان کیا تھا، تاکہ برطانیہ کے تاج میں کوہِ نور کی چمک ماند نہ ہونے پاتے۔ لیکن اب جب کہ اس کے آرام کے دن قریب آ رہے تھے، قدم قدم پر اُسے ایک نیا دھکا لگ رہا تھا۔ بات بات پر اس کے دل پر نئے نشتر چلتے تھے۔ اب اس کی آنکھوں میں وہ پُرانا نور باقی نہ تھا، جس سے وہ تاج کی دھندلاتی ہوئی تابانی کو جلا بخش سکتا۔ نہ ہی اب اس کے کندھوں میں وہ سکت تھی جس کے سہارے وہ اپنی سلطنت کو کبھی غروب ہونے والے آفتاب کے رُخ پر سہارا دیے رکھتا۔

—— جان میکفرسن کے سینے میں یہ خلش یوں جوش مار رہی تھی جیسے سوڈا واٹر کی بوتل کا دھانہ بھک سے پھٹ گیا ہو۔ اس کی کن پٹیوں میں خون کی گردش اُبلنے لگی۔ گلے میں مچھلی کے کانٹے پھنس گئے۔ اور آنکھوں پر دُوربین لگا لی۔

"ہیلو جان۔ کہو یار، آج جاتی بہار کی بازی لگے گی؟" سردار جسونت سنگھ نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ اور دوسرے ہاتھ سے تاش کی گڈی کو عین اس کی ناک کے نیچے زور سے پھڑ پھڑایا۔

جان میکفرسن کو یہ حرکت بہت ناگوار گزری۔ یکایک اس کی آنکھوں میں اُترے ہوئے آنسو خشک ہو گئے۔ اس کی خمیدہ گردن میں تناؤ آ گیا۔ سردار جسونت سنگھ کو کوئی جواب دیے بغیر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور غصّے سے وہاں سے چلا آیا۔ لمحہ بھر کے لیے سردار جسونت سنگھ دم بخود کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر اس نے جلدی جلدی اِدھر اُدھر دیکھ کر جائزہ لیا۔ کہ کسی اور نے تو اس کی یہ گت بنتے نہیں دیکھ لی؟ سامنے کچھ دُور مسز جیکسن کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ایک زہریلی، کاٹنے والی مسکراہٹ جس میں نفرت، حقارت، اور طنز کے نشتر سانپوں کے ڈنکوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ جب سردار جسونت سنگھ کی آنکھیں اس سے چار ہوئیں، تو مسز جیکسن نے بڑے وقار، بڑے غرور سے اپنے سر کو کئی بار جنبش دی، کہ ہاں، ذرا اپنی اوقات تو پہچانو۔ تم حد سے زیادہ بڑھ گئے تھے۔ تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا . . . . سردار جسونت سنگھ کے سینے میں گالیوں کا ایک غبار سا اُٹھا۔ وہ دیر تک ڈیک پہ کھڑا زیرِ لب گالیاں نکال نکال کر اپنا سینہ ہلکا کرتا رہا۔ لیکن اس کے دل میں غصّے کا جو شعلہ بھڑک رہا تھا، وہ کسی پہلو ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ پھر اس کے قدم اُسے بے اختیار بار روم میں لے گئے۔ بار روم میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھ کر وہ حیران ہو گیا، کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک باریک سی لہر اُبھری ہوئی تھی۔ کیا یہ وطن پہنچنے پر خوشی کے آنسو

ہیں؟ لیکن اس کے دل کا چور پکار پکار کر اُسے جھنجھوڑ رہا تھا، کہ سردار جسونت سنگھ، تم اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ خوشی کے آنسو نہیں۔ بلکہ دراصل تم رو رہے ہو۔ کیونکہ جان میکفرسن نے تمہارے منہ پر تھوک دیا ہے۔ اور مسز جیکسن تمہاری درگت پر جی کھول کے مُسکرا رہی تھی . . . .

"بوائے، ایک پیگ وسکی" اس نے گلا پھاڑ کر پکارا۔

"لنڈن پیگ صاحب، یا پٹیالہ پیگ؟ باربین نے حسبِ معمول دریافت کیا۔ سردار جسونت سنگھ نے خود اسے مختلف پیگوں کے پیمانے سکھائے تھے۔ لنڈن پیگ سب سے چھوٹا تھا، فرنچ پیگ اس سے زیادہ، امریکن پیگ اُس سے بھی زیادہ، اور پٹیالہ پیگ سب سے بڑا، کوئی نصف گلاس کے قریب۔

سردار جسونت سنگھ اپنے دل کی دکھتی ہوئی گہرائیوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے باربین کی بات نہ سنی۔

"لنڈن پیگ صاحب، یا پٹیالہ پیگ؟" باربین نے دوبارہ پوچھا۔

"لنڈن پیگ کی ماں کو . . . ." سردار جسونت سنگھ نے چونک کر ایک بھدی سی گالی دی۔ دو تین پٹیالہ پیگ پی کر اس کا دل کچھ ہلکا سا ہو گیا۔ اور اُسے یُوں محسوس ہونے لگا کہ جو گالی اُس نے لنڈن پیگ کی ماں کو دی تھی، وہ اصل میں جان میکفرسن، مسز جیکسن بلکہ جزیرہ انگلستان کی ساری ماؤں کو یکساں طور پر لگتی تھی۔ اس خوشگوار احساس سے اس کے قلب اور دماغ پر کچھ آسودگی، کچھ سکون، کچھ سرور چھا گیا۔ اور وہ بار میں بیٹھا جھوم جھوم کر لنڈن پیگ کی ماں، بہن اور بیٹی کو نئی نئی اچھوتی گالیوں سے نوازتا رہا اور پٹیالہ پیگ پر پٹیالہ پیگ پیتا رہا۔

آدھی رات کے قریب جب رابرٹ لانگ جو نیویارک پوسٹ کے نامہ نگار خصوصی کی حیثیت سے ہندوستان آ رہا تھا، اپنی روزانہ ڈائری لکھنے بیٹھا۔ تو اس نے یہ قلم بند کیا:

"جہاز بمبئی کے ساحل کے عین سامنے لنگر انداز ہے۔ کل صبح دس بجے یہ بلیرڈ پائیر میں داخل ہو کر اپنے مسافروں کو بندرگاہ پر اُگل دے گا ——— جیسے مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کو اُگل دیا تھا! یہ تشبیہ میری اپنی نہیں۔ بلکہ میں شاہد کے خیال کو استعمال کر رہا ہوں۔ جب کبھی وہ جہاز کی زندگی سے اکتا جاتا ہے، تو کہا کرتا ہے کہ رابرٹ پڑھو، کہ اے خدا تیرے سوا اور کوئی نہیں۔ تیری ذات پاک ہے۔ بے شک میں بہت ہی بڑا گنہگار ہوں۔ شاہد کہتا ہے، کہ جب حضرت یونسؑ نے مچھلی کے پیٹ میں یہ دُعا مانگی تھی تو اُس نے انہیں ساحل پر اُگل دیا تھا۔ شاید اس دُعا کی مدد سے ہمیں بھی اس مگرمچھ جیسے جہاز سے جلد نجات مل جائے!"

"رات کے اندھیرے میں بمبئی میں بجلی کے قمقموں اور میرین ڈرائیو پر چلتی ہوئی موٹر کاروں کی روشنیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس وقت اس شہر میں کوئی خصوصیت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ امریکہ یا یورپ یا انگلستان کا کوئی بھی شہر ہو سکتا ہے۔ اس وقت اسے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا، کہ یہ شہر یوگیوں، مہاراجوں، گاندھی، اور جناح کی سرزمین پر واقع ہے۔"

"آج رات میں نے ایک عجیب واقع دیکھا۔ ڈنر کے بعد جب میں سب سے اوپر والے ڈیک پر حسبِ معمول چہل قدمی کے لیے گیا، تو ایک کونے سے سسکیوں کی لگاتار آواز آ رہی تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی۔ کیونکہ عموماً اس وقت اس ڈیک پر میرے سوا اور کوئی نہیں ہوا کرتا۔ میں نے دیکھا، کہ جان میکفرسن ڈیک کے جنگلے پر جھکا ہوا بے اختیار بلک بلک کر رو رہا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد مسز جیکسن شاید اس کی تلاش میں اوپر آئی، تو وہ بھی اس کے ساتھ مل کر رونے لگی۔ سردار جسونت سنگھ ساری شام بار میں بیٹھا ہوا شراب پیتا، گالیاں بکتا، گاتا اور دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ سارا دن شاہد مجھے نظر نہیں آیا۔ رات کو ڈنر پر بھی وہ موجود نہیں تھا۔ میرے دریافت کرنے پر کیبن بوائے نے بتایا کہ

وہ بھی اپنے برہنہ پر منہ ڈھانپے پڑا رہا ہے۔ شاید وہ بھی رو رہا ہو۔ حیرت۔ شاید یہ اس پُراسرار ملک کی خاصیت ہے۔ نہ معلوم اس کی فضا میں کتنی المناک صدیاں کپکپا رہی ہیں۔ میں اپنے دل پر بھی ایک عجیب سا بوجھ محسوس کر رہا ہُوں۔ اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں۔ لیکن ہر لمحہ یہ بوجھ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ شاید دو چار خاموش آنسو بہانے سے یہ مبہم سی خلش مٹ جائے۔ لیکن میں ابھی اس ماحول کا شکار نہیں ہُوا۔ . . . ."

آپ بیتی

میرا اپنا کوئی نام نہیں۔ لیکن مجھے ہر روز سینکڑوں نام عطا ہوتے ہیں۔ میرا کوئی گھر نہیں، لیکن مجھے عالی شان محلوں سے لے کر غلیظ جھونپڑوں میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مجھ میں غیرت اور خودداری ہے لیکن ہمیشہ ہر قسم کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح نچایا جاتا ہُوں۔ مجھے شہرت سے شدید نفرت ہے لیکن کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب مجھے قصاب کی دکان پر لٹکے ہُوئے گوشت کی طرح برسرِ عام ننگا نہ کیا جاتا ہو۔ آخر انسان ہُوں۔ اپنے بھائیوں کی طرح مرنے کی تمنا بھی رکھتا ہُوں۔ لیکن کوئی آخری بار قطعی طور پر مرنے نہیں دیتا۔ رونا چاہوں تو ہنسنا پڑتا ہے۔ ہنسوں تو رونا لازم۔ خدا کی ساری خُدائی میں مجھ سا مظلوم کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ایک انار اور سو بیمار والا مقولہ میرے سامنے ہیچ ہے۔ میری حالت اس سے بھی خستہ ہے۔ ایک ناک ہے اور ہزاروں نکیلیں۔ جس طرف جھٹکا لگے بے اختیار کھنچا چلا جاتا ہُوں۔

نظر آنے کو تو بہت کچھ ہُوں، لیکن میری حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ اُردو

افسانے کا ایک کردار ہُوں۔ افسانہ نگار رات دن میری تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور جب ایک دفعہ ان کے ہاتھ آجاؤں تو خدا کی پناہ! نجات ملنا محال ہے۔ بہروپیوں کی طرح میرا رنگ روغن ناک نقشہ بدل بدل کر مجھے جس طرح استعمال کیا جاتا ہے اگر اس کی تفصیل بیان کرنے بیٹھ جاؤں تو یہ خود ایک افسانہ بن جائے۔

صبح و شام گلی کوچوں کی خاک چھاننے بھیجا جاتا ہُوں۔ اس ہیرا پھیری میں بہت سی جگہ جوتے کھاتا ہُوں۔ لیکن اس کا ذکر کسی کہانی میں نہیں ہوتا۔ راہ چلتی عورتوں کو گھورتا ہُوں۔ ریشمی برقعوں کا تعاقب کرتا ہوں۔ جلسوں اور جلوسوں، قبرستانوں، کارخانوں، شہروں، دیہاتوں، دفتروں، مسجدوں اور چور بازاروں کا مستقل طواف کرتا ہُوں۔ لیکن جو دیکھتا ہُوں وہ زبان پر نہیں لا سکتا۔ کیونکہ زبان میرے اختیار میں نہیں۔ بلکہ افسانہ نگار کے قابو میں ہے۔ البتہ اگر اس گھوما گھومی میں کسی بھی ایک خوبصورت عورت کا دوپٹہ ہاتھ میں آجائے تو گالیاں افسانہ نویس کو نہیں، مجھے پڑتی ہیں —— کسی کا ناک یا گردن پکڑ بیٹھوں تو فوجداری کا خطرہ افسانہ نگار کو نہیں مجھے لاحق ہوتا ہے۔ کہیں کسی کی ریش مبارک پر ہاتھ جا پڑے تو کفر کا فتویٰ بھی میرے ہی سر۔ دائیں طرف بھٹک نکلوں تو رجعت پسند، بائیں طرف جھکوں تو ترقی پسند۔ دو چار ہفتے حجامت نہ بنواؤں تو کمیونسٹ۔ دھوبی کے دُھلے کپڑے پہن لُوں سرمایہ دار۔ افسانہ نگار تو فقط افسانہ نگار ہی رہتا ہے۔ اس کھینچا تانی میں میری تکہ بوٹی ہو جاتی ہے۔

پچھلے دِنوں جب ہندوستان اور پاکستان پہ آزادی کا نزول ہُوا تو میرے دِل میں بڑے بڑے ارمانوں نے سر اٹھایا کہ شاید یہ انقلابِ عظیم مجھے ایک ایسی زندگی جاوید عطا فرمائے گا جس کے سامنے انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کے ہیرو بھی ماند پڑ جائیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ دراصل ہُوا کیا؟ ...... اُردو کے افسانہ نگاروں نے مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور پکڑ پکڑ کر کبھی ہندوؤں سے زندہ آگ میں جلوایا کبھی

سِکھوں کی کرپانوں سے کٹوایا۔ کبھی مُسلمانوں کے ہاتھوں ذبح کرایا کبھی پنجاب کی ریلوں میں قتل ہُوا۔ کبھی کلکتے کے بازاروں میں مارا گیا اور جب اس خون کی ہولی سے افسانہ نگاروں کا جی پُورا طرح بھر گیا تو اُنھوں نے میرے کپڑے پھاڑ کر بال نوچ کر حال سے بے حال کر کے مہاجر کا جامہ پہنا دیا۔ اور آج تک اسی چکر میں مارا مارا پھر رہا ہُوں۔ نجات کا کوئی راستہ نہیں آتا۔ کیونکہ افسانہ نگاروں نے مجھے اس طوفان میں دھکیل تو دیا لیکن اب باہر نکالنے سے قاصر ہیں۔ میں اپنی اس نئی زندگی کے بے پایاں سمندر میں کبھی ڈوبتا ہُوں کبھی اُبھرتا ہُوں۔ اور میرے آقائے نامدار افسانہ نگار بے دست و پا ساحل پر کھڑے میرا انتظار کر رہے ہیں ...... سچ پُوچھیے تو یہ مہاجر زندگی بھی بڑی کراری زندگی ہے جس کو ایک روز اس کی لت پڑ گئی وہ بس ہمیشہ کے لیے اسی زندگی کا حلقہ بگوش ہو کے رہ گیا۔ استاد ذوق کے قول کے مطابق:

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہُوئی

یہ اسی نشے کی کشش ہے کہ جن حضرات کو ہجرت کی سعادت نصیب نہیں ہُوئی، وہ بھی جوق در جوق مہاجرین کے زمرے میں شامل ہونے کے لیے بے قرار ہیں۔ چنانچہ اب خدا کے فضل و کرم سے یہ حالت ہے کہ اصلی مہاجرین کے مقابلے میں ان حضرات کی تعداد کہیں زیادہ ہے جو محض تبرکاً اس سُنتِ نبویؐ کو پُورا کر رہے ہیں ......

خیر یہ ایک دوسرا قصہ ہے۔ دراصل جو بات میں عرض کرنا چاہتا ہُوں، وہ ایک مہاجر لڑکی کے متعلق ہے۔ آپ ضرور ناک بھوں چڑھائیں گے کہ یہ کیا بیہودہ بکواس ہے۔ مہاجر لڑکیوں کے قصّے تو ہم روز سنتے ہیں۔ اب یہ مضمون بند ہونا چاہیے بندہ پرور! آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر دراصل مجھ سے چُوک ہُوئی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ جو چیز میں یہاں عرض کرنا چاہتا ہُوں وہ ایک مہاجر لڑکی کے متعلق ہی نہیں بلکہ اس میں دین اور ایمان کی بھی بہت سی لاجواب باتیں ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ آپ مذہب کے نام پر

بھی چیں بجبیں ہوں۔ اگر ایسی بات ہے تو بے شک آپ کا ٹھکانا جہنم میں ہے اور آپ میری کہانی کو اُدھورا چھوڑ کر بڑے شوق سے اپنی منزلِ مقصود کی راہ لے سکتے ہیں.....

... جن لوگوں کے ایمان سلامت ہیں اور جن کے دلوں سے ابھی تک مہاجر لڑکیوں کی یاد فراموش نہیں ہُوئی۔ ان کے لیے اس قصّے میں بڑے ثواب اور بڑی حکمت کی نشانیاں ہیں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ گاندھی گارڈن میں مزے سے گھاس پر لیٹا ہُوا اُونگھ رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک اخبار تھا جس میں ایک نئی مسجد کی تعمیر کے لیے چندے کی اپیل تھی۔ ساتھ ہی ایک ہوٹل کا اشتہار تھا کہ آج رات کی ساری آمدنی اس مسجد کی تعمیر کے لیے وقف کر دی جائے گی۔ یُوں بھی آج کل میری گزر ہوٹلوں میں ہوتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال رہا تو مرنے کا بھی ضرور ہسپتال جا کر..... خیر اس کارِ ثواب میں حصہ لینے کے لیے اس شام سیدھا اشتہار والے ہوٹل پہنچا۔ وہاں شراب، ڈنر اور ڈانس کا معقول انتظام تھا اور منیجر صاحب کے کاؤنٹر پر ایک نورانی چہرے والے باریش بزرگ بھی موجود تھے۔ تاکہ حساب کتاب پر کڑی نگاہ رکھیں۔ شام کی کارروائی قرآن خوانی کی جگہ شمپین سے شروع ہُوئی۔ مَیں نے جی بھر کے شراب پی۔ ڈنر کھایا اور ناچ دیکھا جس میں ایک فرانسیسی رقاصہ اپنے جسم اور لباس کی آنکھ مچولی کا بڑا کمال دکھا رہی تھی، کوئی آدھی رات کے قریب جب مَیں ہوٹل سے باہر نکلا تو ہم خرما و ہم ثواب کے احساس سے میرا دل شاد اور رُوح منوّر تھی۔ یہ بھی آزادی کی برکت ہے کہ پہلے شراب نوشی پر کُفر کا فتویٰ لگنے کا احتمال تھا۔ لیکن اب اس لال پری کے اشاروں پر مسجد کے مینار بلند ہوتے ہیں اور سینوں میں ایمان کی شمع فروزاں روشن ہوتی ہے۔ قریب تھا کہ میں احسانِ تشکر سے اللہ میاں کی بارگاہ میں سجدہ بجا لاؤں کہ یکایک سڑک کے عین درمیان ایک رکشا والے نے مجھے تھام لیا اور میرے قدموں کی شدید لڑکھڑاہٹ دیکھ کر مجھے اپنے

رکشا میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ رکشا والے کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ ہر روز آدھی رات کے وقت خلقِ خدا کی خدمت کرنے کا عادی ہے اور خاص طور پر اسے ان حضرات کی نگہداشت کا خاص ملکہ ہے جو عموماً اس ہوٹل میں تعمیرِ مساجد کے سلسلے میں حاضر ہُوا کرتے ہیں چنانچہ رکشا پر بیٹھتے ہی موقعہ و محل کی رعایت سے اس نے روحانیت کا ذکر چھیڑ دیا۔ خدانخواستہ یہ بات نہیں کہ اس نے کسی وظیفہ یا درود یا کلمہ کا ورد شروع کیا۔ بلکہ حقیقت میں اُس نے مہاجر چھوکریوں کے قصّے چھیڑ دیئے۔ جو پانچ روپے سے لے کر پچاس روپے تک فوراً دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یہ بھی افسانہ نگاروں کی صحبت کا فیض ہے کہ مَیں عورت ذات کو روحانیت کا جوہر سمجھتا ہُوں کہ جس کے بغیر بجز موت اور کوئی زندگی ممکن نہیں ہے۔

"سیٹھ!" رکشا والے نے مجھے بشارت دی اگر تم بیس روپے صرف کرو تو تمہیں ابھی جنّت کی سیر کرالاؤں.......

مَیں نے اس دعوتِ خیر کو بخوشی قبول کر لیا۔ ہوٹل میں تعمیرِ مسجد کے نام پر ڈنر کھا کے شراب پی کے اور رُوح کو گرمانے والے ناچ دیکھ کر مَیں نے اپنا نام جنّت کے خریداروں میں لکھوا ہی دیا تھا۔ اب اگر صرف بیس روپے مزید صرف کر کے رہی سہی منزل بھی طے ہو سکتی ہے۔

"تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد"

چنانچہ مَیں نے رکشا والے کو پانچ روپے انعام کا مژدہ بھی سُنایا تاکہ وہ اس کارِ خیر کی تکمیل میں کوئی تاخیر نہ کرے۔ ان پانچ روپوں نے جادو کا اثر دکھایا اور رکشا راہ گیروں سے اُلجھتی موٹروں سے بچتی بچاتی سرپٹ بھاگنے لگی۔ پہلے سڑک کے دونوں جانب بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ پھر تنگ گلیوں میں ٹاٹ اور چٹائیوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے۔ ایک مقام پر ایک مسجد بھی نظر آئی مگر مجھے خیال آیا کہ لگے ہاتھوں وضو بھی کرتا چلوں، لیکن رکشا والے نے مجھے اس نیک ارادے سے باز رکھا.......

"سیٹھ!" رکشا والا تلخی سے ہنس کر بولا "معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت پی گئے ہو۔ اگر کسی نے تم کو اس حالت میں مسجد میں پکڑ لیا، تو مارے جوتیوں کے کھوپڑی گنجی ہو جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اس بات پر بے حد غصّہ آنا چاہیے تھا، لیکن نہ آیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ بچارا رکشہ والا محض ناواقف اور ناداں ہے۔ اسے کیا خبر کہ بہت جلد اس شہر میں ایک عالی شان مسجد تعمیر ہونے والی ہے جس کی بہت اینٹوں پر میرا نام بھی لکھا ہُوا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر تاریکی، غلاظت اور بدبو کے ایک لامتناہی سلسلے میں چلتے چلتے ہم ایک جگہ جھونپڑوں کی دو رویہ قطاروں کے درمیان رُک گئے۔ یہاں جنّت کے بہت سے اور متلاشیوں کی رکشائیں، گھوڑا گاڑیاں، موٹریں اور ٹیکسیاں بھی کیئو لگائے کھڑی تھیں۔ میرا خضرِ راہ پانچ روپے کے انعام کی گرمی سے بھی بہت پھُرتی میں تھا۔ وہ کھٹ سے بہشت کے ایک دروازے میں داخل ہُوا اور ایک دوسرے دروازے سے ایک حُور کو برآمد کر کے لے آیا۔ مجھے افسوس ہے کہ افسانہ نگاروں کے فیضانِ صحبت سے میری زبان بگڑ چکی ہے اور میں استعاروں اور تشبیہوں کے بغیر اپنا مفہوم ادا نہیں کر سکتا۔ دراصل میرا مطلب یہ ہے کہ رکشہ والا ایک جھونپڑے میں گیا اور وہاں سے اپنے ساتھ ایک لڑکی لے آیا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں اس کی صورت کا جائزہ تو نہ لے سکا۔ لیکن جب وہ رکشہ میں میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تو میری چھٹی حس نے بے ساختہ گواہی دی کہ اگر

فردوس بروئے زمین است

ہمیں است وہمیں است

رکشہ والا بھی اب مزے میں تھا۔ جھونپڑے سے وہ ایک خوشبودار پان کھا کے نکلا تھا۔ مُنہ میں بیڑی تھی اور وہ سیٹیاں بجاتا، گاتا اور اکا دُکا راہ گیروں پر پان کی پیک تھوکتا تیز رفتاری سے چلا جا رہا تھا۔ کلفٹن بیچ کے ایک تاریک حصّے میں پہنچ کر وہ رُک گیا اور رکشہ ہمارے سپرد کر کے کچھ دُور پرے ریت پر منہ کے بل لیٹ کر سو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے اپنے ساتھی سے اس کا نام پُوچھ کر گفتگو کی ابتدا کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "راحت بیگم"۔ اُس نے جواب دیا۔ "گھر کہاں ہے؟"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امانت پُور ضلع مراد آباد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "یہاں کیسے پہنچ گئی ہو؟" میں نے پوچھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سوال پر وہ حیران سی ہُوئی اور میری طرف یُوں دیکھنے لگی جیسے میں نے یہ سوال پوچھ کر کوئی عجیب وغریب احمقانہ حرکت کی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن مجھے بھی افسانہ نگاروں کی ٹریننگ حاصِل تھی۔ اس لیے میں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

"صاحب!" اس نے کہا۔ "وہاں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے بھلا؟ نہ جان کا خیال، نہ مال کا خیال، نہ عزت و آبرو کا بچاؤ۔ توبہ، اس سے تو موت ہی اچھّی۔"

"بہت خوب"، میں نے چھیڑا۔ "یہاں پر تو بڑی عزّت و آبرو کے دِن گزار رہی ہو!"

"یہاں کی دوسری بات ہے صاحب"۔ اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "آخر یہاں پر اپنا دین تو سلامت ہے۔"

اس بات پر میری رُوح پھڑک اُٹھی اور میں نے دِل ہی دِل میں خدائے ذوالجلال کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے آج شام مجھے تعمیرِ مسجد میں ہاتھ بٹانے کی سعادت عطا فرمائی۔ اسلام کا بول بالا ہو۔ دین سلامت ہے تو سب کچھ ہے۔ دین ہی ایک دولت ہے جسے زوال نہیں۔ ایک طرف سمندر کی لہروں کی آہ وبقا تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسری طرف ریت پر رکشہ والا زور زور سے خراٹے لے رہا تھا اور وہ لڑکی کہہ رہی تھی۔ صاحب میری چھوٹی بہن اور ماں ابھی تک امانت پور ضلع مراد آباد میں ہیں۔ جب میرے پاس دو سو روپے جمع ہو جائیں گے تو میں انھیں بھی اس دوزخ سے نکال لاؤں گی۔ میں نے اب تک ایک سو چالیس روپے بچا رکھے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا، اور اس طرح کی چار راتیں اور لگ گئیں تو صاحب دو سو روپے ہونے میں کونسی دیر لگتی ہے؟ میں

دِل ہی دِل میں فیصلہ کر لیا، کہ آج مَیں اسے بیس کی جگہ پورے ساٹھ روپے دے دوں گا۔ وہ بھی کیا یاد کرے گی کہ کسی مُسلمان سے پالا پڑا تھا! آخر انسان کی مدد کرنا بھی تو مسجد کی تعمیر سے کچھ کم درجے کا ثواب نہیں۔ شاید اس کا درجہ تعمیرِ مسجد سے بھی کچھ بلند ہو.....
مَیں ابھی اسی حساب کتاب میں اُلجھا ہُوا تھا کہ یکایک دو شریف آدمی بیچ میں نمودار ہُوئے اور بڑی مستعدی سے ہمارے آگے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ پہلے انھوں نے رکشہ والے کو زور سے جھنجھوڑا اور پھر ہم دونوں کے خاندانوں کی کئی پشتوں کے متعلق اپنی وسیع معلومات کا اظہار فرمانے لگے۔ اس تمہید کے بعد انھوں نے ہمیں باری باری گھسیٹ کر رکشہ سے باہر نکالا اور بڑی تفصیل کے ساتھ ہماری تلاشی لی۔ میری پتلون کی جیب میں ایک بٹوہ تھا۔ جس میں وہ ساٹھ روپے بھی تھے، جنھیں مَیں نے ابھی ابھی ایک نیک کام میں لگانے کا ارادہ کیا تھا۔ لڑکی کی چولی سے وہ پوٹلی برآمد ہُوئی جس میں اُس نے ایک سو چالیس روپے بچا بچا کر رکھے تھے۔ ایک شریف آدمی نے بٹوے کو اور دوسرے شریف آدمی نے پوٹلی کو اپنی اپنی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اُنھوں نے ٹھوکر مار کر رکشہ والے کو جگایا وہ آنکھیں ملتا ہُوا، خاموشی سے اپنی سیٹ پر آ بیٹھا میرا خیال تھا کہ اب یہ لوگ ہمیں سیدھا تھانے لے جائیں گے۔ مَیں تھانے یا کچہری یا جیل سے مطلقاً نہیں گھبراتا کیونکہ انگریزی راج میں افسانہ نگار مجھے ان مقامات پر بھیجنے کے بہت شوقین تھے۔ لیکن صد حیف! کہ ان شریف آدمیوں نے میری طرف آنکھ تک اٹھا کر نہ دیکھا۔ کیونکہ اب وہ رکشا والے کی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ برآمد کرنے میں مصروف تھے۔ اس عمل کے بعد وہ دونوں راحت بیگم کو گود میں لے کر رکشہ میں بیٹھ گئے۔ رکشہ ادھ موئے سانپ کی طرح آہستہ آہستہ ریت پر رینگنے لگی۔ اور پھر کلفٹن بیچ کے ایک۔ اور ویران حصّے کے اندھیرے نے اُسے نگل لیا........

اَور عائشہ آ گئی

کھوکھرا پار کے مقام پر سرحد عبور کرتے ہُوئے ہندوستانی کسٹم چوکی والوں نے عبدالکریم اور اس کی بیوی کو تو جانے دیا۔ لیکن ان کی تین چیزوں کو مزید تحقیق کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ تین چیزیں سنگر سوئنگ مشین، ہرکولیس کا بائیسکل اور عبدالکریم کی جواں سال بیٹی عائشہ پر مشتمل تھیں۔ دو دن اور ایک رات کی منت وسماجت کے بعد بہ ہزار دِقت جب یہ چیزیں واپس ملیں تو سلائی کی مشین کے کئی کل پُرزے غائب تھے۔ بائیسکل کی گدی، ٹائر اور ٹیوبیں ندارد تھیں اور عائشہ...... خیر، یہ بھی غنیمت تھا، کہ اگر اللہ نے چاہا تو سلائی کی مشین کے کل پرزے بھی نئے ڈلوا لیے جائیں گے۔ بائیسکل کی گدی، ٹائر اور ٹیوبیں بھی اَور آ جائیں گی اور عائشہ.......؟ عائشہ کا بھی اللہ مالک ہے۔ عبدالکریم کو جو ایمان غیب کی پراسرار طاقتوں پر تھا۔ اس میں آج معمول سے بہت زیادہ کشف کی کیفیّت جھلک رہی تھی۔
جب وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے، تو مقامی والنٹیروں نے انھیں گوشت

کے سالن کا ایک پیالہ اور چار تازہ تازہ نان کھانے کو دیے۔ سفید سفید، نرم نرم، سوندھے سوندھے نان دیکھ کر عبدالکریم نے اپنی بیوی کی ران پر چوری سے چٹکی بھری اور سرگوشی میں کہا "میں نے کہا عائشہ کی ماں دیکھتی ہو، کیا خالص اور کرارے نان ہیں۔ اس سالی بمبئی میں کیا پڑا تھا؟ چار برس سے ستھرے آٹے کی صورت کو ترس گئے تھے۔ واہ، کیا مکھن کے پیڑے پیدا کیے ہیں میرے مولا نے۔"

جب وہ گاڑی کے ڈبے میں سوار ہوئے تو کچھ مسافر اپنے جان پہچان لوگوں کے ساتھ علیک سلیک میں مشغول تھے۔ "اسلام علیکم" "وعلیکم سلام"، "اسلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ"...... عبدالکریم نے پھر اپنی بیوی کو جھنجھوڑا "عائشہ کی ماں، سنتی ہو؟ کیا دھوم دھڑکے کے ساتھ دعا سلام ہو رہی ہے۔ واہ، اسلام کی تو شان ہی اور ہے۔ سالی بمبئی میں تو بندے ماترم بندے ماترم سنتے کان پک گئے تھے۔ خدا کی قسم آج تو میرا سینہ بھی جاری ہو رہا ہے۔ واہ، کیا بات ہے میرے مولا کی۔" اور عبدالکریم نے اپنے اغل بغل بیٹھے ہوئے مسافروں کے ساتھ بڑے جوش و خروش سے ہاتھ ملانا اور گونج گونج کر اسلام علیکم کہنا شروع کر دیا۔ اگر اس کی بیوی اسے پکڑ کر واپس نہ بٹھا لیتی تو نہ جانے وہ کب تک اس کارروائی میں لگا رہتا۔

جب گاڑی چلی تو عبدالکریم نے بڑے انہماک کے ساتھ اس کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کو سنا۔ باہر تار کے کھمبوں سے حساب لگا کر ٹرین کی رفتار کا جائزہ لیا۔ "واہ" اس نے اپنی بیوی کو پھر جھنجھوڑا "طوفان میل کیا چیز ہے اس کے سامنے۔ مزہ آ گیا گاڑی میں بیٹھ کر۔ عائشہ کی ماں، تم بھی اپنی تسبیح نکال لو اور کھلم کھلا اطمینان سے بیٹھ کر اللہ کا نام لو۔ کیا مجال ہے کہ کوئی پیچھے سے آ کر تمہاری گردن کاٹ لے۔"

ایک اسٹیشن کے بعد دوسرا اسٹیشن آتا گیا۔ گاڑی رکتی اور چلتی رہی، مسافر اترتے اور سوار ہوتے گئے۔ عبدالکریم کھڑکی سے منہ باہر لٹکائے اپنے ماحول کو اپنے

دل، سینے اور آنکھوں میں جذب کر رہا تھا۔ صاف ستھری وردی والا گارڈ جس کے سر پر جناح کیپ، ہاتھ میں سبز اور سرخ جھنڈیاں اور منہ میں سیٹی تھی۔ پلیٹ فارموں پر چیلوں کی طرح جھپٹتے ہوئے قلی۔ بھنبھناتی ہوئی مکھیوں سے لدے ہوئے مٹھائیوں اور کھانے کے خوانچے۔ باہر حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے میدان، اکا دکا گاؤں کے کچے پکے مکانوں سے نکلتا ہوا دھواں۔ جوہڑوں پر پانی بھرتی ہوئی، کپڑے دھوتی ہوئی عورتیں۔ گرد و غبار میں اٹے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے آسمان کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر روتے ہوئے کتے، بلیاں، گدھے، کہیں کہیں کسی گائے یا بیل یا بھینس کی سڑی ہوئی متعفن لاش.......

جب حیدر آباد کا اسٹیشن آیا، تو سب سے پہلے عبدالکریم کی نگاہ ایک رنگین بورڈ پر پڑی، جس پر ایک دل ہلا دینے والی مار کٹائی سے بھرپور فلم کا اشتہار تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اسی پلیٹ فارم پر کچھ سپاہی دس بارہ ملزموں کو گھیرے میں لیے کھڑے تھے اور ایک مجسٹریٹ صاحب کرسی پر ڈٹے برسرِ عام عدالت لگائے بیٹھے تھے اور بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کو دھڑا دھڑ جرمانے کی سزا سنا رہے تھے۔ سرکار کا یہ رعب داب دیکھ کر عبدالکریم بڑا متاثر ہوا اور اس نے حسبِ معمول اپنی بیوی کی توجہ اس طرف منعطف کرنے کے لیے اس کی ران پر چٹکی لی۔ "عائشہ کی ماں انتظام ہو تو ایسا ہو۔ سالی بمبئی میں کسی ٹکٹ بابو کی مجال ہے کہ بغیر ٹکٹ والوں کی روک ٹوک کرے۔ واہ، حکومت کا سلیقہ بھی مسلمان کے خون میں ہی ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ لالہ لوگوں کے بس کا نہیں ہے......"

عائشہ کی ماں بڑی دلجمعی سے سیٹ پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی گٹھڑی سے ایک ہزار ایک منکوں والی تسبیح نکال لی تھی اور اب بڑے انہماک سے اس پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کا ورد کرنے میں مشغول تھی۔

"عائشہ بیٹی" عبدالکریم نے اپنی بیٹی کو پکارا "دیکھتی ہو اپنی اماں کے ٹھاٹھ۔ واہ

کیا بات ہے اپنے وطن کی بیٹی، اس کالے صندوق سے میری ٹوپی بھی تو نکال دو ذرا۔ اب یہاں کس سالے کا ڈر ہے؟"

عائشہ نے میکانکی طور پر صندوق کھولا، اور ٹوپی نکال کر اپنے باپ کے حوالے کی۔ یہ ایک پُرانی سرمئی رنگ کی جناح کیپ تھی، جسے پہن کر عبدالکریم کسی وقت بھنڈی بازار کے پُرجوش جلسوں میں شامل ہُوا کرتا تھا۔ لیکن اب چار سال سے یہ ٹوپی صندوق میں بند تھی۔ اور اس پر لگا ہُوا کل کا چاند تارا زنگ آلود ہو کر ٹوپی کی رنگت کے ساتھ رل مل گیا تھا۔

ٹوپی اوڑھ کر عبدالکریم سینہ تان کر بیٹھ گیا۔ اور کھڑکی سے باہر اُڑتی ہُوئی گرد کو دیکھنے لگا۔ عائشہ بھی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک اکتائی ہُوئی بیزار نگاہ، جس کے سامنے کسی منزل کا نشان نہ ہو۔ وہ بار بار کوشش کرتی تھی کہ دل ہی دل میں دعائے گنج العرش کا ورد کرے۔ اس دُعا نے اس کی بہت سی مشکلیں حل کر دی تھیں۔ لیکن آج اس دُعا کے الفاظ اس کے ہونٹوں پر لرز کر رہ جاتے تھے اور زبان تک نہ پہنچتے تھے۔ اس کا دل بھی اندر ہی اندر پکار رہا تھا کہ اب یہ عظیم الاثر دُعا بھی اس کی مشکل آسان نہ کر سکے گی۔ اب وہ ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں خدا کی خدائی بھی چارہ ساز نہیں ہوتی۔ توبہ، یہ تو بڑا کفر ہے۔ خدا کی ذات تو قادرِ مطلق ہے۔ اگر وہ چاہے تو گردشِ ایام کا رُخ پیچھے کی طرف موڑ دے اور زمانے کو از سرِ نو اس لمحے شروع کرے۔ جب عائشہ ابھی کھوکھراپار کے قریب ہندوستانی کسٹم چوکی پر نہ پہنچی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کراچی پہنچ کر سب سے پہلا مسئلہ سر چھپانے کی جگہ تلاش کرنے کا تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی عبدالکریم نے اپنا سامان اسٹیشن کے باہر ایک فٹ پاتھ پر جما دیا اور عائشہ اور اس کی ماں کو وہاں بٹھا کر مکان کی تلاش میں نکل گیا۔ کچھ رات گئے جب وہ لوٹا، تو دن بھر کی دوڑ دھوپ سے بہت تھکا ہُوا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر بشاشت

اور اطمینان کے آثار جھلکتے تھے۔

"عائشہ کی ماں"، عبدالکریم نے فٹ پاتھ پر پاؤں پسار کے کہا "ہماری کراچی کے سامنے سالی بمبئی کی کچھ حقیقت ہی نہیں۔ تمہارے سر کی قسم! ایسے ایسے عالی شان محل کھڑے ہیں کہ نہ کبھی دیکھے نہ سُنے۔ ایک سے ایک بڑھ کے سیٹھ بھی موجود پڑا ہے۔ تمہاری قسم ایک ایک سیٹھ بمبئی کے چار چار مارواڑیوں کو اپنی جیب میں ڈال سکتا ہے اور پھر موٹریں؟ کاہے کو سالی بمبئی نے ایسی لمبے لمبے دار موٹریں دیکھی ہوں گی۔ پاس سے گزر جائیں، تو سمجھو جیسے کسی نے ریشم کا تھان کھول کر سڑک پر بچھا دیا ہے۔ اب ذرا ٹھکانے سے بیٹھ جائیں، تو تمہیں بھی گھما پھرا لاؤں گا۔ طبیعت خوش ہو جائے گی کراچی کی بہار دیکھ کر۔"

"مکان کا کچھ ہُوا؟" عائشہ کی ماں حقیقت کی طرف آئی۔

"اجی ابھی کیا جلدی پڑی ہے۔ اللہ نے چاہا تو سب انتظام ہو جائے گا۔ آج مَیں نے گھوم پھر کر پگڑی کے ریٹ دریافت کر لیے ہیں۔ خدا کی قسم، عائشہ کی ماں، سالی بمبئی کراچی کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں۔ پگڑی کے جو گنڈے دار ریٹ یہاں اُٹھتے ہیں، بے چارے بمبئی والوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔"

عبدالکریم کا اب یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ علی الصبح منہ اندھیرے چل کھڑا ہوتا۔ کبھی بس میں بیٹھتا، کبھی ٹرام میں، کبھی رکشہ پر، کبھی پیدل۔ کیماڑی۔ کلفٹن۔ بندر روڈ۔ صدر۔ فریئر پارک۔ اسمبلی ہال۔ چیف کورٹ۔ جیل۔ پیر الٰہی بخش کالونی۔ خداداد کالونی۔ ناظم آباد۔ منگھو پیر۔ قائدِ اعظم کا مزار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی مقام ایسا نہ تھا جس کا اس نے بنظرِ غائر جائزہ نہ لیا ہو۔ اور کوئی جائزہ ایسا نہ تھا جس نے اس کے خون کی گردش کو تیز اور اس کے دل کو شاد نہ کیا ہو۔ اور عبدالکریم کو کراچی کے فقیر بھی بڑے نجیب الطرفین نظر آتے تھے جو ماچس کی ڈبیاں اور اخبار بیچ بیچ کر بڑی خوش اسلوبی سے بھیک مانگتے تھے۔ بمبئی کی طرح نہیں، کہ ایک سے ایک بڑا مشٹنڈا لٹھ لیے پھرتا ہے اور بھیک یوں

مانگتا ہے جیسے دھمکی دے کر قرض وصول کر رہا ہو!

ایک روز وہ جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد گیا، نمازیوں کا بہت ہجوم تھا۔ مصر، شام، عراق، حجاز اور ایران سے بڑے بڑے لوگ ایک کانفرنس کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد انھوں نے پاکستان کے متعلق بڑی شاندار تقریریں کیں۔ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر ان کے ہاتھ چومنے لگے۔ گلے ملنے لگے اور چاروں طرف جوش و خروش کا ایک عجیب عالم چھا گیا۔ یہ سماں دیکھ کر عبدالکریم کی آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو بہنے لگے اور جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں شکرانہ کے دو رکعت نفل ادا کیے۔

بمبئی میں عبدالکریم کے پاس بھنڈی بازار کے عقب میں ایک چھوٹی سی کھولی تھی۔ ایک تاریک سا، گھناؤنا سا کمرہ، نہ کوئی برآمدہ، نہ صحن، نہ تازہ ہوا، نہ دھوپ اور پھر ہر مہینے پورے ساڑھے دس روپے کرایہ کے ٹھیک یکم کو ادا نہ ہوں تو سیٹھ کے گماشتے کی گھرکیاں اور دھمکیاں الگ۔ لیکن اس کے مقابلے میں اب کراچی میں زندگی بڑے مزے سے بسر ہوتی تھی جس فٹ پاتھ پر اس نے پہلے روز اڈا جمایا تھا اب وہاں کوئی بارہ فٹ لمبی اور ۱۰ فٹ چوڑی جگہ گھیر کر اس نے دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی لکڑی کے تختے جوڑ کر اور پرانی بوریوں کے پردے تان کر ایک چھوٹی سی کٹیا بنا لی تھی کھلی ہوا تھی۔ دھوپ اور روشنی بے روک ٹوک آتی جاتی تھی۔ پاس ہی بجلی کا کھمبا تھا جس کے بلب کی روشنی عین اس کے کمرے پر پڑتی تھی۔ پانی کا نل دور نہ تھا اور پھر نہ کرائے کا جھگڑا، نہ ہر مہینے سیٹھ کے گماشتے کی چیخ، اتفاق سے آس پاس کے ہمسائے بھی شریف لوگ تھے اور ان سب کی آپس میں بڑے اطمینان سے بسر ہوتی تھی۔

بمبئی میں عبدالکریم نے بہت سے کاروبار بدلے تھے۔ اخیر میں جب کانگرسی حکومت نے امتناع شراب کا حکم لگایا، تو عبدالکریم کے لیے ایک مستقل ذریعۂ معاش کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ایکسائز کے عملے، دیسی شراب کشید کرنے والوں اور بغیر پرمٹ کے شراب پینے والوں سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اور وہ ان تینوں کی مناسب خدمات کے عوض اپنے لیے دو ڈھائی سو روپے ماہوار پیدا کر لیتا تھا کراچی پہنچنے کے بعد اس نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ مملکتِ خداداد کے دارالخلافہ میں فی الحال حرمت شراب کا حکم نازل نہیں ہوا۔

یہ دیکھ کر اس کے دل میں بہت سی بدگمانیوں نے سر اٹھایا۔ اگرچہ وہ چور بازار میں شراب کا کاروبار کیا کرتا تھا لیکن وہ اسے ایک حرام چیز ضرور سمجھتا تھا۔ اور اس نے خود کبھی اس کو منہ نہیں لگایا تھا جب کانگرس والوں نے شراب پر بندش کا قانون لگایا تو وہ اپنے دوستوں کے سامنے بڑی بڑی ڈینگیں مارا کرتا تھا کہ ہندوؤں نے یہ کام کی بات مسلمانوں کے مذہب سے سیکھی ہے۔ لیکن اب کراچی میں یہ دگرگوں حالت دیکھ کر اسے بڑا ذہنی صدمہ پہنچا۔ اس نے بہت سے لوگوں سے اس کے بارے میں کرید کرید کر پوچھا، لیکن کوئی اس کی خاطر خواہ تشفی نہ کر سکا۔ آخر ایک روز جب وہ حکیم نجیب اللہ خان صاحب کے مطب میں بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا تو باتوں باتوں میں شراب کا مسئلہ بھی چھڑ گیا حکیم صاحب اپنے محلے میں بڑے جید عالم تصور کیے جاتے تھے اور وہ دوا دارو کے علاوہ مسئلہ مسائل سے بھی خلقِ خدا کی خدمت کیا کرتے تھے۔ عورتوں میں ہسٹریا کے مرض کو دوا کے بغیر محض روحانی وسائل سے رفع کر دینا ان کا خیال کمال تھا۔ عبدالکریم کے شکوک سن کر حکیم صاحب مسکرائے، اور عقلی، برہانی اور قرآنی زاویوں سے شراب پر بڑی فصاحت و بلاغت سے روشنی ڈالنے لگے۔ ہر امر میں نیکی اور بدی دونوں کے راستے وا ہوتے ہیں۔ انسان کا کمال یہ ہے، کہ وہ بدی سے منہ موڑے اور نیکی کو اختیار کرے۔ اسی طرح شراب کے فائدے اور گناہ بھی اس کے سامنے ہیں۔ یہاں بھی انسانی قوت اختیار کا امتحان ہے۔ شراب پر قانونی بندش لگا کر انسان کو اس امتحان سے

محروم کرنا سراسر مشیتِ ایزدی کے خلاف ہے۔

عبدالکریم پر ان تفسیرات کا بہت اثر ہوا اور اسلام، ایمان اور قرآن کے نئے نئے اسرار اس پر منکشف ہونے لگے "عائشہ کی ماں" اس نے کہا "غلامی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے بھلا؟ پچاس برس ہو گئے سالی بمبئی میں رہتے۔ نمازیں پڑھیں۔ قرآن شریف بھی سیکھا۔ لیکن کیا مجال جو کبھی سینے میں ایمان کی روشنی پیدا ہوئی۔ اب یہاں آ کر نئے نئے راز کھلنے لگے ہیں۔ سچ کہتے ہیں کہ ایمان کا مزہ بھی آزادی کے ساتھ ہے۔

"اسی لیے تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ غلام ملک میں جمعہ کی نماز تک جائز نہیں۔"

شراب کی طرف سے مطمئن ہو کر عبدالکریم نے کئی دوسرے کاروباروں کی طرف رجوع کیا۔ لیکن اسے اپنے چور بازار کے تجربات کام میں لانے کی کہیں کوئی صورت نظر نہ آئی۔ شراب ہے تو کھلم کھلا بک رہی ہے۔ آٹا ہے تو برسرِ عام چار آنے سیر کے حساب ڈھیروں ڈھیر مل رہا ہے۔ کپڑے کی بھی قلت نہیں۔ چینی عام ہے۔ اب چور بازاری چلے تو کس چیز کے سہارے چلے؟ پہلے اس نے پان بیڑی بیچنے کی کوشش کی۔ پھر آئس کریم اور پھلوں کے ٹھیلوں پر قسمت کو آزمایا۔ اس کے بعد کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان کھولی۔ گزارے کے لیے پیسے تو ہر جگہ سے نکل آتے تھے۔ لیکن زندگی عزیز کی چاشنی ختم ہو گئی تھی۔ اور سیدھی طرح دکان پر بیٹھے بیٹھے عبدالکریم کا جی بیزار ہو جاتا تھا۔ وہ کسی پُرخطر، زیرِ زمین قسم کے بیوپار کا متلاشی تھا جس کا تجربہ اس نے زندگی کے بہترین سال صرف کر کے حاصل کیا تھا۔ لیکن فی الحال اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس لیے اس کے دل اور دماغ پر ہمیشہ ایک مستقل اکتاہٹ چھائی رہتی۔

بمبئی میں اگر کسی وجہ سے اس پر بیزاری یا اکتاہٹ کا حملہ ہوتا تھا تو وہ جی بہلانے کے لیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے کسی چوبارے پر گانا سننے چلا جایا کرتا تھا۔ کراچی میں آئے ہوئے

اسے کئی مہینے ہو گئے تھے اور اس نے یہاں کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا تھا۔ لیکن اب تک اسے کہیں ایسے بازار کا نشان نظر نہ آیا تھا، جہاں وہ گھڑی دو گھڑی کو کلفت مٹانے کے لیے ہو آیا کرے۔ اس نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ چکلوں پر قانونی بندش لگی ہوئی ہے، اور جس طرح بمبئی میں شراب بند ہے۔ اسی طرح کراچی میں رنڈیوں کا پیشہ منع ہے۔ عبدالکریم نے یہ خبر بڑی صفائی قلب کے ساتھ عائشہ کی ماں کو سنائی اور وہ دونوں دیر تک فٹ پاتھ پر اپنی جھونپڑی کے سامنے چارپائی پر بیٹھے قرآن اور ایمان کی رُوح پرور باتیں کرتے رہے۔

چکلوں کے سلسلے میں جو تحقیقات عبدالکریم نے کی تھی اس کے دوران اس پر یہ حقیقت کھل گئی تھی، کہ اس میدان میں بلیک مارکیٹ کے وسیع امکانات ہیں۔ اس کی کچھ ایسے لوگوں سے شناسائی بھی ہو گئی تھی جو اس بیوپار میں بڑی دسترس رکھتے تھے اور عبدالکریم کے پرانے تجربات کی بنا پر اسے معقول کمیشن پر اپنا شریکِ کار بنانے کے لیے آمادہ تھے۔ ایک کانے دلال نے شاید عائشہ کو بھی کہیں دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے رائے دی کہ اگر عبدالکریم اس کی رفاقت کرے تو وہ بہت جلد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کے مالک بن جائیں گے۔ جب عبدالکریم کو اس کی نیت کا علم ہوا تو اس نے اپنا جوتا کھول کر اس کانے کی برسرِ عام خوب مرمت کی اور مسجد میں جا کر ساری رات سجدے میں پڑا روتا رہا، کہ اس کے دل میں ایسے ذلیل کام کا خیال بھی آیا۔ یا غفور الرحیم یہ اسی سیاہ کارانہ خیال کی سزا ہے کہ اب لوگ اس کی عائشہ کی طرف بھی نظریں اٹھانے لگے ہیں۔ یا اللہ توبہ۔ یا اللہ توبہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رات بھر خشوع و خضوع کے ساتھ استغفار کر کے عبدالکریم کا دل پھول کی طرح ہلکا ہو گیا۔ علی الصبح منہ اندھیرے جب وہ گھر واپس لوٹا، تو اس کی بیوی انتظار کرتے کرتے چٹائی پر سو گئی تھی۔ عائشہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر تلاوتِ قرآن میں مصروف

تھی۔ اس کی آواز میں بڑا سوز حزیں تھا۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ قرأت کے ساتھ خدا کا کلام پڑھتی تھی تو فضا میں ایک عجیب عرفان چھا جاتا تھا۔ عبدالکریم خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھا سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا یہی وہ معصومیت کا فرشتہ ہے جس کے متعلق ایک بدمعاش دلال نے سیاہ کاری کی ہوس کی تھی۔

عبدالکریم کی توبہ اور عائشہ کی دعاؤں نے بڑا اثر دکھایا۔ کپڑے کی دکان خوب چل نکلی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے عبدالکریم نے پیر الٰہی بخش کالونی میں ساڑھے چار ہزار روپے میں دو کمرے کا پختہ مکان خرید لیا۔ زندگی میں پہلی بار عائشہ کی ماں کو اپنی ملکیت کا مکان نصیب ہوا تھا۔ وہ اسے شیشے کی طرح صاف رکھنے لگی۔ دن میں کئی کئی بار سیمنٹ کا فرش دھویا جاتا۔ دیواریں جھاڑی جاتیں اور صبح شام اندر باہر فینائل کا چھڑکاؤ ہوتا۔ تاکہ مکھیاں اندر نہ آنے پائیں۔ علی الصبح منہ اندھیرے عبدالکریم کی بیوی تو مکان کی صفائی میں مصروف ہوتی۔ اور عائشہ دالان میں بیٹھ کر قرآن پڑھتی۔ عبدالکریم دیر تک بستر پر اپنے ماحول کے عرفان میں سرشار پڑا رہتا۔ انڈوں، پراٹھوں اور چائے کا ناشتہ کر کے جب وہ دکان کھولتا تو اس کا ظاہر اور باطن بڑے مطمئن اور آسودہ ہوتے تھے۔

رفتہ رفتہ عائشہ کے لیے پیام بھی آنے لگے۔ جس روز اس کی منگنی ہوئی۔ وہ بے اختیار ساری رات مصلے پر پڑی روتی رہی۔ رخصتی کے روز وہ کئی بار روتے روتے بے ہوش ہوئی۔ عبدالکریم اور عائشہ کی ماں کا بھی برا حال تھا۔ عائشہ کا خاوند بجنور کا مہاجر تھا اور ٹنڈو آدم خان میں آڑھتی کی دکان کرتا تھا۔ جس روز وہ سسرال سدھاری تو گویا عبدالکریم کا گھر سنسان ہو گیا۔ دوسرے روز حسب معمول اس کی آنکھ منہ اندھیرے کھلی لیکن دالان میں عائشہ کی آواز نہ پا کر وہ کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔ جب وہ دن چڑھے اٹھا، تو اس کے بدن میں بڑی آلکس تھی۔ جیسے افیونی کو افیون یا شرابی کو شراب سے ناغہ ہو گیا ہو۔ اس نے طوعاً و کرہاً منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتہ کیا اور کپڑے بدل

کر دکان پر چلا گیا۔ دکان میں بھی اس کی طبیعت کچھ اچاٹ سی رہی۔ اس لیے دکان کو معمول سے پہلے بند کر کے وہ جی بہلانے کے لیے گھومنے نکل گیا۔ رات کو دیر سے لوٹا اور بغیر کھانا کھائے سو گیا۔

اب اس کا معمول ہو گیا تھا، کہ صبح دیر سے اٹھتا۔ بہت دیر سے ناشتہ کرتا۔ کوئی دن ڈھلے دکان پر جاتا اور آدھی آدھی رات گئے گھر لوٹتا۔ رفتہ رفتہ اس نے دکان کے لیے ایک ملازم رکھ لیا اور سارا سارا دن سونے اور رات رات بھر باہر رہنے لگا۔ سرِ شام اس کے برآمدے میں کئی قسم کے دلالوں کا جمگھٹا لگ جاتا تھا۔ ان میں وہ کانا دلال بھی ہوتا تھا جسے عبدالکریم نے ایک روز برسرِ عام جوتوں سے پیٹا تھا۔

ایک دو بار عبدالکریم کی بیوی نے ان لوگوں کے متعلق پوچھ گچھ کی، تو اس نے بڑی صفائی سے ٹال دیا۔

"عائشہ کی ماں! اب میں نے ایک دو اور بیوپار بھی کھول لیے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو بڑی کامیابی ہو گی۔ تم ذرا جلدی سے ان بھلے آدمیوں کے لیے چائے پانی بھجوا دو۔"

عبدالکریم کے نئے بیوپار بھی چمک اٹھے۔ چھ سات مہینوں میں اس نے پیر الٰہی بخش کالونی والا مکان چھوڑ کر بندر روڈ پر ایک دو منزلہ کوٹھی خرید لی۔ صدر دروازے پر "سیٹھ عبدالکریم بمبئی والا" کا بورڈ لگ گیا۔ سواری کے لیے موٹر آ گئی اور گھر میں کام کاج کے لیے نوکر چاکر مقرر ہو گئے۔ اب عائشہ کی ماں کو بھی فرصت نصیب ہوئی۔ اور وہ آدھی آدھی رات اٹھ کر تہجد گزارتی تھی۔ . . . . اور اپنی ایک ہزار ایک دانوں والی تسبیح پر اللہ کے ایک سو ننانوے ناموں کا ورد کر کے اپنے شوہر کی کمائی میں برکت اور کشائش کی دعائیں کیا کرتی تھی۔

ایک رات جب عبدالکریم گھر آیا، تو عائشہ کی ماں نے اس کے پاؤں دابتے ہوئے کہا "اے جی . . . . . . میں نے کہا "کچھ سنتے ہو؟"

"کیا بات ہے، عائشہ کی ماں؟" عبدالکریم نے بے توجہی سے پوچھا۔ دِن بھر کی ریاضت سے وہ بہت تھکا ہُوا اور کسل مند تھا۔

"خیر سے ٹنڈو آدم خاں سے آدمی آیا تھا۔ اللہ رکھے، تمھاری بیٹی پر خُدا نے اپنی رحمت کی ہے۔ اگلے مہینے تم بھی نانا ابّا کہلانے لگو گے!"

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ عائشہ کی ماں اگلی جمعرات کو یتیم خانہ کے بچّوں کو بلا کر کھانا کھلا دینا۔ مجھے کام میں یاد رہے نہ رہے، تم ضرور یاد رکھنا اور ہاں ...... عائشہ کی ماں، کچھ زیورات اور کپڑے بھی بنوا رکھو۔ جب تم گھی کھچڑی لے کر جاؤ گی، تو خالی ہاتھ تو نہ جاؤ گی۔ اللہ رکھے اب دو پیسے آئے ہیں تو اپنی بیٹی پر بھی ارمان نکال لو!"

"اے ہے!" عائشہ کی ماں نے تنک کر کہا۔ "یہ تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا گھی کھچڑی لے کر کہاں جاؤں گی۔ میری بچّی، اللہ رکھے بڑی الھڑ اور انجان ہے ...... میں نے اسے دِن پُورے کرنے یہاں بلا لیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو پرسوں دوپہر کی گاڑی سے آجائے گی۔ تم بھی موٹر لے کر چلنا۔ ہم عائشہ کو اسٹیشن پر لینے جائیں گے!"

یہ خبر سُن کر عبدالکریم اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں پر مکڑی کے جالے سے تن گئے اور اُسے یُوں محسوس ہونے لگا جیسے گھر کے در و دیوار اس کا مُنہ چڑا چڑا کر پکار رہے ہوں، کہ اب عائشہ آ رہی ہے۔ عائشہ آ رہی ہے، عائشہ آ رہی ہے .....

وہ ساری رات بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح معمول سے پہلے اُٹھ بیٹھا۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے، ناشتہ کیا اور سیدھا اپنے کپڑے کی دکان پر جا بیٹھا۔ اس کا ملازم جو پچھلے آٹھ ماہ سے تن تنہا اس دکان کو اپنے من مانے طریقے پر چلا رہا تھا، مالک کو آتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن عبدالکریم نے حساب کتاب کے متعلق کوئی باز پُرس نہ کی۔ وہ سارا دن دکان پر کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ اس کے بہت سے یار دوست اس کی تلاش میں وہاں بھی آ پہنچے۔ لیکن وہ کام کا بہانہ کر کے سب کو رکھائی سے ٹالتا رہا۔ تیسرے پہر وہ کانا دلال

بھی حسبِ معمول اس کی تلاش میں وہاں آیا۔ اس کی صُورت دیکھتے ہی عبدالکریم آپے سے باہر ہو گیا۔ اور لوہے کا گز اُٹھا کر دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔

"خبردار! اگر تم میری دکان پر چڑھے تو تمھاری ٹانگیں توڑ ڈالوں گا۔ سالے حرامی نے ساری کراچی میں گندگی پھیلا رکھی ہے ...... جاؤ بھاگو یہاں سے، ورنہ ابھی پولیس کو خبر کرتا ہُوں، سالا دلاّ ...."

سر شام دکان بند کر کے عبدالکریم سیدھا مسجد میں چلا گیا، اور دیر تک سجدے میں پڑا بلک بلک کر روتا رہا۔ دُعا کے کلمات رہ رہ کر اس کی زبان پر آتے تھے۔ لیکن ہونٹوں پر لرز کے رہ جاتے تھے۔ جیسے کوئی کبوتر اپنے آشیانے پر بار بار آئے اور اسے ویران پا کر پھڑپھڑاتا ہُوا واپس چلا جائے۔

شاید عبدالکریم سجدے میں پڑے پڑے ہی سو گیا۔ کیونکہ جب کسی نے اس کو ہلا کر جگایا تو فجر کا وقت تھا۔ مؤذن صبح کی اذان دے رہا تھا۔ نیند کے خمار میں عبدالکریم کو یُوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ اذان کی آواز نہیں، بلکہ دُور کہیں بہت دُور کوئی چیخ چیخ کر پکار رہا ہے، کہ اب عائشہ آ رہی ہے۔ عائشہ آ رہی ہے، عائشہ آ رہی ہے ......"

غمِ جاناں

شاعر: کیا لکھ رہے ہو؟

افسانہ نگار: خاک

شاعر: بڑا دلچسپ موضوع ہے۔ مَیں بھی کوشش کر رہا ہُوں کہ اس زمین میں کچھ فکر سخن کروں۔

مصوّر: اپنا بھی یہی ارادہ ہے جب تک خاک کا تصوّر نہ کیا جائے۔ طبیعت کسی رنگ پر جمنے ہی نہیں پاتی۔

شاعر: آؤ مل کر خاک کی باتیں کریں
یا خس وخاشاک کی باتیں کریں

افسانہ نگار: تسلیمات! صاحبو، آپ دونوں گدھے ہیں۔

شاعر: واللہ! خوب یاد دلایا۔ ابھی کل مَیں نے "نوائے خر" کے نام سے ایک شاندار نظم کہی ہے۔ بند عرض کیا ہے۔

مجھ سے پہلی سی مشقت مرے مزدور نہ مانگ
اور بھی کام ہیں دُنیا میں مشقت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں بوجھ کی راحت کے سوا
تُو جو بل جائے اکیلا تو دولتی جھاڑوں
خاک میں تجھ کو لٹا کے تیرے کپڑے پھاڑوں
مجھ سے پہلی سی مشقت مرے مزدور نہ مانگ

مصوّر: میرا اگلا شاہکار بھی اسی حسین و جمیل چوپائے پر ہوگا کیوب ازم کے نظریات کے مطابق جو فنی صلاحیتیں گدھے میں پائی جاتی ہیں وہ کسی دوسرے جاندار میں نہیں ہیں۔

افسانہ نگار: میرا خیال ہے کہ گدھے کے بعد آپ حضرات بندر پر طبع آزمائی فرمائیں گے۔

مصوّر: بے شک۔ سرریلزم میں آرٹ کا کمال یہ ہے، کہ ہر سکیچ کو اس کی مرکزی حقیقت کے قریب ترین لایا جائے۔ حضرت انسان کی مرکزی اصلیت کے نزدیک پہنچ کر بہت واضح ہو جاتی ہے۔

شاعر: سرسوں کے ہرے کھیت میں اٹھلائے بندریا
بیلوں کو مُجتے دیکھ کے اترائے بندریا
مسکائے بندریا
شرمائے بندریا
بل کھائے بندریا . . . .

مصوّر: میں تو یہی رائے دوں گا کہ آپ اپنے فن کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اپنے افسانوں میں بندر کو اس کا مناسب منصب ضرور دیجیے۔

افسانہ نگار: نہ صاحب مجھے بخشیے۔ میں ابھی اللہ کی نعمتوں سے اس درجہ محروم نہیں ہُوا

کہ بندر کی طرف رجوع کروں۔

مصوّر: خیر، آپ کی مرضی۔ صحیح رائے دینا میرا فرض تھا۔ اگر آپ کو بندروں سے دلچسپی نہیں، تو مینڈک اور مُرغ بھی بڑے شاداب موضوع ہیں۔

شاعر: مُرغ پر اس خاکسار نے ایک مسدّس کہا تھا۔ ٹیپ کا بند ملاحظہ فرمائیے۔

صبح دم خواب سے دُنیا کو جگائیں تو ہم
نیند کے ماتوں کو تکبیر سُنائیں تو ہم
تیرے گھر بار کی رونق کو بڑھائیں تو ہم
تیرے دالان کو بیٹوں سے سجائیں تو ہم
پھر بھی اُٹھتے ہی چُھری ہم پہ چلائی تُو نے
حیف یہ رسمِ وفا خوب نبھائی تُو نے

افسانہ نگار: صاحبو، یہ بندر، گدھے، مینڈک اور مُرغ آپ کو مُبارک ہوں۔ مجھے ان حسین و جمیل موضوعات سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

شاعر: غالباً آپ نے داستان طرازی کا مشغلہ ترک کر دیا ہے؟

افسانہ نگار: جی نہیں۔ میں خدا کے فضل سے اب تک افسانے لکھتا ہُوں اور خُوب لکھتا ہُوں۔

مصوّر: اگر آپ کو زندگی کے ان ٹھوس حقائق سے دلچسپی نہیں، تو شاید آپ الف لیلیٰ کے شہزادوں، جنوں کے بادشاہ اور کوہ قاف کی پریوں کی کہانیاں لکھنے کے شوقین ہوں گے۔

افسانہ نگار: جی نہیں، خدا میری جمیلہ کو سلامت رکھے۔ اس کے ہوتے ہُوئے مجھے جنوں کے بادشاہ یا کوہ قاف کی پریوں کا سہارا لینے کی مطلقاً حاجت نہیں۔

شاعر: ہائے کیا نام لے لیا ظالم نے!

مصوّر: زندگی کے خوابیدہ تار جھنجھوڑ ڈالے اس نام نے ۔

شاعر: ہائے، کیا بات ہے جمیلہ کی۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کی رنگ برنگ چوڑیوں کی کھنک سے شعریت کے طوفان اُبلتے تھے ۔

مصوّر: اس کے جسم کے اقلیدسی خطوط اور ان کی گھنیری بھوؤں کی سیاہ جھالریں میرے شاہکاروں کی معراج تھیں ۔

شاعر: اس کی لانبی لانبی کمر تک بل کھاتی ہوئی زلف کا تصوّر میری شاعری کی جان تھا۔

مصوّر: مَیں نے ان کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر ابھارنے کی خاطر اپنے فن کو کمال تک پہنچا دیا ۔

شاعر: لیکن ہائے! جب سے جمیلہ نے اپنی زلف دوتا کٹوا کر بوبڈ ہیر رکھ لیے ہیں۔ میری شاعری مر گئی ہے ۔

مصوّر: اب وہ اپنی جھالر دار بھویں استرے سے مونڈ کر ان کی جگہ سُرمے کی تنی ہوئی لکیریں کھینچتی ہے ۔ میرے شاعر میرا فن برباد ہو گیا ۔

شاعر: میرے پیارے افسانہ نویس، تم اس لنڈ منڈ جمیلہ پر جتنی کہانیاں چاہو لکھتے رہو۔ اب اس میں میرے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی ۔

افسانہ نگار: تم دونوں بڑے کوز ذوق عاشق ہو۔ جس نکتے پر آ کر تمھارا فن مر گیا ہے وہاں سے میرے آرٹ کی ابتدا ہوتی ہے ۔ اگر تم کو جمیلہ کی رعنائیوں کو ایک نظر دیکھنا ہے، تو آؤ میرے ساتھ چلو۔ مَیں تمھیں طلسم ہوشربا کے نظارے دکھاؤں گا ۔ . . . . .

شاعر: کہاں چلو گے ؟

افسانہ نگار: بوٹ کلب ۔

مصوّر: نہیں بھئی وہاں جا کر ابکائیاں آتی ہیں۔ مَیں نے کئی مہینے وہاں کی خاک چھانی ہے۔ اور جب کبھی وہاں جاتا ہوں، تو میرا جی چاہتا ہے کہ قصاب کی دکان پر لٹکی ہوئی

گوشت کی ننگی رانوں کی تصویر کشی کروں ۔

افسانہ نگار: اگر تمھیں کچے گوشت سے اس قدر نفرت ہے تو کوئی بات نہیں ۔ مَیں تمھیں میٹرو پول کی رقص گاہ میں لے چلوں گا ۔ وہاں جمیلہ کے لچکیلے بدن کو رنگین غباروں کی طرح رقصاں دیکھ کر تمھارا دِل شاد اور رُوح منوّر ہو جائے گی ۔

شاعر: میرے دوست! خدا کے لیے مجھے وہاں کی یاد نہ دلاؤ۔ وجدان کی تلاش میں وہاں کئی کئی راتیں جاگا ہوں۔ لیکن ہر بار وہاں جا کر میری شاعری کا جوہر خاک ہو جاتا ہے۔ جب مَیں جمیلہ کو ہنسی خوشی ہر دوست اور ہر دشمن کے ساتھ باری باری دوش بدوش، بازو بہ بازو، سینہ بہ سینہ رقص کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میری شاعری میں رقیب روسیاہ کا لطیف تخیل فنا ہو جاتا ہے ۔

مصوّر: اب وہ میرے اسٹوڈیو میں ماڈل بننے بھی نہیں آتی بلکہ فوٹو گرافروں کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے، تاکہ اس کی تصویریں اخباروں کے پچھلے صفحات پر شائع ہوں۔

شاعر: اس کے فلیٹ میں بجلی کی گھنٹی لگی ہوئی ہے ۔ اور مجھے بھی دربان کی جھڑکیاں سہنے اور اس کی منت سماجت کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوتا ۔

مصوّر: میرے نزدیک جمیلہ کا وجود نیست و نابود ہو چکا ہے ۔ اب میں اس کی یاد میں اپنے آرٹ کو نئی نئی شاہراہوں پر چلا رہا ہوں ۔ جب مجھے جمیلہ کی خوبصورت اور سڈول ٹانگوں کا خیال آتا ہے تو رنگوں کی آمیزش سے چونے اور سیمنٹ کے مضبوط ستون بناتا ہوں ۔ جب مجھے اس کے حسین چہرے کی یاد ستاتی ہے تو مَیں ایکسرے کے فوٹو کی طرح ہڈیوں کے ڈھانچے کی تخلیق کرتا ہوں۔

افسانہ نگار: صاحبو! مجھے تم دونوں کی حالت پر رحم آتا ہے ۔ میرے ساتھ آؤ مَیں تمھیں جمیلہ کی ایک بالکل نئی اور اچھوتی جھلک دکھاؤں گا ۔

شاعر: مَیں خوب جانتا ہوں کہ اب تم ہمیں کسی ریفیوجی کالونی چلنے کی دعوت دو گے ۔

مصوّر: مَیں وہاں ہرگز نہ جاؤں گا۔ میرے ڈبوں کے سارے رنگ ختم ہوگئے ہیں۔ لیکن ہندوستان سے آنے والے ریفیوجیوں کی تعداد میں کمی نہیں ہونے پاتی۔ میرا آرٹ اس رفتار کا ساتھ دینے سے بالکل قاصر ہے۔ مَیں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔

شاعر: مَیں نے بھی اس کوچے کی ہیرا پھیری کی ہے اور کئی بار اسی تانک جھانک میں پٹا بھی ہوں۔ ناصاحب، اب وہاں جانے سے میری توبہ ہی بھلی۔

افسانہ نگار: تم بڑے بزدل اِنسان ہو۔ میری طرف دیکھو۔ کتنی بار مَیں نے خود جوتے کھائے ہیں، لیکن مَیں ابھی تک رفیوجیوں پر افسانے لکھنے سے باز نہیں آیا۔

شاعر: تمھارا کیا ہے۔ تم تو بے حیا ہو۔ ہر روز جوتے کھاتے ہو اور پھر کپڑے جھاڑ کر افسانہ لکھنے بیٹھ جاتے ہو۔ لیکن شاعر کا دِل بڑا نازک ہوتا ہے میرے یار۔ ذرا سی ٹھیس لگنے سے یہ آبگینہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تم شوق سے جاکر جُوتے کھاؤ اور افسانے لکھو۔ مَیں یہاں بیٹھ کر "اُونٹ گاڑی" پر اپنی نظم مکمل کروں گا اور میرا دوست مصوّر لنگور کی لہراتی ہُوئی بانکی زلف دوتا...... توبہ معاف کیجیے گا، لنگور کی لہراتی ہُوئی بانکی دم کی نقاشی کرے گا۔ آہاہا، سبحان اللہ کیا غضب کے شعر ہیں۔ عرض کیا ہے:

اُونٹ پھر آیا دِل راز! نہیں اُونٹ نہیں
یہ تو گاڑی ہے کہیں اور چلی جائے گی!
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا پاؤڈر کا غبار
پھڑپھڑانے لگے شانوں پہ تراشیدہ بال

ریلوے جنکشن

"کتنی چھٹی پر آئے ہو؟" نثار نے چھوٹتے ہی بغیر کسی علیک سلیک کے پوچھا۔

"پندرہ دن کی۔" مَیں نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔ چلو اس بار تمھیں لاہور کی زمین دوز مال گاڑیاں دکھائیں گے۔" نثار نے فیصلہ صادر کیا۔

"مَیں سیر کروں گا۔" وہ کچھ دیر سوچ کر مشفقانہ انداز سے کہتا ہے۔ "تم کہانیاں لکھنا۔"

یہ لائحہ عمل ہم دونوں کے حسبِ منشا ہے۔ چنانچہ شام ہوتے ہی نثار مجھے مال روڈ پر ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل کے لان پر ہم کمال بے حیائی سے ایک ایسی جگہ پر جا ڈٹے، جہاں پہلے سے ایک دو ایڈیٹر، چند نامہ نگار، کچھ ریڈیو آرٹسٹ۔ کچھ ادیب اور چند گرگ باراں دیدہ صُورت کے سیاسی حضرات براجمان تھے۔ چائے کا دَور چل رہا تھا۔ ایک صاحب کولڈ ٹی نوش جان فرما رہے ہیں۔ یہ کولڈ ٹی اس گرم چائے

سے مختلف ہے جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور جسے معمولی ذہانت کے انسان
پیا کرتے ہیں۔ یہ مشروب خاص لاہور کی ایجاد ہے اور دستور کے مطابق اس ایجاد
کی ماں بھی ضرورت ہے۔ وہ ضرورت پروہبشن کی وجہ سے اکثر حضرات کو پوشیدہ
امراض کی طرح لاحق ہو گئی ہے۔

دانشوروں کی اس محفل پر پوسٹ مارٹم کے کمرے کی فضا بڑی شدت سے چھائی
ہوتی ہے۔ قوم کی لاش سامنے ٹیبل پر دھری ہے اور ہر شخص اس کا کوئی نہ کوئی عضو
ہاتھ میں لیے بڑی چابکدستی کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے میں منہمک ہے۔ روحانی،
جسمانی، ایمانی اور سیاسی امراض سے لے کر خودکشی کے نفسیاتی اسباب تک بڑی
تندہی سے تشخیص ہو رہی ہے۔ علاج تجویز ہوتے ہیں۔ نسخوں پر گرما گرم بحث ہو
رہی ہے۔ میز پر مکّے پڑتے ہیں۔ کرسیاں اُلٹتے اُلٹتے بچتی ہیں ۔۔۔۔ لیکن اس
وقت کی ساری بیماریوں کا واحد علاج صرف اس چائے دانی میں ہے۔ جس میں کولڈٹی
بڑی احتیاط سے محفوظ ہے۔ کولڈٹی والے صاحب پیالی سے مُنہ لگائے مزے مزے کی
چسکیاں لے رہے ہیں اور اپنے اردگرد کف در دہن مسیحاؤں کے طوفانِ بدتمیزی کے
باوجود بڑی لاتعلقی سے داغ کی ایک عشقیہ غزل گنگنا رہے ہیں۔

"آج سینما کا پروگرام ہے؟" کولڈٹی صاحب نثار سے پوچھتے ہیں۔

"جی نہیں آج دوسرے پروگرام ہیں،" نثار میری طرف اشارہ کر کے دوسرے
کے لفظ پر خاصا زور دیتا ہے۔

"ہوں!" کولڈٹی صاحب عینک اتار کر مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے
گھورتے ہیں۔ "نثار تم نے ابھی ان کی کیا تعریف کی تھی؟ کس جگہ کے میونسپل کمشنر
ہیں یہ؟"

نثار قہقہہ لگا کر ان کی تصحیح کرتا ہے۔ "میونسپل کمشنر نہیں، بھائی یہ برخوردار ڈپٹی کمشنر

ہے، ڈپٹی کمشنر۔"

کولڈٹی صاحب قطعی مرعوب نہیں ہوتے۔ "ٹھیک ہے۔" وہ بڑے مربیانہ انداز
سے فرماتے ہیں۔ "اس نازک زمانے میں ایک آدھ ڈپٹی کمشنر کو ہاتھ میں رکھنا کوئی معیوب
بات نہیں ہے۔"

پھر وہ کمالِ شفقت کے ساتھ میری ڈھارس بندھاتے ہیں۔ "برخوردار تم بے فکر
رہو، مَیں لاہور میں تمہاری موجودگی سے پُورا پُورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔
انشاء اللہ۔"

"یہ بچہ لاہور کی زمین دوز مال گاڑیاں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔" نثار مؤدبانہ گزارش
کرتا ہے۔ "یہ ان پر کہانیاں لکھے گا۔"

"تم کہانیاں بھی لکھتے ہو؟" کولڈٹی صاحب اس انداز سے پوچھتے ہیں، جیسے
کہانیاں لکھنا کوئی بہت بڑا اخلاقی جرم ہو۔ "کہاں لکھتے ہو؟"

مَیں خجالت سے منمنا کر "نقوش"، "سویرا"، "ساقی"، "ہمایوں"، "ادبی دُنیا" وغیرہ
کے نام لیتا ہوں۔

"یہ رسالے کہاں چھپتے ہیں؟ مَیں نے تو نہیں دیکھے۔" کولڈٹی صاحب کی نظر میں میری
ادبی پوزیشن گر جاتی ہے۔ وہ اپنی عینک دوبارہ آنکھوں پر لگا لیتے ہیں اور مشفقانہ انداز
میں مجھے یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر مجھے کہانیاں لکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو شمع، ڈائرکٹر
اور چنگاری میں لکھا کروں۔ کولڈٹی کا آخری پیالہ حلق میں انڈیل کر وہ ان رسالوں پر اپنی
گراں قدر رائے کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔

اس مختصر سی علمی و ادبی بحث کے بعد جب ہم ہوٹل سے نکل کر ایک تانگے میں سوار
ہوتے ہیں تو نثار اور کولڈٹی صاحب کا تانگے والے سے تبادلۂ خیالات شروع ہو جاتا
ہے۔ تانگے والا بڑی مشتاقی سے اپنے فنونِ لطیفہ کا پرچار کرتا ہے۔

زمیندار اخبار کے عقب میں رہنے والی جو انگریزی بولتی ہے .... چوبرجی والی جس کا رنگ گورا اور بال سنہری ہیں ..... میوگارڈن والی، جو اسی سال میٹرک میں فیل ہُوئی ہے ...... گھوڑا ہسپتال کے پاس والی جو لتا منگیشکر کی طرح گاتی ہے ...... ماڈل ٹاؤن والی جو ایک ہسپتال میں نرس ہے .... لیکن نثار اور کولڈ ٹی صاحب تانگے والے کے پراپیگنڈے سے بالکل متاثر نہیں ہُوئے۔

"تم سلے باسی کڑی کا ابال ہو"، کولڈ ٹی صاحب خفا ہوتے ہیں۔ "تم سے تو مزنگ کے اڈے کے تانگے والے ہزار درجہ اچھے ہیں"

تانگے والا مزنگ کے اڈے والوں کو فصیح و بلیغ گالیاں دے کر ڈرامائی انداز سے اپنا تازہ ترین شاہکار برآمد کرتا ہے "لڑکی کیا ہے صاحب، نرا آلو بخارا ہے۔ ابھی کالج میں پڑھتی تھی۔ فقط دو مہینے سے اس لائن میں آئی ہے۔ اب تک صرف چار مرتبہ باہر گئی ہے۔ کالے خاں پٹھان نے پُورے سات سو روپے دیئے تھے۔ تمہاری خاطر سے دو سو میں منا لوں گا۔ چلوں؟"

آلو بخارا کے نام سے نثار اور کولڈ ٹی صاحب کی رال بھی ٹپکنے لگتی ہے لیکن دو سو روپے کا ذکر سُن کر ان کے جبڑے لٹک جاتے ہیں۔ وہ دونوں امید افزا نظروں سے مجھے گھُورتے ہیں۔ خاص طور پر کولڈ ٹی صاحب کے انداز بڑی شدت سے للکار رہے ہیں۔ برخوردار دیکھو میں تمھیں اپنی خدمت کا سنہری موقع دے رہا ہُوں۔ اگر تم اس وقت کام نہ آسکے تو ڈپٹی کمشنر نہیں گھسیارے ہو۔ لیکن میرے انداز ہیں کہ انھیں ترکی بہ ترکی جواب دیتے اور وہ مایوس ہو کر پھر اپنا جبڑا لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس خاموش کولڈ وار کے بعد موضوعِ سخن بدل جاتا ہے۔ تانگے والا گھوڑے کو مخاطب کر کے ہمیں بڑی سنگین اور پیچ دار گالیاں سناتا ہے۔ نثار اپنے جگری دوستوں کی تعریف کرتا ہے جو ضرورت کے وقت اس پر کئی ہزار روپیہ تک خرچ کرنے سے بھی دریغ

نہیں کرتے۔ اور کولڈ ٹی صاحب پاکستان کے جملہ افسروں کی کمینگی، نالائقی اور بد دیانتی پر جی کھول کر تبصرہ فرماتے ہیں۔ یُوں بھی رفتہ رفتہ کولڈ ٹی اپنا رنگ دکھا رہی ہے اور جب تانگے والا گھوڑے کی وساطت سے ہمیں چند الوداعی گالیاں سنا کر ہیرا منڈی میں نوگزے کی قبر کے پاس اتار دیتا ہے۔ تو کولڈ ٹی صاحب کے پاؤں بڑی شدت سے لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں اور وہ "س" کو "ش" میں بدل کر بڑی خوش سگالی سے چوک میں کھڑے ہُوتے پولیس کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہیں۔ "شو پائی جی شلام جیتے رہو"

سپاہی نتھنے پھیلا کر کولڈ ٹی کے مُنہ کو قریب سے زور لگا کر سونگھتا ہے "اچھا آج بھی خوب چڑھا رکھی ہے صاحب۔ پرمٹ کہاں ہیں؟"

کولڈ ٹی صاحب فتح مند مُرغ کی طرح چھاتی نکال کر اپنا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھاتے ہیں۔ غالبًا وہ مجھے پرمٹ کے طور پر سپاہی کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں۔ لیکن میں نظر بچا کر کھسک جاتا ہُوں اور نوگزے کی قبر کی اوٹ میں جا چھپتا ہُوں۔

مجھے غیر موجود پا کر کولڈ ٹی صاحب کی چھاتی کا تناؤ ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنی شرٹ کی جیبیں ٹٹول کر پانچ روپے کا نوٹ کانسٹیبل کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ کانسٹیبل اس پرمٹ سے مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے۔ نثار اور کولڈ ٹی صاحب کی گرمیٔ گفتار سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس وقت ان کے درمیان میری ذات کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔ وہ کچھ دیر میرا انتظار کرتے ہیں اور پھر غصّے سے ایک طرف چل پڑتے ہیں۔

نوگزے کی قبر کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے کیونکہ وہی پرمٹ والا سپاہی اب مشتبہ نگاہوں سے بار بار میرا جائزہ لے رہا ہے۔ میں واپس لوٹنے کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہُوں جہاں نثار کولڈ ٹی صاحب اور پرمٹ والے کانسٹیبل سے میرا سامنا نہ ہو۔ اس تلاش میں میں ہیرا منڈی کی بے شمار پیچ در پیچ گلیوں کے تانے بانے میں اُلجھ جاتا ہُوں۔ اس حمام میں سب

ننگے ہیں۔ گلیوں اور سڑکوں پر گشت کرتے ہوئے شائقین قدم قدم پر چیل کی طرح جھپٹتے ہوئے دلال۔ دروازوں اور دریچوں میں گڑیوں کی طرح سجی ہوئی عورتیں ...... اپنے رنگ برنگ ملبوسات کے باوجود ساری مخلوق الف ننگی ہے اور ان کے جسم اور اذہان ایک ہی بے آواز سر پر بڑی ہم آہنگی کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ فضا میں کچے گوشت کی بساند رچی ہوئی ہے۔ اور بڑی بڑی پاور کے قمقموں کا اجتماعی نور گلیوں اور سڑکوں پہ برص کے داغوں کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ یہ عورتیں جو دروازوں اور کھڑکیوں میں گردنیں لٹکائے بیٹھی ہیں۔ یکایک پھر سے اڑ جائیں گی۔ اور ابابیلوں کی طرح اپنی چونچوں میں کنکریاں اُٹھا کر ساری دنیا کو اپنے نرغے میں لے لیں گی ...... لیکن عملی طور پر کنکریوں کی جگہ میری گردن پر چھپاک سے بلغم کا ایک بڑا سا غلغہ آ گرتا ہے۔ جو ایک ادھ موئی سی عورت دریچے میں بیٹھی بڑے اطمینان سے کھنکار کھنکار کر نیچے تھوک رہی ہے۔ میں اپنی گردن کو اس غلاظت سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہوں۔ تو خدا کی خاص رحمت میری دستگیری فرماتی ہے اور ایک گلی میں مجھے مسجد نظر پڑتی ہے جس کے ایک دروازے پر کالی سیاہی سے "یا اللہ" اور دوسرے دروازے پر "یا محمدؐ" لکھا ہوا ہے۔ یہ چھوٹی سی مسجد دو بلند بالا عمارتوں کے درمیان بڑی بے کسی سے جکڑی کھڑی ہے۔ اندر پیشاب اور پاخانے کا تعفن ہے۔ ایک طرف نالی میں بیئر کی چند خالی اور شکستہ بوتلیں اوندھی پڑی ہیں۔ وضو کے لیے ایک پرانا حمام ہے جس کا پانی لعابِ دہن کی طرح کثیف ہے۔ باسی اور بڑے زور سے ہمک مارتا ہے۔ نہ جانے اس مسجد کو دیکھ کر میرے دل میں ریل کے انجن کا خیال کیوں آتا ہے، جو تیز رفتاری سے چلتا چلتا اچانک پٹڑی سے اتر گیا ہو۔

ہیرا منڈی سے بھٹکتا بھٹکتا آخر میں شاہی مسجد میں آ پہنچتا ہوں۔ اور خدا کی کھلی فضا میں اطمینان سے زور زور سے سانس لینے لگتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے بھی

مسجد کے آس پاس کئی شاندار کاریں کھڑی ہیں اور ان کے ڈرائیور ادھر اُدھر بے دلی سے بیٹھے اُونگھ رہے ہیں۔ یہ شرفاء کی موٹریں ہیں جو اپنی بیگمات سے اجازت لے کر شاہی مسجد میں آہ نیم شبی یا اقبال کے مزار پہ ہدیۂ عقیدت پیش کرنے یہاں آیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد کی چکنی سیڑھیوں پر اکثر ان کا پاؤں پھسل جاتا ہے۔ اور لڑھکتے لڑھکتے بے اختیار ہیرا منڈی کے نہاں خانوں میں جا گرتے ہیں۔ اگر اقبال زندہ ہوتا تو مسئلہ جبر و قدر کی ایک نئی تفسیر منظوم کر سکتا تھا۔

شاہی مسجد کے عین مقابل پرانے قلعے کی وہ اُونگھتی ہوئی عمارت ہے جس کے صدر دروازے پر پاکستان کا جھنڈا کسلمندی سے لہرا رہا ہے۔ اقبال کے مزار میں ایک چھوٹا سا بلب روشن ہے۔ بڑا بلب کچھ عرصہ ہوا چوری ہو گیا تھا۔ لاہور میں بجلی کے نئے بلب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کی مانگ ہیرا منڈی میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ اقبال کے مزار کو ایک چھوٹے سے بلب پر ہی قناعت شعار رہنا چاہیے۔ مزار کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگا ہوا ہے تاکہ عقیدت مند اندر گھس کر سوئچ بورڈ نہ چرا سکیں ...... باہر لان میں ہیرا منڈی کے اِکّا دُکّا دلال بھولے بھٹکے راہیوں کے لیے خضرِ راہ کا کام دینے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ایک تانگے والا دو آنے میں داتا کے دربار پہنچانے کا اعلان کرتا ہے اور میں اچک کر اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ تانگے میں ضلع جہلم کے دو مقدمہ باز بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ دن بھر مقدموں اور کچہریوں کی زحمت کے بعد وہ گھڑی دو گھڑی دل بہلانے کے لیے ہیرا منڈی آ گئے تھے اور اب حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر سلام کرنے جا رہے ہیں۔

"کرتا تو سب کچھ اللہ ہی ہے۔" ایک مقدمہ باز اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔
"لیکن بزرگوں کا سہارا بھی بڑی چیز ہوتی ہے۔"

دوسرا مقدمہ باز بھی اس نظریے کی تائید کرتا ہے۔ اور اس روحانی گفتگو کے بعد وہ دونوں سرگوشیوں میں ہیرا منڈی کے ذاتی تجربات پر تبادلۂ خیالات کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جمعرات کی وجہ سے داتا صاحب کے دربار میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور دربار کے صدر دروازے میں نثار اور کولڈ ڈی صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چُست کھڑے ہیں۔ ہجوم کے ہر ریلے کے ساتھ وہ خس و خاشاک کی طرح بہتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے واپس آ کر صدر دروازے کے عین بیچ اپنی جگہ سنبھال لیتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ ان کی نظر بچا کر اِدھر اُدھر ہو جاؤں، لیکن نثار مجھے دیکھ لیتا ہے اور زبردستی کھینچ کر اپنے پاس کھڑا کر لیتا ہے۔ کولڈ ڈی صاحب بھی میری پچھلی لغزشوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور داتا دربار کے ساتھ مسلمان عورتوں کی عقیدت مندی کے جُملہ فوائد پر عارفانہ روشنی ڈالتے ہیں۔ اپنے پروگرام کے مطابق یہ لوگ اب یہاں سے مزنگ کے اڈے پر جائیں گے اور وہاں سے زمین دوز گاڑیوں کی دوسری منزل شروع ہو گی۔ لاہور نارتھ ویسٹرن ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ یہاں کی زمین دوز مال گاڑیاں، ہر سڑک، ہر گلی، ہر کوچے میں چلتی ہیں۔ جگہ جگہ سُرخ بتیوں کے نشان ٹمٹماتے ہیں۔ لیکن ان بتیوں کے باوجود کئی گاڑیاں کانٹا بدلتے بدلتے چوک جاتی ہیں۔ اور اکثر تصادم کے حادثات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی تیز رفتار انجن چلتے چلتے پٹڑی سے اُتر جائے تو اسے پھینک نہیں دیا جاتا بلکہ اس کی پیشانی پر اللہ اور رسولؐ کا نام لکھ کر اسے مسجد کے کام پر لگا لیا جاتا ہے۔

سردار جسونت سنگھ

سردار جسونت سنگھ کے لیے حسن ابدال کی سردارنی آنند کور کی بڑی لڑکی کے متعلق نامہ و پیام شروع ہونے والا تھا۔ لیکن جسونت سنگھ نہ ہاں کرتا تھا نہ ناں اس کی وجہ سے بڑی نازک اور پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ گھر کے علاوہ ساری اہلو والیہ برادری میں اس پر کافی اضطراب تھا۔

سردار جسونت سنگھ اُوپر اپنے کمرے میں بیٹھا انگریزی موسیقی کے چند نئے ریکارڈ بجا رہا تھا۔ نیچے دالان میں سردار گوردیال سنگھ روزنامہ گورو گھنٹال کے مطالعہ میں مشغول تھے۔ سردار جسونت سنگھ کی ماں اپنے بڑے بچے کی اس بے راہ روی پر بڑا خشمگیں تبصرہ کر رہی تھیں اور کوشلیا نہایت ہمت سے کام لے کر بھائی کی وکالت کر رہی تھی۔

"بھابو جی!" کوشلیا نے اپنی ماں سے شکایت کی "آپ تو یونہی غصے میں آ جاتی ہیں۔ بھرا تا جی نے آخر کون سا ایسا جرم کر دیا ہے۔ کہ آپ اتنے دنوں سے ہاتھ دھو کر اس

کے پیچھے پڑی ہُوئی ہیں ۔"

"ہاں، ہاں جی۔ مَیں تو اس کی دشمن ہُوں نا" بھابوجی نے ڈانٹ پلائی "ایک تم ہی رہ گئی ہو اس کی ہمدرد۔ وہ جُوتے لگاؤں گی کہ مزاج درست ہو جائے گا کالے مُنہ والے کا۔"

"ہائے بھابوجی۔ کچھ تو خیال کیجیے۔ پڑھا لکھا جوان بیٹا ہے۔"

"آگ لگے ایسی پڑھائی لکھائی کو۔ خبر نہیں ولایت میں کیا کیا کالا علم سیکھ کر آیا ہے۔ مَیں نے تو پہلے کہا تھا کہ اتنے پاؤں نہ پھیلاؤ۔ لیکن تمہارے بھائیا جی پر تو ولایت کا بھُوت چڑھا ہُوا ہے۔ اب روتے رہو، آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے، ہاں۔"

"بھابوجی، آخر کونسی ایسی آفت آگئی ہے۔ شادی بیاہ کی بات ہے۔ بھراتا جی کی بات سُننے میں آخر ہرج ہی کیا ہے؟"

"مَیں نہیں جانتی کہ کیا حرج ہے اور کیا نہیں۔ اب کل کو تمہاری بات چیت ہو گی تو تم بھی بات کرنے بیٹھنا۔ بے شرم کہیں کے۔"

"اوہو۔ بس بھی کرو" سردار گوردیال سنگھ زچ ہو کر بولے۔ "مجھے ذرا اخبار تو پڑھنے دو۔"

"بس تم اخبار ہی پڑھتے رہنا۔ جیسے بڑی سردارنی بیٹھ کر تمہارا انتظار ہی تو کرتی رہے گی۔"

"نہیں انتظار کرتی، نہ کرے۔ مَیں کب ہاتھ جوڑ کر اس کے پاس گیا تھا۔"

"اے ہے، واہگورو مہاراج سے ڈرو۔ لڑکیوں والوں کے متعلق ایسی بات نہیں کیا کرتے۔ ذرا اپنی طرف بھی دیکھ۔ لاٹھ کی لاٹھ جوان بیٹی بیٹھی ہے۔ واہگورو مہاراج سے ڈر کے رہو۔"

"تم تو یونہی مغز کھاتی رہتی ہو۔"

"مَیں مغز نہ کھاؤں تو کیا کروں۔ آخر کیا کھوٹ ہے، بڑی سردارنی کی بیٹی میں؟ میموں جیسی رنگت ہے۔ ناک ہے۔ نقشہ ہے۔ روپ ہے۔ جب ملتی ہے پاؤں چھو کر ملتی ہے۔ پڑھی لکھی ہے اور پھر حسن ابدال میں آموں کے دو باغ اور تین چاہی مربع بھی اس کے نام لگے ہُوئے ہیں۔"

"لیکن شاید وہ بھراتا جی کو پسند نہ ہو۔ کوئی زبردستی تھوڑی ہے" کوشلیا نے احتجاج کیا۔

"پسند کیوں نہ ہو؟ یہ لاٹ صاحب کا بچہ اور کیا مانگتا ہے؟ کوئی میم بھی نہ لے آیا ولایت سے، ہاں" بھابوجی بڑے غصے میں تھیں۔

بھابوجی واہگورو کا شکر کرو، کہ کوئی میم ویم نہیں آگئی۔ اگر آجاتی تو ساری عمر کا رونا پیٹنا پڑا رہتا گھر میں،" کوشلیا نے کہا۔

"اب کونسی ہنسی خوشی ہے یہاں۔ میرے تو بھاگ ہی ایسے ہیں۔ بڑی سردارنی سے ناطہ ٹوٹے گا تو میرا، برادری میں تھُو تھُو تھی ہو گی تو میری۔ یہ تمہارے بھائیا جی تو جیسے نہ لینے میں ہیں نہ دینے میں" بھابوجی نے اب سردار گوردیال سنگھ کی طرف توجہ مبذول کر لی۔ وہ بدستور روزنامہ "گوردگھنٹال" کے مطالعہ میں منہمک تھے۔ آج کے پرچے میں شرومنی اکالی دَل، گوردوارے پربندھک کمیٹی اور . . . . . . کی سیاسی کارروائیوں پر بڑی گرماگرم بحث تھی۔

سردار جسونت سنگھ کی ماں نے جب دیکھا کہ اس کے الفاظ کی سختی یا نرمی سے سردار گوردیال سنگھ کے کان پر جُوں تک بھی نہیں رینگی۔ تو اس نے حسبِ معمول اپنا آخری حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا جو خاص ایسے نازک موقعوں کے لیے محفوظ رہتا تھا۔ اپنی قسمت کی خرابی، اولاد کی ناخلفی اور خاوند کی ظالمانہ بے توجہی پر پنجابی زبان کے مخصوص محاوروں، بندشوں اور ترکیبوں کے ساتھ اس کی آنکھوں سے موٹے

موٹے آنسو بھی گرنے لگے۔

سردار گوردیال سنگھ بدستور اخبار "گورو گھنٹال" کے مطالعہ میں مصروف رہے۔ اور جب ان کی بیوی کی گریہ وزاری نے ایک مستقل ہچکی کا رنگ اختیار کر لیا تو اپنے معمول کے مطابق انھوں نے اخبار کو تہہ کر کے تکیے کے نیچے رکھا۔ عینک اتار کر چمڑے کے کیس میں حفاظت سے بند کی۔ اور چارپائی پر اکڑوں بیٹھ کر اپنی زوجۂ محترمہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"میں نے کہا بھاگوان یہ کیا ٹنٹا ہے؟"

"ہاں جی، میری تو ہر بات ٹنٹا ہوتی ہے" بھابو جی نے تنک کر کہا "تم اخبار پڑھتے رہو۔ تمھیں کیا واسطہ گھر بار سے۔"

سردار گوردیال سنگھ مسکرائے "بھاگوان، گھر بار تو سب تمھارا ہے، مجھے اس کی فکر کیوں ہو۔ ہاں، اب بتاؤ بات کیا ہے۔"

"ہائے ہائے۔ ابھی تک کوئی بات ہی نہیں ہوئی؟ جیسے کچھ سنا ہی نہیں تم نے"

"سُن تو لیا۔ لیکن اگر لڑکا راضی نہ ہو تو بھاگوان تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"ہائے جی، تم کچھ نہیں کر سکتے؟ پاؤں سے کھول کر دس جوتے لگا دو تو وہ کالے منہ والا اپنے آپ سیدھا ہو جائے گا۔"

کوشلیا اب تک خاموش بیٹھی تھی۔ جسونت سنگھ کے بارے میں یہ تجویز سُن کر وہ گھبرا گئی اور سردار گوردیال سنگھ سے کہنے لگی "دیکھو نا بھائیا جی! یہ بھابو جی کیا کیا باتیں کرتی ہے۔ بھلا بھرا تا جی کو مارتے آپ اچھے لگتے ہیں؟"

سردار گوردیال سنگھ کو یہ منظور نہ تھا کسی وقت ان کی اولاد کو خیال بھی آتے کہ وہ اپنے والد بزرگوار کے جوتوں کی زد سے باہر ہیں۔ اس لیے انھوں نے کوشلیا کو ذرا سختی سے جھڑک دیا "کوشلیا بیٹی۔ ڈنڈا استاد ہے بگڑیاں تگڑیاں دا! دیکھنا

کہیں تمھارا بھرا تا جی اس خیال میں نہ رہے، کہ اس کے منہ پر دو بال اُگ آئے ہیں، تو میرے جوتوں کے تلے بھی بے کار ہو گئے ہیں۔"

"ہاں جی، ذرا دیکھو" بھابو جی نے لقمہ دیا "اب یہ بھی بیچ میں بولنے لگی ہے، بڑی آئی ہے بھائی کی وکیل بن کر۔ میں کہتی ہوں اس کا نام بھی کالج سے کٹوا لو۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں سر پکڑ کر رونا پڑے، ہاں۔"

"ابھی چھوڑو اس بک بک کو" سردار گوردیال سنگھ تعلیم کے سلسلے میں بڑے روشن خیال باپ تھے "تم بھی کیا گنواروں ایسی باتیں کرنے لگتی ہو۔ آخر کچھ بتاؤ تو سہی، کہ جسونت کہتا کیا ہے؟"

"میں کیا بتاؤں؟ میں تو گنوار ہوئی نا" بھابو جی نے نخرہ کیا۔

"تمھارے سامنے بیٹھی ہے پڑھی لکھی لاڈلی۔ اسی سے کیوں نہ پوچھ لو"

"کوشلیا بیٹی تمھاری بھابو کا تو سر پھر گیا ہے تمھیں کچھ معلوم ہے کہ آخر جسونت سنگھ کا خیال کیا ہے؟"

"بھائیا جی" کوشلیا نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے، ڈرتے ڈرتے ہچکچاتے ہچکچاتے کہا "بھرا تا جی کہتے ہیں کہ نہ میں لڑکی کو اچھی طرح جانتا ہوں نہ لڑکی مجھ سے پوری طرح واقف ہے۔ میں اس شادی کی حامی کیسے بھروں۔"

اس ناڈھو خاں کے سلسلے کو ایسی لڑکی کہاں سے ملے گی جیسے وہ اندر باہر سے خوب جانتا ہو؟ سنتی ہو کوشلیا کی بھابو۔ یہ تمھارا لال کیسی منطق بگھارنے لگا"

سردار گوردیال کو اپنے بیٹے کی اس بات پر بڑا غصہ آیا۔

"میں تو کب سے اپنا سر پیٹ رہی ہوں۔ لیکن تم ہو کہ کوئی بات مزاج میں ہی نہیں لاتے۔ میں کہتی ہوں کہ دس جوتے لگا دو تو سارے بل نکل جائیں گے۔"

"بھائیا جی" کوشلیا نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی "اس میں غصہ کھانے

کی کیا بات ہے بھلا؟ بھراتا جی کہتے ہیں کہ ولایت میں کورٹ شپ کا جو رواج ......"

یکایک فضا میں ایک پٹاخہ سا چھٹا۔ اور سوداگر گوردیال سنگھ سانپ کی طرح پھنکار کر کھڑے ہو گئے۔ یہ انداز اس بات کی تمہید تھے کہ اب سردار گوردیال سنگھ اپنے ایام تحصیلداری کے تجربات کا نچوڑ کام میں لانے والے ہیں۔ پہلے انھوں نے کھڑے ہو کر ولایت اور ولایت والوں کے متعلق بڑے شدید خیالات کا اظہار کیا۔ پھر جسونت سنگھ کی ماں کی سات پشتوں کو بڑے وسیع پیمانہ پر گالیاں دیں اور اس کے بعد جوتا ہاتھ میں لے کر وہ جسونت سنگھ کے کمرے کی طرف لپکے۔ عین اس وقت باہر گلی میں موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی پھٹ پھٹاہٹ سُنائی دی اور جسونت سنگھ جو اُوپر اپنے کمرے میں بیٹھا ساری کارروائی کا جائزہ لے رہا تھا، موقعہ کی نزاکت بھانپ کر فرار ہو گیا۔ اب بھائیاجی اور بھابوجی کی مجموعی توجہ غریب کوشلیا کی طرف رجوع ہو گئی۔ ان دونوں نے مِل کر کوشلیا کو بڑے آڑے ہاتھوں لیا۔ اور ان کے غصّے کی تان آخر اس فیصلے پر آ کے ٹوٹی کہ کوشلیا کا نام کالج سے کٹوا دیا جائے۔ تاکہ کل کلاں جب اس کے رشتے کی بات چیت شروع ہو تو کہیں وہ بھی اپنے بھائی کے نقش قدم پر چل کر کورٹ شپ کا سوال نہ اُٹھائے۔

"خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے بھاگوان"، سردار گوردیال سنگھ نے اپنی اہلیہ محترمہ سے اتفاق کیا۔ "اس سے تو تم جیسی گنوار عورت ہی اچھی۔"

"ہاں جی، ہاں! مَیں تو گنوار ہوں نا، بس بیٹھے رہو ڈھکے ہُوئے۔ اپنی اوقات سے بڑھنا اچھا نہیں ہوتا۔ اب دیکھ لو اپنی اولاد کے لچھن۔ ساری اہلوو الیہ برادری میں ناک نہ کٹ گئی۔ تو دیکھنا، ہاں۔"

"بس اب یہ ٹر ٹر بند بھی کرو۔ مَیں نہیں ڈرتا سالی برادری سے۔ رہی جسونت سنگھ کی بات۔ مَیں جوتے مار مار کر اسے تکلے کی طرح سیدھا کر لوُں گا۔ ایک گلاس ٹھنڈی

لسی کا پلاؤ۔ برف منگوا لینا بازار سے۔"

سردار گوردیال سنگھ نے لسی پی کر اپنا غصّہ ٹھنڈا کیا۔ بھابوجی نے تازہ مکھن کا پھاہا تالو پر رکھا۔ کوشلیا اپنے کمرے میں بستر پر پڑی ساری رات روتی رہی۔ جسونت سنگھ گورڈن کالج کے ہوسٹل میں ترلوچن سنگھ کے کمرے میں بیٹھا اپنی کورٹ شپ کا لائحہ عمل مرتّب کرتا رہا۔

سردار جسونت سنگھ کو حسن ابدال کی سردارنی کی بڑی لڑکی کوئی خاص ناپسند نہ تھی۔ ولایت جانے سے پہلے اگر یہ پیام آتا تو غالبًا وہ خوشی سے پاگل ہو جاتا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر گوردوارے کے صحن میں سر کے بل کھڑا ہو کر بکرے بلاتا...... لیکن اب اصولی طور پر وہ اس رشتے کو ایک بے زبان جانور کی طرح چپ چاپ قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ولایت میں کورٹ شپ کی رسم نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اسی اثر کے تحت اسی نے اپنی بہن کوشلیا اور ترلوچن سنگھ کے عشق میں بڑا مہذّبانہ دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنے لیے بھی وہ اس بات کا متمنّی تھا کہ شادی سے پہلے وہ اپنی منتخب لڑکی کے ساتھ کچھ عرصہ کورٹ شپ کرے۔ آج گھر میں اپنے بھائیاجی اور بھابوجی کے ذہنی اور جسمانی انداز دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا، کہ چاہے وہ سیدھی طرح مانے یا اُلٹی طرح، اگر اس کی شادی ہوگی تو حسن ابدال کی بڑی سردارنی کے گھر ہو کر رہے گی۔ بھائیاجی کو اگر کورٹ شپ والی شرط معلوم نہ ہوتی، شاید وہ اس شادی پر زیادہ زور نہ دیتے لیکن بھابوجی کے سر پر جو آموں کے دو باغات اور تین چاہی مربعوں کا بھُوت سوار تھا۔ اس کے اترنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

اپنی مجبوریوں کے اس ماحول میں سردار جسونت سنگھ کو روشنی کی صرف ایک کرن نظر آتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ حسن ابدال کی بڑی سردارنی کے ہاں چار لڑکیاں ہونے کی وجہ سے اس کا دائرۂ انتخاب کافی وسیع ہونے کے امکانات تھے۔ اگرچہ ابھی

بات چیت صرف بڑی لڑکی کے متعلق چلی تھی۔ لیکن اسے یقین تھا کہ اگر اس کی نظرِ انتخاب پھسلنے پر آمادہ ہوئی تو پہلی سے دوسری، دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی لڑکی پر کہیں نہ کہیں ضرور اٹک جائے گی۔ اسے انگریزی کا ایک مقولہ یاد آیا جو اُس نے لندن میں سوہو کے ایک ریستوران میں کسی سے سنا تھا۔ . . . . . "اگر تمہارے سامنے ایک لڑکی ہے تو تم اپنا دل کھو بیٹھو گے۔ اگر تمہارے سامنے دو لڑکیاں ہیں تو تمہارے دل اور دماغ دونوں کھو جائیں گے۔ اگر تین لڑکیاں ہیں تو جان کی بھی خیر نہیں"

"میرے یار" سردار جسونت سنگھ نے ترلوچن سنگھ کے کندھے پر ہاتھ مار کے کہا "یہاں پر تو ایک ساتھ چار چار ہیں۔ بس یہ سمجھو کہ اب میرے دل و دماغ، کلیجی، پھیپھڑے اور گردوں کی بھی خیر نہیں"

ان سب CALCULATION کے بعد سردار جسونت سنگھ نے حسن ابدال کی بڑی سردارنی کی بڑی لڑکی کے نام انگریزی میں ایک FORMAL خط لکھا:

محترم خاتون!

"آپ کے اور میرے خاندانوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نظامِ عالم کو برقرار رکھنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ان کا رابطہ ایک شادی سے مستحکم کیا جائے۔ اس خدمت کے لیے انھوں نے آپ کو اور مجھے منتخب کیا ہے۔ اصولی طور پر میں ARRANGED شادیوں کے حق میں نہیں۔ اگر اعلیٰ تعلیم نے آپ پر کچھ اثر کیا ہے تو غالباً آپ کا بھی یہی خیال ہوگا۔

کورٹ شپ کے ایک لفظ نے ہمارے گھرانے میں کہرام مچا دیا ہے۔ میں آپ کو یہ لفظ دہرانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ مبادا کہ آپ کی والدہ محترمہ پر بھی وہی ذہنی اور اعصابی ردِ عمل ہو جو میرے بزرگ والدین پر گزر چکا ہے۔

اگر آپ اسے نامناسب نہ سمجھیں تو ہم کچھ عرصہ آپس میں خط و کتابت کر کے کورٹ شپ کا نعم البدل پا سکتے ہیں۔ اگر میں آپ کی دائمی رفاقت کا اعزاز حاصل نہ کر سکوں تو براہ مہربانی مجھے اپنی چھوٹی بہنوں کے ساتھ قسمت آزمائی کا موقع عطا فرمائیے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ نظامِ عالم کی سلامتی کے لیے یہ نہایت ضروری نظر آتا ہے کہ ہمارے معزز خاندان آپس میں شادی کی زنجیر کے ذریعے مستحکم ہو جائیں۔ اس زنجیر کی ایک کڑی یہ خاکسار ہے۔ دوسری کڑی فراہم کرنے کے لیے آپ چاروں میں سے ایک کو اپنی قربانی دینا ہوگی"

خدا حافظ

آپ کا وفادار

جسونت سنگھ

سُرخ فیتہ

سیکرٹری :۔ میرے خیال میں کارروائی شروع ہونی چاہیے۔ ویل، سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ کیس کو وضاحت سے بیان فرمائیے۔

سپرنٹنڈنٹ :۔ یس سر، یس سر! جناب کو غالباً یاد ہوگا کہ جب ٹائپسٹ کلرک مس سلیمہ کی تقرری زیرِ غور تھی، تو خاکسار نے بصد ادب و احترام عرض کیا تھا کہ شاید یہ تجربہ مہنگا پڑے۔ ذاتی طور پر یہ تابعدار آزادیٔ نسواں کا مخالف نہیں بلکہ مَیں نے ہفتہ وار "جلترنگ" اور ماہنامہ "پروانہ" میں حقوقِ نسواں پر بڑے معرکے کے مضامین لکھے ہیں۔ اگر جناب والا ارشاد فرمائیں تو ان کے تراشے پیش کروں۔ اتفاق سے میری جیب میں چلے آئے ہیں۔

جائنٹ سیکرٹری :۔ یہ بات موضوع سے دُور ہے۔ آپ محض کیس بیان کیجیے۔

سپرنٹنڈنٹ :۔ یس سر، جی ہاں۔ مَیں گزارش کر رہا تھا۔ کہ ذاتی طور پر خاکسار آزادیٔ نسواں کا مخالف نہیں۔ لیکن اصولی طور پر دولتِ خداداد پاکستان میں....

سیکرٹری: آپ اصولی بحثوں سے برکنار رہنے کی کوشش کیجیے۔ ہم صرف کیس سننا چاہتے ہیں۔

اسسٹنٹ سیکرٹری: اور جناب اس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں عورتوں کا تناسب بحوالہ سرکلر نمبر ۲۵۳۴ الف مورخہ ۱۹ ر دسمبر ۱۹۴۴ء مقرر ہو چکا ہے۔ اب اس موضوع پر کسی قسم کی اصولی بحث کرنا غیر مناسب ہے۔ اگر جناب ضروری خیال فرمائیں تو سرکلر مذکورہ پیش کیا جائے۔

انڈر سیکرٹری: میرے خیال میں سرکلر پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایسا اہم سرکلر تو سب کو ازبر ہونا چاہیے۔ افسوس تو یہ ہے کہ حکومت کے احکام پر مناسب عمل نہیں کیا جاتا۔ ورنہ اب تک دفتروں میں حسین چہروں،۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، صنفِ نازک کو اپنا جائز حصّہ مل چکا ہوتا۔ جناب! میں سمجھتا ہُوں کہ پیشِ نظر کیس کی سماعت کے وقت مس سلیمہ کو بھی اس میٹنگ میں موجود ہونا چاہیے۔ اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو اُسے بلا بھیجا جائے؟

ڈپٹی سیکرٹری: انڈر سیکرٹری کی رائے نہایت معقول ہے۔ قانونی لحاظ سے اس کیس سے متعلقہ سب لوگوں کو یہاں موجود ہونے کا حق پہنچتا ہے۔

جائنٹ سیکرٹری: یہ دلیل بعید از موضوع ہے ہم ایک محکمانہ معاملے پر غور کر رہے ہیں اور محکمانہ کارروائیاں عدالتی اصولوں کی پابند نہیں ہیں۔

سیکرٹری: میرا رجحان بھی جائنٹ سیکرٹری کی رائے سے متفق ہونے کی طرف آمادہ ہے۔ ویل سپرنٹنڈنٹ صاحب بیان جاری رکھیے۔

سپرنٹنڈنٹ: جناب! غلام گزارش کر رہا ہے کہ خاکسار کی مؤدبانہ گزارشات کے باوجود جب مس سلیمہ کی تقرری منظور ہو گئی، تو میں نے عرض کی تھی کہ کم از کم اسے میرے سیکشن میں تعینات نہ کیا جائے۔ حضور جانتے ہیں کہ میرے سیکشن میں پہلے ہی سے عجیب عجیب

مخلوط عناصر بھرے ہُوئے ہیں۔ جو کام کی نسبت باتیں اور جھگڑے زیادہ کرتے ہیں۔ مثلاً ناصر علی میرؔ، جو ہونے کو تو بل کلرک ہے لیکن اندر ہی اندر شاعر بھی ہے۔ اور فائلوں پہ اپنی نظموں کی مشق کرنے کا عادی ہے۔ کبھی ہتھوڑے پر نظم، کبھی درانتی پر غزل، کبھی سڑک کوٹنے والے انجن کی شان میں قصیدہ۔ اللہ اللہ! یہ بھی کیا زمانہ آیا، حضور! ورنہ شاعری جیسی صنفِ لطیف کو ان بھونڈے مضامین سے کیا واسطہ؟ وہ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے فرمایا ہے ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں۔۔۔۔۔

جائنٹ سیکرٹری: براہِ مہربانی آپ شاعری سے ہٹ کر کیس پر رہیے۔

سیکرٹری: مجھے اس بات سے قطعی اتفاق ہے، ویل؟

سپرنٹنڈنٹ: اور جناب میرے سیکشن میں ناصر علی میرؔ کے علاوہ وہ خبطی سودائی نصرت اللہ خیال بھی ہے جو اپنے آپ کو دورِ حاضرہ کا بہترین نثر نگار سمجھتا ہے۔ اور۔۔۔۔۔۔۔

انڈر سیکرٹری: میرے خیال میں آپ اپنے سیکشن کا تجزیہ کرنے کی بجائے مس سلیمہ کے متعلق باتیں کرتے جائیں تو بہتر ہوگا۔

ڈپٹی سیکرٹری: انڈر سیکرٹری کا مطلب ہے کہ آپ اپنی گفتگو کو کیس کے موضوع سے بہت دُور نہ جانے دیجیے۔ مجھے اس خیال سے پُورا اتفاق ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: جی ہاں۔ بے شک۔ میں عرض کر رہا تھا کہ میرے سیکشن میں پہلے ہی سے مخلوط العناصر مخلوق کی کھچڑی پکی ہُوئی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ مس سلیمہ بھی پوسٹ ہُوئی تو اسی سیکشن میں۔ میرے ناچیز خیال میں تنظیمی لحاظ سے یہ ایک غلطی تھی۔

اسسٹنٹ سیکرٹری: حکومت کے منظور شدہ احکامات پر نکتہ چینی کرنے سے سپرنٹنڈنٹ کو باز رہنا چاہیے۔

سپرنٹنڈنٹ: جی ہاں، بہت خوب۔ مَیں معافی چاہتا ہُوں۔ چنانچہ جناب عالی مس سلیمہ کے آنے پر میرے سیکشن میں گڑبڑ اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور باوجودیکہ ......

اسسٹنٹ سیکرٹری: کیا مطلب؟ کہ آپ کے سیکشن میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ موجود تھی؟ تنظیمی لحاظ سے یہ احتمال قابلِ غور ہے۔

انڈر سیکرٹری: میرے خیال میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کو ایڈمنسٹریشن کا خاطر خواہ تجربہ نہیں۔ کسی سیکشن میں گڑبڑ کا احتمال تک قابلِ گرفت ہونا چاہیے۔ چہ جائیکہ گڑبڑ ہو اور پھر ہمیشہ سے ہو۔

ڈپٹی سیکرٹری: سپرنٹنڈنٹ صاحب، یہ فرمائیے کہ آپ اس پوسٹ پر کب سے مقرر ہیں؟ اور آپ کی سروس اور پچھلے تجربات کیا ہیں؟

سپرنٹنڈنٹ: جی حضور، مَیں معافی کا خواستگار ہُوں۔ دراصل میری گزارش کا مطلب یہ تھا، کہ ....

ڈپٹی سیکرٹری: آپ اپنا مطلب چھوڑیئے اور فی الحال میرے سوالوں کا جواب دیجیے۔

سپرنٹنڈنٹ: جناب عالی، خاکسار نے ۱۹۲۵ء میں آگرہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ حسنِ اتفاق سے اسی سال مسٹر جان ایٹن صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ ہوم ڈیپارٹمنٹ حکومتِ ہند اپنی میم صاحبہ کے ہمراہ تاج محل کی زیارت کرنے آگرہ تشریف لاتے۔ خدائے ذوالجلال دونوں کو غریقِ رحمت کرے۔ بڑی خوبیوں کے لوگ تھے۔ حسنِ سیرت سے مالا مال، رحم دل، غریب پرور، تاج محل کے باہر ان کے تانگے کا گھوڑا بدکنے لگا۔ مَیں کلو پنواڑی کی دکان کے سامنے بیٹھا بیڑی سلگا رہا تھا۔ اِن دِنوں کلو پنواڑی کی دکان تاج محل کے عین سامنے والے ....

جائنٹ سیکرٹری: مجھے شک ہے کہ انتظامی نااہلیت کے علاوہ اس سپرنٹنڈنٹ کو ضرورت سے زیادہ باتیں کرنے کا بھی مرض ہے۔ یہ دونوں نہایت سنگین نقائص ہیں۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی بنیادوں کو اس قسم کی نااہلیت اور بانونیت پر استوار کیا جاسکتا ہے تو یقیناً ہم جنت الحمقا میں رہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سپرنٹنڈنٹ کی اہلیت کا جائزہ لینے کے لیے مکمل انکوائری کی ضرورت ہے۔

سیکرٹری: مجھے اس رائے سے حرف بحرف اتفاق ہے۔ نااہلیت کو دیدہ و دانستہ برداشت کرنا قومی غدّاری کے مترادف ہے۔ ویل، سپرنٹنڈنٹ صاحب، آپ جاسکتے ہیں، یہ فائل یہیں چھوڑ جائیے۔

(سپرنٹنڈنٹ جاتا ہے)

سیکرٹری: میرے خیال میں اس سپرنٹنڈنٹ کے کام، تجربے اور دیگر کوالی فیکیشنز کا جائزہ لینے کے بعد میرے پاس ایک مفصل نوٹ پیش ہونا چاہیے۔

جائنٹ سیکرٹری: (ڈپٹی سیکرٹری سے) آپ اس کام پر اپنی خاص توجہ صرف کیجیے۔

ڈپٹی سیکرٹری: (انڈر سیکرٹری سے) آپ اس انکوائری کو اپنی ذاتی نگرانی میں نہایت احتیاط کے ساتھ منعقد کریں۔

انڈر سیکرٹری: (اسسٹنٹ سیکرٹری سے) اگر اس معاملے میں آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے تو بلاتکلف مجھے بتا دیجیے گا۔

اسسٹنٹ سیکرٹری: بہت خوب۔ کیا اب مس سلیمہ کا کیس آگے بیان کیا جائے؟

انڈر سیکرٹری: شاید یہ بہتر ہوگا کہ سپرنٹنڈنٹ کی غیر موجودگی میں کیس پر روشنی ڈالنے کے لیے مس سلیمہ کو یہاں بلا لیا جائے؟

جائنٹ سیکرٹری: جیسا کہ فیصلہ ہوچکا ہے۔ مس سلیمہ کو اس میٹنگ میں بلانے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اسسٹنٹ سیکرٹری فائل سے کیس پر روشنی

ڈال سکتا ہے۔

سیکرٹری: میں جائنٹ سیکرٹری کی رائے کے ساتھ اپنے اتفاق کو دہراتا ہوں۔ ویل، ویل۔ کیس بیان ہو۔

اسسٹنٹ سیکرٹری: جناب، شکایت کا لب لباب یہ ہے کہ بل کلرک ناصر علی میر، جو اندر ہی اندر شاعر بھی ہے، دفتر میں بیٹھ کر اپنی نظمیں گنگنانے کا عادی ہے۔ اس کی ایک نظم پر سپرنٹنڈنٹ صاحب کو شدید اعتراض ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس نظم کے پہلے حصے میں سلیمہ کی طرف رومانی اشارات ہیں اور یہ ایک اخلاقی جرم ہے، دوسرے حصے میں حکومت پر حملہ ہے، جو ایک قانونی جرم ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک ادبی جرم یہ ہے کہ نظم سر سے پاؤں تک بے قافیہ اور بے ردیف ہے۔

ڈپٹی سیکرٹری: جہاں تک سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ادبی اعتراضات کا تعلق ہے۔ انھیں موضوعِ بحث سے الگ رکھنا چاہیے۔

انڈر سیکرٹری: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مس سلیمہ کے متعلق رومانی اشارات منظوم کرنا بھی کوئی جرم نہیں۔ البتہ اگر مس سلیمہ کو خود کوئی وجہ شکایت ہو تو دوسری بات ہے۔ اس لیے شروع ہی سے میرا یہ خیال رہا ہے کہ مس سلیمہ کی رائے معلوم کرنے کے لیے اسے اس میٹنگ میں بلانا حد درجہ مناسب ہوگا۔

جائنٹ سیکرٹری: مجھے افسوس ہے کہ ہم پیش از مرگ واویلا کر رہے ہیں۔ نظم سننے سے پہلے اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا ایک مہمل سی بات ہے۔

سیکرٹری: بالکل ٹھیک۔ میری رائے کا پلہ بھی اسی طرف جھکنے کی طرف مائل ہے۔ ویل اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب، آپ نظم بیان فرمائیے۔

اسسٹنٹ سیکرٹری: جناب نظم کا عنوان ہے "سُرخ فیتہ"

عرض کیا ہے:

تُو نے جب کھایا پان!
تیرے ہونٹوں پہ لگا فیتۂ سُرخ!
جانِ جاں
جانِ جہاں
تیری آنکھوں میں گلابی ڈورے
تیرے گالوں پہ وہ غازے کی بہار
تیرے حلقوم کی شہ رگ میں مچلتا سا، چھلکتا سا، لہکتا سا ہُوا گرم لہو
تیری شلوار پہ ریشم کا رِبن
تیرے پرپیچ غرارے پہ گلابی سی عنابی سی کشیدہ کاری ہیہات!
تجھ پہ موقوف ہے کیا؟
جانِ جاں ——— جانِ جہاں
سُرخ فیتے میں بندھی رہتی ہے سرکار میری!
اس میں حاکم بھی محکوم بھی ہیں۔
اس کے ہر پیچ میں پوشیدہ ہے اک دار و رسن۔
اس کے پھندے میں لٹکتی ہے، مٹکتی ہے، جھٹکتی ہے ادا پھانسی کی جس میں
سر ڈال کے، آہ
مر گئی فائل میری!

انڈر سیکرٹری: واہ وا، واہ وا، سبحان اللہ۔ کیا خوب کہا ہے ظالم نے واہ وا،

ڈپٹی سیکرٹری: بہت خوب، بہت خوب، جیسے ن۔م راشد کا کلام۔

انڈر سیکرٹری: میرے خیال میں فیض کا رنگ بھی غالب ہے۔ تیری آنکھوں میں گلابی ڈورے،

تیری گالوں پہ وہ غازے کی بہار۔ واہ وا، واہ وا۔

ڈپٹی سیکرٹری: کچھ کچھ میراجی کا اثر بھی نمایاں ہے۔

ترے حلقوم کی شہ رگ ہیں مچلتا سا، چھلکتا سا، لہکتا سا، ہُوا گرم لہو! آہا اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

جائنٹ سیکرٹری: کیا آپ صاحبان داد دے چکے؟

انڈر سیکرٹری: اجی صاحب، ہم کیا اور ہماری داد کیا۔ مَیں نے کہا آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے دفاتر کی گدڑیوں میں کیسے کیسے لال پوشیدہ ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ جب تک حکومت خود ان گنج ہائے گرانمایہ کو تلاش کرکے ......

جائنٹ سیکرٹری: مجھے ڈر ہے کہ یہ محکمانہ کارروائی مجلس مشاعرہ کی صُورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

سیکرٹری:۔ مَیں خود بھی محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہُوں صاحبان، ہمیں سنجیدگی کا دامن پکڑنا چاہیے۔ اس کے بغیر امورِ سلطنت بعنوان شائستہ طے نہیں کیے جا سکتے۔

انڈر سیکرٹری: ڈپٹی سیکرٹری! بہت خوب، جناب۔

سیکرٹری: ویل۔ اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب۔

اسسٹنٹ سیکرٹری: جناب! سپرنٹنڈنٹ صاحب کو شکایت ہے کہ اس نظم کے پہلے آٹھ مصرعوں میں مس سلیمہ پر اشارات ہیں۔ اور باقی حصے میں سرکار والا مدار کے نظامِ کارکردگی کی شان میں گستاخی ہے۔

انڈر سیکرٹری: کیا اس نظم میں کسی جگہ مس سلیمہ کا نام آیا ہے؟

اسسٹنٹ سیکرٹری:۔ جی نہیں تو،

انڈر سیکرٹری: اس صُورت میں یہ شکایات بے بنیاد ہیں۔

ڈپٹی سیکرٹری: اور اگر مس سلیمہ کو یہ خوش فہمی ہے کہ نظموں میں اس کے سوا اور کسی خوبصورت لڑکی کا ذکر نہیں ہو سکتا تو اس وہم کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔

انڈر سیکرٹری: اس کے علاوہ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اشارہ مس سلیمہ کی طرف ہے تو پہلے ہمیں ان امور پر تحقیقات کرنا ہوگی کہ کیا وہ پان کھاتی ہے؟ کیا پان کھانے کے بعد اس کے ہونٹوں پر سُرخ فیتے سے لہرانے لگتے ہیں؟ کیا اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ہیں؟ کیا اس کے گالوں پر غازے کی بہار رہتی ہے؟ کیا وہ ایسی شلوار پہنتی ہے جس کے پائنچوں پر سُرخ ربن لگا ہو؟ کیا اس کے غرارے پر سُرخ ریشم کے پھُول ہوتے ہیں؟ جناب عالی، مَیں بصد ادب و احترام گزارش کروں گا، کہ جب تک ہم مس سلیمہ کو سامنے بٹھا کے ان امور کا مفصل جائزہ نہ لیں۔ ہماری انکوائری پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ کم از کم انصاف کا تقاضہ تو یہی ہے۔

ڈپٹی سیکرٹری:۔ بالکل درست۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے دفاتر میں مس سلیمہ کے علاوہ اور بھی ایسی لڑکیاں ہوں جو پان کھاتی ہوں۔ جن کے گالوں پہ غازے کی بہار ہو۔ جن کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ہوں۔

جائنٹ سیکرٹری: مجھے اس نکتے سے معقولیت کی بُو آتی ہے۔

سیکرٹری: میرا خیال ہے کہ مَیں بھی یہی سُونگھ رہا ہُوں۔

انڈر سیکرٹری: جناب! اس صورت میں مَیں یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت کروں گا کہ مزید انکوائری کے لیے ایک بین الوزارتی میٹنگ منعقد کی جائے اور اس میں سب محکموں میں کام کرنے والی لڑکیوں کو بھی طلب کیا جائے۔

جائنٹ سیکرٹری: مَیں سمجھتا ہُوں کہ اس کی ابھی چنداں ضرورت نہیں، لیکن جناب، جو خیال مجھے دق کر رہا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ نظم

مس سلیمہ یا کسی اور دفتری لڑکی کے متعلق ہے تو کیا ہم کسی قسم کا ایکشن لینے کے مجاز ہوں گے؟

اسسٹنٹ سیکرٹری: جناب! کیس کے اس پہلو پر فی الحال غور نہیں کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ انکوائری مکمل ہونے کے بعد ایکشن تجویز کرنا کوئی کام نہ ہوگا۔

سیکرٹری: بہت خوب! آپ گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنے کے شوقین نظر آتے ہیں۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ اس کیس پر ابتدائی کارروائی کا ذمہ دار کون ہے؟

اسسٹنٹ سیکرٹری: جناب، ابتدائی کارروائی اس خاکسار نے مکمل کی تھی۔

سیکرٹری: مجھے نہایت افسوس سے یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ آپ نے اس قسم کا مبہم اور ناپختہ کیس ایجنڈا پر رکھ کر ہم سب کا وقت ضائع کیا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت کے قیمتی وقت کو یوں ضائع کر کے آپ ملک اور قوم کی خدمت سرانجام فرما رہے ہیں تو بے شک آپ کسی شدید مجرمانہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمیں آپ کی صلاحیتوں کا از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا۔ اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب، آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ یہ فائل یہیں چھوڑ جائیے۔

(اسسٹنٹ سیکرٹری جاتا ہے)

سیکرٹری: (جائنٹ سیکرٹری سے) آپ اسسٹنٹ سیکرٹری کی صلاحیتوں کا بغور جائزہ لے کر مجھے ایک تفصیلی نوٹ عطا فرمائیں تو مشکور ہوں گا۔

جائنٹ سیکرٹری:۔ (ڈپٹی سیکرٹری سے) آپ اس کام پر اپنی خاص توجہ صرف کیجیے۔

ڈپٹی سیکرٹری: (انڈر سیکرٹری سے) اگر آپ کو کسی پوائنٹ پر میری مدد کی ضرورت محسوس ہو تو بلا تکلف فرما دیجیے گا؟

انڈر سیکرٹری:۔ بہت خوب، جناب! کیا اب مس سلیمہ کا کیس مزید بیان کیا جائے؟

جائنٹ سیکرٹری: میں سمجھتا ہوں کہ یہ ناپختہ کیس محض تضیعِ اوقات ہے۔ میری رائے میں اسے داخل دفتر کر دینا چاہیے۔

سیکرٹری: میں محسوس کرتا ہوں کہ میری رائے کا پلہ بھی اس تجویز کے حق میں جھکاؤ کی طرف مائل ہونے پر آمادہ ہے . . . . ''

ایک ڈسپیچ

جب رابرٹ لانگ بمبئی کے کسٹم ہاؤس سے باہر نکلا، تو ٹیکسی ڈرائیوروں کا ایک غول بیابانی اس پر جھپٹا۔ لیکن وہ اچک کر سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک خالی وکٹوریہ میں سوار ہو گیا۔ وکٹوریہ کی چھت اتری ہوئی تھی۔ اور گھوڑا اور کوچبان دونوں مزے مزے کے خرّاٹے لے رہے تھے۔ گھوڑے کے سر پر ایک کوا بیٹھا اس کے دونوں کانوں میں باری باری سے ٹھونگیں مار رہا تھا۔ مکھیوں کا ایک چھتّہ کوچبان کے مُنہ پر منڈلا رہا تھا۔ کچھ مکھیاں اس کے نتھنوں اور نیم وا دہانے میں بے تکلفی سے مصروفِ سیاحت تھیں۔ رابرٹ لانگ کے سوار ہونے پر گاڑی کو دھکا لگا اور گھوڑا اور گھوڑے کا مالک دونوں اپنے خوابوں کے جز بردں سے اس دُنیائے فانی میں لوٹ آئے۔ کوچبان نے اپنی بھینگی آنکھیں گھما کر مسافر کا جائزہ لیا۔ اپنے منحنی جسم کو موڑ کر ایک پیچیدہ سی انگڑائی لی۔ اور زور سے کھنکار کر دو تین ادھ موئی مکھیوں کو باہر تھوک دیا۔ جو سیر و سیاحت کے شوق میں اس کے گلے کے اندرونی نہاں خانوں میں بھٹکی تھیں۔ پھر اس نے چابک ہوا میں گھما کر

دو چار گھوڑے کی پیٹھ پر رسید کیے۔ گھوڑے نے احتجاجاً اپنی پچھلی ٹانگیں اٹھا کر کچھ دولتیاں جھاڑیں اور پھر خاموشی سے راہِ راست پر چل پڑا۔

چُوں چُوں ـــــ ٹھک ٹھک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چُوں چُوں ٹھک ٹھک ـــــ وکٹوریہ چرچراتی ہوئی کھٹکھٹاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں موٹروں، ٹراموں، تانگوں، رکشاؤں، سائیکلوں، کتوں، بکریوں، بیلوں اور انسانوں کا تانتا سا بندھا ہوا تھا۔ اگر کوئی چیز اچانک وکٹوریہ کے راستے میں حائل ہوتی تھی۔ تو کوچبان بڑی فصاحت و بلاغت سے اس کے شجرۂ نسب پر طویل تبصرہ کرتا تھا۔ اس کے منہ میں پان کی پیک بھری ہوئی تھی اور وہ بڑی بے تکلفی سے اُسے راہ چلتے ہوئے انسانوں اور جانوروں پر تھوکتا جاتا تھا۔ رابرٹ لانگ وکٹوریہ کی سیٹ پر نیم دراز پڑا سوچ رہا تھا کہ کوچبان نے ابھی تک اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ نہ معلوم وہ اسے خراماں خراماں کس منزل کی طرف لیے جا رہا ہے؟ شاید اس یوگیوں اور جادوگروں کی سرزمین پر جہاں لوگ ننگے پاؤں دہکتے ہوئے انگاروں پر چلتے ہیں۔ شیشے چباتے ہیں۔ رسوں پر درختوں کی طرح چڑھ جاتے ہیں۔ سوئیوں اور میخوں پر سوتے ہیں۔ شاید کہ اس سرزمین کے کوچبان اپنے مسافروں کی پیشانی پر ہی ان کی منزل کا نام پڑھ لیتے ہوں؟ شاید یہ کوچبان کوئی پُراسرار یوگی ہو جو مستقبل کے آئینے میں نامعلوم قسمتوں کے راز پڑھتا ہو۔ شاید اس نے دیکھا ہو کہ نیویارک پوسٹ کا نامہ نگار خصوصی رابرٹ لانگ کوین ایلزبتھ میں امریکہ سے لندن پہنچا۔ لندن میں اس نے اپنے اخبار کے لیے کہانیاں لکھیں، شراب پی اور ہائیڈ پارک میں منڈلانے والے بے شمار چھوکروں سے معاشقے کیے۔ ایس ایس سیرمٹھ مور میں اس نے پہلے مسز جیکسن اور پھر ہلڈا سے جی بہلایا۔ اور آج صبح جب جہاز نے اپنے مسافروں کو بمبئی کی زمین پر اگل دیا تو یہ پُراسرار کوچبان اپنے جانے پہچانے دوست کو لینے کے لیے پہلے ہی سے سڑک پر موجود تھا! شاید اب وہ اسے اپنے

پوشیدہ تہ خانے کی طرف لیے جا رہا ہے۔ جس میں عود اور عنبر کی بتیاں سلگ رہی ہوں گی دیواروں پر کھوپڑیوں اور ہڈیوں کے ڈھانچے لٹک رہے ہوں گے۔ ایک کونے میں ایک مدھم سی موم بتی جل رہی ہوگی۔ دوسرے میں کوچبان ہوگا، اپنے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ لیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یکایک رابرٹ لانگ کا سہانا سپنا ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ وکٹوریہ کا ایک پہیہ سامنے کی طرف آتی ہوئی بیل گاڑی کے پہیے سے ٹکرا کر بُری طرح اُلجھ گیا تھا۔ بیل کی گردن کھینچ کر وکٹوریہ کے اندر آ گئی تھی اور سُرخ سُرخ جلتی ہوئی آنکھوں والا بیل وکٹوریہ کے اندر رابرٹ لانگ کے عین سامنے بڑے خطرناک انداز میں پھنکار رہا تھا اس کے نوکیلے سینگ رابرٹ لانگ کی چھاتی سے چند انچ دور مہیبانہ طور پر آویزاں تھے اور مُنہ سے کف اُبل اُبل کر اس کی پتلون پر ٹپک رہی تھی۔ کوچبان اور گاڑی بان اپنی اپنی جگہ بیٹھے زور زور سے چلّا رہے تھے، اور ایک دوسرے کے خاندان کی مستورات کے چال چلن کے متعلّق بڑے گہرے رازوں کے انکشافات کر رہے تھے۔ اور تماش بینوں کا ایک گروہ نیم بیضوی شکل میں کھڑا اپنی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ کبھی کبھی گاڑی بان کے ہاتھ کو اپنی طرف اشارہ کرتے دیکھ کر رابرٹ لانگ کو خیال ہوتا تھا کہ شاید اس کا اپنا شجرہ نسب بھی زیرِ بحث ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق صورتِ حالات پر تبصرہ کر رہا تھا۔ ایک دھوتی پوش بزرگ نے جو سر پر گاندھی ٹوپی اوڑھے تھے یہ حل پیش کیا کہ کوچبان اپنے سفید فام مسافر کو وکٹوریہ سے نیچے اتار دے۔ سلیمان نے سختی سے یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس عمل سے وکٹوریہ کے پہیے کا بیل گاڑی کے پہیے سے الگ ہونے کا کوئی عملی پہلو نہیں نکلتا تھا۔ اس انکار پر گاندھی ٹوپی والے بزرگ نے سلیمان کی سُرخ ترکی ٹوپی کے متعلّق ایک گھناؤنی سی رائے کا اظہار کیا۔ سلیمان نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور گاندھی ٹوپی کے متعلّق عورت کے جسم کے بعض حصّوں کی ساخت کی تشبیہہ پیش کی سامعین

میں کچھ لوگوں نے داد دی۔ بعض لوگ مُسکرائے اور بعض بُری طرح بگڑے۔ رابرٹ لانگ کو اس بحث میں بڑا مزا آرہا تھا۔ اس کے دِل میں ایک مبہم سی اُمید نے کروٹ لی کہ شاید اس ملک کی روایات کے مطابق ٹوپیوں کی یہ تکرار بڑھتے بڑھتے ہندو مُسلم فساد کی شکل اختیار کرے۔ اور وکٹوریہ میں ایک بپھرے ہوئے بیل کے سینگوں کے سامنے بیٹھے بیٹھے اس کا صحافتی دماغ نیویارک پوسٹ کے لیے ایک تاریخی ڈسپیچ تیار کرنے لگا "بمبئی میں ہندو مُسلم فساد۔ تین افراد ہلاک، بے شمار زخمی۔ امریکی اخبار نویس کی گھوڑا گاڑی پر بحث، نیویارک پوسٹ کے نمائندہ خصوصی رابرٹ لانگ پر حملہ۔"

بدقسمتی سے رابرٹ لانگ کی یہ آرزو پُوری نہ ہوسکی۔ جب گاڑی بان اور کوچبان کے پاس ایک دوسرے کے خاندانی اسرار و رموز ختم ہو گئے تو انھوں نے خاموشی سے اتر کر اپنی اپنی گاڑیوں کے اُلجھے ہُوئے پہیّوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا اور چند الوداعی گالیوں کے بعد اپنی اپنی راہ پر چل کھڑے ہُوئے۔

وکٹوریہ میں بیل کے سینگوں کے سامنے اکڑوں بیٹھے بیٹھے رابرٹ لانگ کی کمر اور پیٹھ تھک گئی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد تاج محل ہوٹل پہنچ کر گرم گرم غسل کرے اور پھر لاؤنج میں بیٹھ کر ان غزالی آنکھوں، سانپ کی طرح لہرانے والی کالی چوٹیوں اور سرسراتی ہُوئی دلفریب ساڑھیوں کا نظارہ کرے۔ جن کے تخیّل نے مدّت سے اس کے دل کو آباد کیا ہُوا تھا۔ یہ تصویریں الف لیلہ کے قصّوں کی طرح اس کے دماغ پر نقش تھیں۔ اور بے شمار عجیب و غریب روحانی تصوّرات نے اس پر ایک طلسمی جال سا بن رکھا تھا۔ رابرٹ لانگ نے سوچا کہ بیل کے ساتھ اس کا پہلا تجربہ کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا اور اس کے پتلوں پر کف کے گرے ہُوئے چھینٹے بڑے غلیظ نظر آرہے تھے۔ اگر وکٹوریہ کا پُراسرار یوگی سلیمان اسے یونہی اپنی طلسماتی دُنیا میں لیے پھرتا رہا تو نہ معلوم ابھی کتنے اور بیلوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کے ساتھ اسے اختلاط کا شرف نصیب ہوگا۔ یُوں تو وہ

ایک سچّے نامہ نگار کی طرح ہر قسم کے تجربات کے لیے تیار تھا لیکن بمبئی کی پہلی شام! اگر یہ شام غزالی آنکھوں اور بل کھاتی ہُوئی ناگنوں کے بغیر گزر گئی تو زندگی میں ایک ایسا خلا رہ جائے گا جسے ہزاروں خوشگوار اور پُرکیف شامیں بھی پُر نہ کرسکیں گی۔ زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ یہ چند اوّلین تاثّرات ہی تو ہوتے ہیں جن میں کچھ اجنبیت، کچھ مغائرت، کچھ قرب، کچھ بعد کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ حجلۂ عروسی کی پہلی شام! ڈوبتے ہُوئے سُورج کی آخری کرنیں بمبئی پر اداسی کی طرح چھائی ہُوئی تھیں۔ کہیں کہیں دکانوں کے اندرونی حصّوں میں بجلیاں بھی جلنے لگی تھیں۔ یہی تو وہ اچھوتا وقت ہے، جب روشنی اور تاریکی گلے ملتے ہیں۔ آئینوں کے سامنے مرمریں اجسام پر کالی زلفوں کے بادل بکھر جاتے ہیں۔ کائنات کروٹ لیتی ہے۔ گناہ اور ثواب پہلو بدلتے ہیں۔ تاج محل ہوٹل کے بال روم میں قمقموں کی دیپ مالا روشن ہوتی ہے اور غزالی آنکھیں کالی کالی، لہراتی ہُوئی ناگن زلفیں۔

"تاج محل ہوٹل" رابرٹ لانگ نے ذرا چلاّ کر سلیمان کو مخاطب کیا۔ وہ اپنے مستقبل کی عنان اس مشتبہ یوگی کے ہاتھ میں دے کر بمبئی میں اپنے پہلے دن کے تجربات کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"بہت اچھا صاحب"، سلیمان نے اس کی طرف دیکھے بغیر میکانکی طور پر جواب دیا۔ کچھ دُور آگے پان اور بیڑی کی دکان تھی۔ وکٹوریہ اس کے سامنے رُک گئی۔ نیچے اُتر کر سلیمان نے کچھ پان اور بیڑیاں خریدیں۔ داموں پر اس کی دکاندار کے ساتھ کچھ تکرار بھی ہُوئی۔ وہ دونوں ابھی بازار کے بھاؤ پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے کہ ایک بندر والا وکٹوریہ کے قریب آیا اور ہاتھ بڑھا کر اُس نے رابرٹ لانگ کے کانوں کے نزدیک زور سے ڈگڈگی بجائی۔ رابرٹ لانگ گھبرا کر چونک اُٹھا۔ بندر والے نے بہت سے رنگوں کا ڈھیلا ڈھالا چغہ پہنا ہُوا تھا۔ اس کے سر پر ایک لمبوتری ٹوپی تھی جس میں جابجا مور کے پَر اڑسے ہُوئے تھے۔ ہاتھ میں رسی تھی جو دو بڑے بندروں کے گلے میں پڑی ہُوئی

تھی، اور کوئی چار پانچ چھوٹے چھوٹے بندر کے بچے اس کے جسم پر جا بجا چمٹے ہُوئے تھے۔ کوئی کندھے پر بیٹھا تھا، کوئی گردن پر۔ کوئی پیٹھ کے ساتھ لگا ہُوا تھا اور ایک ننھا مُنا سا بچہ اس کی ٹوپی پر فراغت سے بیٹھا مونگ پھلی ٹھونگ رہا تھا۔ ڈگڈگی کی آواز سُن کر ٹوپی والا بندر نیچے اتر آیا اور چیاؤں چیاؤں کرتا ہُوا لپک کر رابرٹ لانگ کے زانوؤں پر آ بیٹھا۔ اس کے مُنہ میں مونگ پھلی کا دانہ تھا۔ اور وہ رابرٹ لانگ کا مُنہ چڑا چڑا کر اُسے کُترنے لگا۔ رابرٹ کو یہ ادا بہت پسند آئی اور اس نے پیار سے بندر کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔

"ڈگ ڈگ، ڈگ ڈگ" بندر والا بڑا کائیاں تھا۔ زور زور سے ڈگڈگی بجا کر اس نے قیمت کا اعلان کیا "صاحب بڑا نسلی بندر ہے۔ صرف ایک سو روپیہ"

اتنے میں سلیمان بھی پان اور بیڑی کا سودا چکا کر واپس آ گیا تھا۔ سو روپیہ سُن کر اس کے کان کھڑے ہُوئے "ارے سو روپے کے بچے۔ ڈاکہ ڈالنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"اجی میاں، اپنا راستہ ناپو، تم کیوں ہماری بات میں ٹانگ اڑاتے ہو"

"اچھا جی، یہ بات ہے؟ مَیں کہتا ہُوں بیٹا، میرے ساتھ معاملہ کر لو۔ ابھی بکوا دُوں گا۔ ہاں ایسے صاحبوں کو انگلیوں پر نچانا تو روز کا کام ہے اپنا۔ کیا کہتے ہو؟"

"بولو۔ کیا دلواتے ہو"

"تیس! بیس تمہارے، دس اپنے۔ کیا کہتے ہو؟"

"کچھ اور دلواؤ استاد۔ تمہارے قدموں کے طفیل ہمارا بھی بھلا ہو گا" بندر والا خوشامد کرنے لگا۔

"اچھا دیکھتا ہُوں، تم بھی کیا یاد کرو گے بیٹا"

بندر والے اور سلیمان میں کافی دیر تک چخ چخ ہوتی رہی۔ وہ پانچ اترتا تھا۔ یہ دو بڑھتا تھا۔ اور انجام کار سودا پچاس پر آ کے رُکا۔ رابرٹ لانگ نے ڈالروں کا

کا حساب لگایا تو پندرہ یا سولہ ڈالر بنتے تھے یعنی نیویارک کے ہوٹل میں دو اچھے لنچوں کی قیمت۔ یا پیرس میں کسی نائٹ کلب کی ایک رات۔ اس قیمت پر ننھا مُنا بندر مہنگا نہیں تھا۔ جو اس کی گود سے نکل کر اب اس کے کندھے پر بیٹھا بڑے مزے سے مونگ پھلی کھا رہا تھا۔ نظر بچا کر سلیمان نے بیس روپے اپنی جیب میں ڈال لیے اور تیس بندر والے کے سپرد کیے۔ رابرٹ لانگ دل ہی دل میں سلیمان کی مدد پر احسان مند ہُوا جس نے کمال محنت سے بندر کی قیمت سو روپے سے پچاس روپے کروائی تھی۔ جب وکٹوریہ دوبارہ چلی تو گھوڑے کی چال میں پہلے سے زیادہ تیزی تھی اور سلیمان کا چابک بھی غیر معمولی سرگرمی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنے منہ میں بھری ہُوئی پیک کو ایک راہ چلتی ہوئی لُگائی کی پیٹھ پر پچکاری مار کر تھوک دیا۔ ٹوپی اُتار کر اس کی گرد کو جھاڑا۔ پھندنے کو سلجھایا۔ کانوں میں رومال گھما کر میل نکالی اور پھر گردن گھما کر اپنی بھینگی آنکھ کے ترچھے زاویے سے رابرٹ کی طرف دیکھا "ہلا گلا صاحب؟" اس نے رازدانہ انداز سے دریافت کیا۔

"ہلا گلا؟" رابرٹ لانگ نے سوچا، شاید کسی ہندوستانی مٹھائی کا نام ہو۔ یا شاید یہ اس پراسرار یوگی کے کسی خفیہ تہہ خانے کی طرف اشارہ ہو۔ بہرکیف وہ اپنے محسن کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر سلیمان کی مرضی ہے کہ وہ اپنے مسافر کو وکٹوریہ میں زیادہ سے زیادہ عرصہ بٹھا کر کرایہ میں خاطرخواہ اضافہ کر سکے تو کرنے دو۔ یہ اس کا حق ہے۔ آخر اس نے بھی تو کوشش کر کے بندر کی قیمت میں پچاس روپیہ کی تخفیف کرائی تھی۔ تاج محل ہوٹل کیا ہے۔ ایک گھنٹہ پہلے پہنچے یا بعد، فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ ہاں، استاد سلیمان، اگر تمہاری خوشی ہلا گلا ہی میں ہے تو ہلا گلا ہی سہی۔ یہ کسی ہندوستانی مٹھائی کا نام ہو یا کسی یوگی کے پُراسرار تہہ خانے کا۔ ایک ہی بات ہے۔ تم اپنا جی خوش کر لو۔

"آپ کا دل بہت خوش ہو جائے گا۔ صاحب اس کے بغیر بمبئی میں جینا بھی بیکار ہے اور مرنا بھی بے کار ہے" سلیمان نے اپنا فلسفہ بیان کیا پھر اس نے ایک

بجلی کے کھمبے کے نیچے رُک کر گاڑی کے دُھواں آلود، میلے لیمپوں کو روشن کیا۔ شام کا دھندلکا اب تاریکی میں بدل گیا تھا اور گنجان بازاروں کی ریل پیل سے نکل کر وکٹوریہ ایک خاموش سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ دونوں طرف کشادہ باغیچوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں تھیں۔ اگر ان میں روشنیاں نہ ہوتیں، اور کہیں کہیں برآمدوں سے ہنسنے یا بولنے کی آوازیں نہ آتیں تو شاید یہ محسوس ہوتا کہ یہ آبادی نہیں قبرستان ہے۔ کوئی آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد وکٹوریہ سیمنٹ کے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رُک گئی۔ پھاٹک پر ایک چوکیدار بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ سلیمان کو دیکھ کر سلام کیا اور رابرٹ لانگ ایک سحرزدہ انسان کی طرح اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا آیا۔

ڈرائنگ روم میں اور کوئی نہ تھا۔ فرش پر ایک پرانا قالین بچھا ہُوا تھا۔ جس کا بُر پامال ہو کر جگہ جگہ سے اُڑ گیا تھا۔ اور اب اس کی صُورت ٹاٹ ایسی نکل آئی تھی۔ صوفوں کے سبز رنگ بیٹھے ہُوئے تھے اور گدوں پر کہیں تیل، کہیں سیاہی، کہیں سالن کے چکنے دھبے تھے۔ دروازوں پر موٹے موٹے پردے لٹک رہے تھے، جن کا رنگ شاید کبھی سُرخ تھا لیکن اب مُرغی ذبح کرنے کے بعد نالی میں جمے ہُوئے خون کی طرح سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ چھت پر مکڑی کے جالے نہ معلوم کس کس بھید کی پردہ پوشی کر رہے تھے۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ کر گر گیا تھا اور کہیں کہیں پکے ہُوئے پھوڑے کی جلد کی طرح پھٹنے کے قریب تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دیواروں کی چھاتی سالہا سال کے راز چھپائے تھک گئی ہے۔ اور اب کسی وقت مجبور ہو کر اچانک بھک سے پھٹ جائے گی۔ فضا میں ایک عجیب سی کثافت تھی، اور کمرے کے ایک کونے میں ایک طوطے کا پنجرا لٹک رہا تھا۔ طوطے نے رابرٹ لانگ کی آمد پر تو کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ اس کے کندھے پر بیٹھے ہُوئے بندر کو نیم باز آنکھوں سے بُری طرح گھُورا۔ بندر نے بھی جوابی کارروائی شروع کی اور کچھ عرصہ تک وہ دونوں ایک دوسرے کو گھُور گھُور کر اپنی شدید ناپسندیدگی کا اظہار کرتے

رہے۔ قریب تھا کہ ان کا اختلاف رائے کوئی اور عملی صُورت اختیار کرے کہ یکایک ایک پردے کو جنبش ہُوئی اور ایک ادھیڑ عمر کی کالی کلوٹی، موٹی سی عورت یُوں کمرے میں داخل ہُوئی جیسے ریل کا انجن بھک بھک کرتا پلیٹ فارم پر آتا ہے "خوش آمدید، خوش آمدید۔ میرے اچھے نوجوان یہ تمھاری نیک بختی ہے کہ تم یہاں چلے آئے۔ ورنہ اجنبی نوجوان اس غلیظ شہر میں بُری طرح بھٹک جاتے ہیں اور پھر پشت ہا پشت تک ان کے خون میں پاکیزگی پیدا نہیں ہوتی۔ سلیمان بڑا اچھا راہنما ہے۔ میری چھت کے نیچے ابھی تک کوئی جرائم پیدا نہیں ہوتے۔ یہاں پر تم اپنے آپ کو یُوں محفوظ سمجھو، جیسے تم ڈی، ڈی، ٹی کے ٹب میں بیٹھے ہو۔ آؤ، آؤ، جوان آؤ۔" بھک بھک کرتا ہُوا انجن روانہ ہُوا اور رابرٹ لانگ ریل کے ڈبے کی طرح اس کے ساتھ جتا ہُوا پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ عورت کے بال کٹے ہُوئے تھے اور ان میں جا بجا میل کے سفید سفید ذرّے ابرک کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے نیلی چھینٹ کا فراک پہنا ہُوا تھا۔ جس کے نیچے اس کی برہنہ پنڈلیاں آبنوسی مگدروں کی طرح نکلی ہُوئی تھیں۔ پاؤں میں اُونچی ایڑی والی گرگابی تھی، جس پر مدّت سے پالش نہیں ہُوا تھا۔ وہ ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ یکایک عورت کے منہ سے ایک ڈراؤنی چیخ نکلی اور وہ اُچھل کر دھڑام سے فرش پر گر گئی جیسے ریل کا انجن پٹڑی سے اُتر کر اُلٹ جائے۔ رابرٹ لانگ نے جلدی جلدی اس کا فراک درست کیا۔ اور اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر اسے اُٹھایا۔

"معاف کیجیے، مَیں بہت شرمندہ ہُوں۔ میرے اس بے وقوف بندر نے خواہ مخواہ آپ کے کندھے پر کود کر آپ کو ڈرا دیا۔ مَیں بہت شرمندہ ہُوں۔"

"اوہو! یہ تمھارا بندر ہے۔ آہا، کیسا پیارا بچّہ ہے۔ مَیں خواہ مخواہ ڈر گئی۔ کتنا سویٹ ہے یہ۔" عورت نے اپنے سہمے ہُوتے چہرے پر جھُوٹی مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے منہ پر پسینے کے قطرے بکھرے ہُوئے تھے۔ جن میں پوڈر گھُل گھُل کر برس رہے

داغوں کی طرح پھیل رہا تھا۔ اس کے بالائی ہونٹ پر بالوں کی لکیر جو کریم اور پاؤڈر کی تہوں میں دبی ہوئی تھی۔ اب گھبرائی بلی کے رونگٹوں کی طرح کھڑی ہوگئی تھی۔

ڈائننگ روم سے نکل کر وہ ایک دالان میں آئے۔ وہاں سے وہ مکان کے پچھواڑے میں ایک اور کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ کمرہ بڑا خوش نما تھا۔ چھت پر کئی سو کینڈل پور کے قمقمے نور برسا رہے تھے۔ دیواروں پہ پھولدان اور گلدستے لٹکے ہوئے تھے۔ فرش پر ایک بے داغ سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں خوبصورت ایرانی غالیچہ تھا۔ اس پر ریشم کے گاؤتکیے لگے ہوئے تھے۔ اور ایک تکیے کے سہارے نجمہ ایک تنی ہوئی کمان کی طرح نیم دراز تھی۔ اس کی کالی زلفیں زہرناک ناگنوں کی طرح اس کے شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ اس کی غزالی آنکھوں میں مقناطیس کے ٹکڑے تھے۔ اس کے جسم کا گداز کمرے کی فضا میں عود اور عنبر کی طرح سلگ رہا تھا۔ رابرٹ لانگ نے حیرت سے آنکھ ملی۔

نجمہ کے ہونٹوں پر گلاب کی پتیاں سی کھلیں۔ رابرٹ لانگ نے اپنی آنکھوں کو دوبارہ ملا۔ نجمہ مسکرائی۔

"کشمیر سے آئی ہے،" موٹی عورت نے طلسم کو توڑتے ہوئے کہا "کشمیر کا نام تو تم نے سُنا ہوگا، جوان؟ تمھاری یو، این، او وہاں کا جھگڑا چکا رہی ہے۔ بڑی اچھی جگہ ہے سیب، انگور، ناشپاتیاں اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

رابرٹ کے دل کے ساتھ اب اس کے صحافتی دماغ نے بھی ایک شدید کروٹ لی۔ اس نے سوچا کہ شاید آج کی رات اس پر مسئلۂ کشمیر کے کچھ راز بھی آشکار ہوں۔ شاید کل صبح وہ اپنے اخبار کو ایک ایسا تاریخی ڈسپیچ ارسال کر سکے جس سے اس بین الاقوامی گتھی کو سُلجھانے میں ایک نئی شاہراہ کا نشان مل سکے، شاید۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"پچاس روپے" موٹی عورت نے بندر بیچنے والے کی طرح قیمت کا اعلان کر کے

اس کمرے کے طلسم کو ایک بار پھر توڑ ڈالا۔

پچاس روپے

بندر!

نجمہ!

کشمیر!

یو، این، او

اور امریکی نامہ نگار اپنا تاریخی ڈسپیچ تیار کرنے میں مشغول ہوگیا۔